مرتبہ: دیانرائن نگم بی۔اے

جلد ۶۰	فروری ۱۹۳۳ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

تصاویر۔ نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ منشی تلوک چند محروم

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کے ... ششماہی ...

نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی

فہرست مضامین

زمانہ جلد ۶۰ جنوری لغایتہ جون ۱۹۳۳ء

تصاویر: - مرزا رسوا مرحوم - منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی - نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی - منشی تلوک چند محروم - اکبر اعظم کا دربار - ہر ایڈولف ہٹلر چانسلر جرمنی - پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم - ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری گورنر یو پی - سید حسن امام مرحوم

مضامین نثر

۲۷۔ تنقید کتب

۲۸- یادرفتگاں

۲۹- مشاہیر عالم

۳۲- خط وکتابت

حصہ نظم

زمانہ

جلد ۴۰ — فروری ۱۹۳۳ء — ۲

نسیم مرحوم کی یاد

از سید اظہر علی صاحب آزاد

جن پاک نفس بزرگوں نے اردو ادب کی بنیاد ڈالی، یا ترقی کی راہ میں گامزن ہو کر آیندہ نسلوں کے لئے نشانِ راہ چھوڑ گئے، ہم اُن کے بارِ احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

جس طرح انگریز چاسر اور اسپنسر کو بھول نہیں سکتے، اسی طرح ہم ولی دکھنی اور میر کو نہیں بھول سکتے۔ انگریز سالہا سال سے ملٹن اور شیکسپیئر پڑھتے آئے ہیں اور کبھی سیر نہیں ہوتے، اُسی طرح انیس اور آتش کے مطالعہ سے ہمیں بھی کبھی سیری نہیں ہو سکتی۔ جس طرح انھیں اپنے نامور شعرا کیٹس۔ بائرن۔ شیلی۔ اسکاٹ۔ ٹینیسن وغیرہم سے عشق ہے اُسی طرح ہم سودا۔ مومن۔ درد نسیم۔ داغ۔ امیر وغیرہم پر جان دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں احساس ہے کہ ہماری شاعری دنیا کی ترقی کرنے والی اقوام کی شاعری سے ابھی بہت پیچھے ہے اور قبل اس کے کہ ہم بھی آگے نکل جانے والی صفوں کے برابر پہونچ سکیں۔ ہمیں مدتوں مسلسل محنت کرنا پڑیگی۔

اگرچہ ۱۹۰۵ء میں "اودھ پنچ" لکھنؤ کے صفحات میں شرر اور چکبست مرحوم کی زبردست معرکہ آرائی ہو چکی ہے۔ فریقین کے موافق اور مخالف سلسلۂ مضامین جاری رہ چکا ہے، لیکن بقول نسیم

پُر ہے بحرِ سخن سدا ہے باقی — دریا نہیں کاربند ساقی

زبان جب تک زندہ ہے نقادانِ فن کا قلم رُک نہیں سکتا۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہونگی۔ تازہ بتازہ

انکشافات کا سلسلہ جاری رہیگا۔ اور یہی زبان کی حیات اور ہماری قومی زندہ دلی کا ثبوت تسلیم کیا جائیگا۔ یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ ہمارا فنِ تنقید ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے۔ زبان اور محاورہ کے محاسبہ سے ہمارا فن شروع ہوتا ہے اور اسی نقطہ پر ختم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء کی معرکہ آرائی بھی اس نقطہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

چکبست اور شرر کے مشہور معرکہ میں جو امور طے پاچکے ہیں اُن پر دوبارہ لکھنا تحصیل حاصل اور بے ضرورت ہے۔ البتہ جن امور کے متعلق مجھے کوئی نئی بات عرض کرنا ہے صرف انھیں پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ کتاب وہی ہے اس میں کوئی اضافہ کر نہیں سکتا نہ اُس حد سے باہر جاسکتا ہوں۔

موجودہ زمانے کی زبان کو معیار قرار دیکر گلزار نسیم کی زبان میں لاکھوں کیڑے ڈالے گئے ہیں اور آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ نہ سب اعتراضات ہی صحیح ہیں اور نہ سب جواب ہی۔ یہ مثنوی آج سے ایک صدی قبل کی تصنیف ہے۔ اگر اُردو زبان ایک صدی گذر جانے پر بھی اُسی نقطہ پر موجود رہتی جہاں ایک صدی پہلے تھی تو یہ ایک مردہ زبان کہے جانے کی مستحق تھی۔ لیکن ہر زندہ زبان ترقی کرتی ہے۔ اور دنیا کی کوئی زندہ زبان اگر آج سے سو برس قبل کی زبان سے مقابلہ کرکے دیکھی جائیگی تو یہی صورت پیش آئیگی جو یہاں نظر آرہی ہے کسی شخص کو کوئی حق نہیں ہے کہ دنیا کے کسی ادیب یا شاعر سے یہ امید رکھے کہ اسکی زبان صدیوں بعد کی زبان سے مختلف نہوگی۔ ایسا اعتراض سرتاپا لغو اور اُس پر التفات کرنا تضیع اوقات ہے۔ میر اور ولی کی زبان آج ویسی ہی عجیب وغریب نظر آتی ہے جیسی فیری کوئن (.Fairy Queen) کی زبان۔ مگر نہ انگریز فیری کوئن کو دریا بُرد کرسکتے ہیں اور نہ ہم میر اور ولی کا کلام میاں چراغ علی کے حوالہ کرنے کو طیار ہیں چاہے ہمارے بچے اُن کے اشعار سُنکر ہنس پڑیں۔

نسیم اپنے وقت کے کاملِ فن اُستاد تھے جیسا کہ ان کا کلام ثابت کر رہا ہے۔ اُن کے اُستاد آتش مرحوم اُستادوں کے استاد تھے۔ نسیم کی تصنیف پھر اس پر آتش کی نظرثانی اور پھر اغلاط! اس سے بڑھکر اور کیا ادبی کفر ہوسکتا ہے؟

اس سے بھی سخت الزام جو شرر اور اُنکے ہمخیال حضرات نے عاید کرنا چاہا تھا یہ ہے کہ گلزار نسیم کے بعض اشعار تہذیب کے دائرہ سے باہر ہیں۔ شاعر کی نظم اور نثار کی نثر اُس کے زمانہ

کی سوسائٹی کے مذاق کی محدود چار دیواری سے باہر کہیں نہ گئی نہ جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں نظم یا نثر ایک آئینہ ہے جس کے اندر اُس زمانہ کی سوسائٹی کے خط و خال صاف نظر آتے ہیں جس زمانے میں جس قسم کی چیز کی مانگ اور قدر ہوتی ہے، جو چیز عموماً پسند کی جاتی ہے وہی مہیا کرنی پڑتی ہے۔ نسیم کے زمانہ کے قریب کی اور بھی مثنویاں مثلاً مثنوی میر حسن، طلسم الفت، زہر عشق وغیرہ ہیں۔ کیا ان میں سے ایک مثنوی بھی اس عیب سے پاک ہے؟ یہ عیب ایک نہیں لاکھ بار ہو لیکن باوجود اس کے یہی مثنویاں زبان اُردو کے صحیفے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

کیا یورپ کا علم ادب اس عیب سے پاک ہے؟ قارئین کرام کتب مندرجہ ذیل خود ملاحظہ فرمائیں

1. The Athenian Comedies.

2. Lysistrata of Aristophanes.

3. The Sixth Satire of Jovinal

4. Prior's Tales.

اور وہ مکالمہ ضرور ملاحظہ فرمائیں جو سقراط اور اُس کے شاگرد فیڈرس (Phaedrus) کے درمیان ایک چشمہ کے کنارے ہوا تھا جہاں خوش الحان طیور اپنے نغموں سے بہشت بریں کی فضا پیدا کر رہے تھے۔

جو زمانہ اُردو ادب پر اب سے سو برس پہلے گذر چکا ہے وہی دور سترھویں صدی میں انگلستان کے ادب پر بھی گذرا ہے۔ نہ ایسی تصانیف کو انگلستان یا یورپ کے اور ممالک نے اپنے دائرہ ادبیہ سے خارج کر دیا ہے اور نہ ہم کر سکتے ہیں۔ ادب کی بہترین کتابیں پڑھ چکنے کے بعد ایسی چند کتابیں پڑھ لینے سے ہمارے بچوں کے اخلاق پر بُرا اثر نہیں پڑ سکتا اگر اُن کے استاد اُنھیں پہلے ہی سمجھا دیں کہ تحصیل ادب کا اصلی مقصد کیا ہے اور کتاب پڑھتے وقت اُنھیں کن کن امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

ایک بات اور ہے، ہر زمانہ کا ادبی معیار یکساں نہیں ہوتا، اس کا مدار سوسائٹی کی ذہنیت پر ہے۔ ایک زمانہ میں جو تحریریں ایک حد تک منافی متانت سمجھی جاتی ہیں زمانۂ مابعد میں وہی تحریریں فحش اور حیا سوز سمجھی جانے لگتی ہیں، اور ناقابل در گذر خیال کی جاتی ہیں۔ اڈیسن (Addison) اپنے زمانہ کے مہذب ترین شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا، مگر بعض موقعوں پر اس کا طرز ادا موجودہ زمانہ میں ناقابل برداشت خیال کیا جاتا ہے اور کم و بیش یہی حال

اس سوال کے جواب میں تاج الملوک کہتا ہے:-

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ		کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

تلوا سے قتل ہو جو منظور		ابرو کے اشارے سے کرو چور

زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو		اپنے دلِ تنگ میں جگہ دو

ذیل کے اشعار اُس وقت کے ہیں کہ تاج الملوک کو بکاؤلی کی ماں نے جزیرۂ طلسم میں قید کر دیا ہے اور بکاؤلی تاج الملوک کے فراق میں دیوانی ہوگئی ہے۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس لب ہیں		آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ		کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

صورت میں خیال رہ گئی وہ		ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

آنے لگے بیٹھے بیٹھے جب کر		فانوس خیال بن گیا گھر

یہ مثنوی کے نمونے تھے۔ ذیل کے نمونے نسیم کی غزلیات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ غزل گوئی کی شان بھی ملاحظہ ہو:-

سمجھا ہے حق کو اپنی ہی جانب ہر ایک شخص		یہ چاند اُس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ		بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا

کیا عارفانہ شعر فرمایا ہے، سبحان اللہ وصل علی۔

جنوں کی چاک زنی نے اثر کیا واں بھی		جو خط میں حال لکھا تھا وہ خط کا حال ہوا

یعنی لکھا تھا کہ تمہارے فراق میں جامہ دری کی نوبت آگئی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے خط کے بھی پُرزے پُرزے اُڑا ڈالے۔

دل بدل آئینہ ہے دیر وحرم		حق جو پوچھو ایک دَر ہے دو طرف

کفر و ایماں دونوں جانب کی سُنے		اس لئے گوشِ بشر ہے دو طرف

سنیئے کیا مست شعر فرمایا ہے:-

قلقل سنا کے چھیڑتے ہیں مے پرست کو		شیشے سرود یاد دلاتے ہیں مست کو

فارسی ضرب المثل ہے "سرود مستاں یاد دہانیدن"۔

شاگردِ خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم		کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

"پارسی اور ہندی" اور بالخصوص "آتش پرست" کی داد دینا ناممکن ہے۔

جب ملے دو دل خلل پھر کون ہے بیٹھ جاؤ خود حیا اُٹھ جائیگی

خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پر روز بارانِ نور ہوتا ہے

نورٌعلےٰ نور، کیا لاجواب شعر فرمایا ہے۔ اور ملاحظہ ہو، شاعری کی معراج کمال ہے۔

تیرہ دل کی بزم میں جامِ شراب آتا نہیں جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

عشق کے زینے کے آگے آسماں بھی پست ہے سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

سبحان اللہ وصل علیٰ۔ اب ایسا شعر آتا ہے جس پر حضرت مصنف کا ساری عمر عمل رہا۔ شاہی دربار میں آپ کے احباب موجود تھے، دربار حضرت کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا، احباب بس اتنا ہی چاہتے تھے کہ آپ ایک مرتبہ "ہاں" فرمادیں، مگر نہ کہنا تھا نہ کہا، فرماتے ہیں:۔

منت دلا کسی کی نہ اصلا اُٹھایئے مرجایئے نہ نازِ مسیحا اُٹھایئے

ذیل کا شعر مرنے سے دو تین گھنٹے پہلے ارشاد فرمایا تھا:۔

پہونچی نہ راحت ہم سے کسی کو اور اذیت کوش ہوئے

جان پڑی تب بارِ شکم تھے، مرکے وبالِ دوش ہوئے

آپ کا سال پیدائش ١٨١١ء اور سال وفات ١٨٤٣ء ہے، یعنی صرف بتیس برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ افسوس یہ جنتی روح اتنی قلیل مدت کے لئے دنیا کو عاریت ملی تھی۔ اے کاش عمر طبعی تک پہونچے ہوتے تو نہیں معلوم ہماری آیندہ نسلوں کے لئے اور کیا کیا میراث چھوڑ جاتے۔ دیوان کا بعض شعر پڑھکر تو یہ خیال گذرتا ہے کہ اپنے قبل از وقت مرجانے کا علم شاید انھیں پہلے ہی سے تھا۔ فرماتے ہیں:۔

دیکھے وہ گلشن جو ان دو دن رہے یاں مثلِ گل ہم تو شبنم ساں نسیم اک دم کے ہیں مہمانِ صبح

عشرت آباد چمن سے تجھے کیا تُو تو نسیم نکہتِ گل کی طرح ہونے کو برباد آیا

جاں نکل جائے گی تن سے اے نسیم گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

دنیا فانی ہے، رہے نام اللہ کا، کیسے کیسے باکمال بزنگ تہِ خاک ہوگئے۔

کسی استاد کے کلام کے مقبول عام ہونے کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس کے بعض اشعار یا مصرعے ہرکس وناکس کے نوکِ زبان بنکر ضرب المثل بن گئے ہوں پہلے مثنوی میں سے ایسے اشعار اور مصرعے منتخب کرکے پیش کرتا ہوں۔ (مصرعے)

سورج کو چراغ ہے دکھانا

بیٹھا تو گرا، گرا تو بیہوش

گٹو سے جو مرے تو زہر کیوں دو

تھوڑا لکھا، بہت سمجھنا

آپ اپنی قضا کا نوحہ خواں تھا

کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

(اشعار)

پل مارنے کی ہوئی جو دیری	سبحان اللہ شان تیری!
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں	غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام	کیا لیجئے چھوٹے گاؤں کا نام
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے	جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے	جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
ہر ذرہ کا چمکے گا ستارہ	قائم جو زمین و آسماں ہے
درویش رواں رہے تو بہتر	آب دریا بہے تو بہتر
قسمت سے مفر ہے اب نہ مامن	پتھر کے تلے دبا ہے دامن
طالع سے کسے تھی ایسی امید	نکلا ہے کدھر سے آج خورشید

اب دیوان سے اسی قبیل کے اشعار میں سے تھوڑے سے نمونے منتخب کرکے پیش کرتا ہوں۔

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی	کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا	شاخ گل اک روز بھونکا کھائیگی
صندلی رنگوں سے مانا دل ملا	دردِ سر کی کس کے ماتھے جائیگی
یا ہاتھ توڑے جائیں گے یا کھولیں گے نقاب	سلطانِ عشق کی یہی فتح و شکست ہے
لائے اس بت کو التجا کرکے	کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

ارباب ذوق سلیم کے لئے اتنے ہی نمونے بس ہیں۔

شرر اور چکبست کی معرکہ آرائی میں منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ نے اس امر کے ثبوت میں کہ گلزار نسیم ایک ہندو شاعر کی تصنیف ہے محض ایک ہی مصرعہ ساری مثنوی میں سے منتخب کرکے پیش کیا تھا۔ "شب کی پوشاک بدلی ساری" اس طویل مباحثہ میں اس سے زیادہ کوئی ثبوت

پیش نہیں کیا گیا۔ حالانکہ درحقیقت نہ اس بحث کی گنجائش ہے کہ یہ مثنوی سوا حضرتِ نسیم مرحوم کے کسی اور کی تصنیف ہے اور نہ ثبوت کی ضرورت۔ اگر ثبوت ہی پیش کرنا ضروری سمجھا جائے تو ایسے ثبوت کی مثنوی میں کمی نہیں ہے۔ قارئین کرام اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیں:۔

بے وقت وہ راگ خوش نہ آیا بے فصل وہ پھاگ خوش نہ آیا
دہقان کی زوجہ کے کھلے بھاگ کھانے لگی نوچ نوچ کر ساگ
کیتا تھی غرضکہ راس اس کی پوری نہ ہوئی وہ آس اس کی

اشعار متذکرۂ بالا میں "پھاگ" اور "بھاگ" اور "کیتا راس" ہندو شاعر کے نوکِ قلم کا نقش اپنے ساتھ لائے میں

انداز سے اس نے لے کے مالا گاندھے پہ پکھاوجی کے ڈالا

مسلمان شرفا لکھنؤ کی زبان میں "مالا" کی جگہ "ہار" کا لفظ مستعمل ہے۔ ہندو شرفا مالا بولتے ہیں۔ دہلی کی زبان میں البتہ ہندو مسلمان سب "مالا" ہی بولتے ہیں۔ اور "مالا" کو مؤنث بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں "مالا" مذکر ہے۔

بارانِ گلاب و بارشِ گل ہو کر بڑھے آگے بالتجمل

"بارانِ گلاب و بارشِ گل" کا بھی ہندو شرفا کی باراتوں میں عام رواج ہے، اور یہاں بھی بارات ہی کا حال بیان ہو رہا ہے۔

وہ معتقد اس کے پاؤں چھو کر اٹھا چھاتی پہ رکھ کے پتھر

پاؤں چھونے کی رسم خاص ہندو شرفا کی ہے۔

چوٹی ہے مری تو ہاتھ ان کے چل آ کہ چلا میں ساتھ ان کے

یہ شعر تاج الملوک کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں اور اس کی مخاطب شاہزادی چتراوت ہیں۔ مسلمان شاعر کہ چوٹی رکھتا ہی نہیں بھلا ایسا شعر کہاں سے کہیگا اور کیونکر کہے گا۔ ایسا شعر تو مسلمان شاعر کہہ ہی نہیں سکتا۔

میں سنتے مانا کہ امانت نے اپنی اندر سبھا میں بھی راجہ اندر کا دربار سجایا ہے لیکن اندراسن کا ایسا مکمل نقشہ امانت یا کسی مسلمان شاعر کے فرشتے بھی نہیں کھینچ سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:۔

اندراسن امرنگر ہے شہر ایک خلقت ہے وہاں کی تندو دل نیک
اندر ہے بادشاہ اس کا آسن ہے تخت گاہ اس کا
مضمون وہ تھا سے اس قدر ہے اس بستی کا نام امرنگر ہے

خدائیوں کا ہے مسکن اس میں روحانیوں کا نشیمن اس میں

لکھتے ہیں موجدانِ ہندی آباد ہوا تو ہے وہ بستی

راجہ کہ کمال پارسا ہے مقبول جناب کبریا ہے

خالق نے دیا ہے فوق اس کو نغمہ سے ہے ذوق و شوق اُسکو

انساں کا سرود و رقص کیا ہے پریوں کا ناچ دیکھتا ہے

باری باری سے جو پری ہے راجہ اندر کی مجرائی ہے

کہا جاتا ہے کہ گلزار نسیم میں آمد کا نام نہیں محض آورد ہی آورد ہے۔ اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تناسب لفظی کی کوشش نے یہ عیب پیدا کر دیا۔ تناسب لفظی نسیم کے زمانہ کی شاعری اور شاری کی خصوصیات میں داخل تھا۔ نسیم اس دائرہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ لیکن نسیم کی شاعری کا یہ سحر ہے کہ آورد میں بھی آمد کا لطف پیدا کر دیا ہے اور جب تک سرسری نظر سے دیکھا جائے ہر شعر آمد کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ روانی کا ایک بے پناہ دریا بہا دیا ہے جس کی رَو میں آورد بھی چلی جا رہی ہے اور خیال نہیں گذرتا کہ کہیں آورد ہے بھی یا نہیں۔ اوپر کے اشعار پڑھکر غور ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے آخری نمونہ میں آورد کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے اور مثنوی میں ایسے بہت سے نمونے موجود ہیں۔

اُردو خواں شعرا کی دلچسپی مد نظر رکھکر مجھے بعض ایسے امور پر قلم اُٹھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جن پر پُرانے فیشن کے اُردو خواں مصنفین نے توجہ نہیں فرمائی لیکن جن پر توجہ فرمانے کی شدید ضرورت ہے۔ بیسویں صدی کی دنیا ترقی کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکی ہے اور جو شخص ایک ہی جگہ زمین پکڑے بیٹھا رہ جائے گا وہ وہیں چھوٹ رہیگا۔ کوئی پیچھے پھر کر دیکھنے والا بھی نہیں ہے، کہ کون چھوٹ گیا، کیا ہوا، کہاں رہ گیا؟

اس حصۂ مضمون پر قلم اُٹھانے سے پہلے میرا فرض ہے اور صاف عرض کر دونگا کہ گلزار نسیم کے افسانہ یا پلاٹ کی بیشمار خامیوں کے ذمہ دار نسیم نہیں اور ہرگز نہیں ہیں۔ یہ افسانہ اُن کا گڑھا ہوا نہیں ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں وہ خود فرماتے ہیں۔

افسانۂ گُلِ بکاؤلی کا افسوں ہو بہارِ عاشقی کا

ہرچند سنا گیا ہے اس کو اُردو کی زبان میں سخنگو

وہ نثر ہے داغِ نظم دوں میں اِس مے کو دو آتشہ کروں میں

جس کے معنی ہیں کہ یہ قصہ بُرا بھلا جیسا کچھ ہے نسیم کو نثر میں موجود ملا۔ نسیم نے اُسے نظم کر دیا

اُس قصہ یا پلاٹ کے عیوب نقائص اور خامیوں کا بار نسیم کی گردن پر نہیں ہے۔ لیکن غالباً اِن خامیوں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

پورب میں ایک تھا شہنشاہ سلطان زین الملوک ذی جاہ

بیسویں صدی کی دنیا ایسا قصہ نہیں سنتی، یہ نسیم ہی کی شاعری تھی جس نے ایسا قصہ بھی سُنا ہی کے چھوڑا۔ کسی "دوئم" درجہ کے بازاری شاعر نے نظم کیا ہوتا تو کوئی پڑھا لکھا تربیت یافتہ آدمی ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ کون بادشاہ تھا، کس ملک میں، کب، کس زمانہ میں۔ بادشاہ کا نام فرضی نہ ہونا چاہیئے۔ تاریخ سے سند حاصل کرنا پڑے گی۔ ملک بھی فرضی نہیں ہو سکتا۔ نقشہ اور جغرافیہ میں موجود ہونا چاہیئے۔ "پورب" کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے۔ زین الملوک نامی کسی ملک کا کوئی بادشاہ نہیں گذرا ہے۔ "فردوس" اور "ارم" جو نام بتائے گئے ہیں دنیا کا نقشہ اور جغرافیہ ان سے خالی ہیں۔

خالق نے دیئے تھے چار فرزند دانا عاقل ذکی خرد مند

آگے چلکر بجائے عقلمندی کے ہمیشہ ان سے حماقتیں ہی سرزد ہوئیں۔ تاج الملوک قصہ کا خاص ہیرو ہے۔ لیکن حماقت میں اُس نے بھی اپنا حصہ باقی نہیں چھوڑا۔ کہاں تو یہ احتیاط تھی کہ اس بھیڑ بھاڑ کے ساتھ گل بکاؤلی لیکر گھر واپس جانا مصلحت نہیں۔ محمود اور دلبر کو دریا کی راہ روانہ کیا اور خود تن تنہا فقیر کا بھیس بدل کر خشکی کی راہ چلا۔ حالانکہ جہاں تک قیاسات کو دخل ہے۔ اُس کا دریا کی راہ جانا ہی نسبتاً بہتر نظر آسکتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے بھائی قید سے آزاد ہونے ہیں۔ اور اُسی راہ گھر واپس جائیں گے۔ یہ پہلی حماقت تھی۔ دوسری حماقت جس راہ اُس کے بھائی واپس آنے والے تھے اسی راہ پر ایک راہ نشین اندھے فقیر پر پھول کا اثر آزمانا تھا۔ تیسری حماقت ایک اجنبی شخص "وزیر فرخ" کی موجودگی میں ساری داستان کہہ سنانا تھی۔ ان تمام حماقتوں سے بڑھ چڑھکر وہ حماقت تھی جس کی بدولت گل بکاؤلی ہاتھ سے کھو دیا۔ کہاں تو وہ احتیاط تھی اور کہاں یہ حماقت کہ جب چاروں بھائی سامنے آتے ہیں اور اناپ شناپ جنگلی پھولوں کو گل بکاؤلی کہتے پھرتے ہیں تو آپ طیش میں آکر فرماتے ہیں کہ فضول مت بکو وہ گل بکاؤلی نہیں ہے، گل بکاؤلی یہ ہے۔ دیکھ لو۔ اتنی بھی عقل نہیں کہ وہ چار ہیں اور آپ اکیلے۔ باپ سے سرخروئی حاصل کرنے کی فکر میں یہ بھی ہیں اور وہ بھی۔ بھلا وہ اس آسانی سے ہاتھ آتا ہوا پھول دیکھکر چھوڑ دینگے!

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ فرخ کی موجودگی میں جب تاج الملوک بادشاہ سے تخلیہ کی درخواست کرتا ہے۔ بادشاہ بلا استثنا سب کو باہر چلے جانے کا حکم دیتا ہے اور تمام حاضرین تعمیل

کرتے ہیں۔ لیکن فرخ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کھاتا ہے۔ نہ بادشاہ کو اپنے صریحی حکم کی خلاف ورزی پر دماغ کرتی ہے اور نہ تاج الملوک بھی ایک اجنبی کے سامنے ساری داستان سنا دینے میں تامل کرتا ہے۔

راجہ اندر بکاؤلی کا سامنا ہوتے ہی اُس میں آدم زاد کی بو پاتا ہے اور اُسے جلا دینے کا نادری حکم صادر فرماتا ہے۔ لیکن وہیں اُسی صحبت میں تاج الملوک موجود ہے، آدم زاد کی بو راجہ اندر محسوس نہیں کرتا۔ راجہ اندر کا طبلہ نواز تاج الملوک سے گفتگو کرتا ہے اور اُسے اپنا طبلہ بھی حوالہ کر دیتا ہے مگر آدم زاد کی بُو اس میں نہیں پاتا۔ پریاں آتی ہیں، بکاؤلی تخت پر بیٹھکر ہوا پر اُڑتی ہے تاج الملوک تخت کا پایہ پکڑکر لٹک جاتا ہے۔ بکاؤلی اور تخت نشین پریاں نہیں دیکھتی ہیں تو نہ دیکھیں مگر کمال یہ ہے کہ کاندھے پر تخت لیکر اڑانے والے دیو زاد بھی اندھے بن جاتے ہیں اور پائے سے لٹکا ہوا آدمی زاد اُنھیں نہیں سوجھتا۔ نہ آدمی کی بو اُن کی ناک میں جاتی ہے۔ یہی واقعہ ایک یا نہیں دو شب برابر ہوتا ہے۔ تاج الملوک، دو مرتبہ اسی طرح جاتا ہے اور واپس آ جاتا ہے، یا دوسرے الفاظ میں اسی طرح چار مرتبہ تخت کے پائے سے لٹک کر جاتا آتا ہے!

بکاؤلی کی ماں تاج الملوک کو دریائے طلسم میں پھینک دیتی ہے، وہ ایک طلسمی جزیرہ میں محبوس ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک چشمہ میں نہا کر نکلتا ہے تو عورت بن جاتا ہے۔ ایک مرد اُسے اپنے گھر لیجاتا ہے وہ عورت بن گیا تھا حاملہ ہوتا ہے اور بچہ جنتا ہے۔ پھر دوسرے چشمہ میں نہا کر مرد بنجاتا ہے مگر نہایت ہی بدشکل، ایک دیونی اُسے اپنا شوہر سمجھکر ایک لکڑیوں کا گٹھا اُس کے سر پر لاد دیتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ جا بیچ لا۔ شاہزادہ گٹھا سر پر لاد لیتا ہے اور جب دیونی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے تو گٹھا پھینکدیتا ہے۔ ان واقعات سے پہلے وہ اس طلسمی جزیرہ کے ایک درخت کے عجیب الاثر پھل پھول، شاخ چھال اور گوند پا چکا ہے۔ شاخ کی لاٹھی اُس کے پاس موجود ہے جس کی بے پناہ ضرب سے ایک دیو آن واحد میں مر گیا تھا۔ چھال کی ٹوپی موجود ہے جسے سر پر رکھ کر وہ ہر ایک کی نظر سے غائب ہو سکتا ہے۔ لاٹھی کے سرے دونوں ہاتھوں میں لیکر وہ ہوا پر اُڑ سکتا ہے۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ وہ مخرلہ عورت بن جانا گوارا کر لیتا ہے، نہ لاٹھی سے کام لیتا ہے نہ ٹوپی سے، اور اس کے مقابلہ میں لکڑیوں کا گٹھا سر پر لاد لینا تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے!

دیو سے مقابلہ کے موقعہ پر تاج الملوک لاٹھی کے دونوں سرے ہاتھوں میں پکڑ کر ہوا پر اُڑ رہا ہے دیو بھی اُڑکر مقابل ہو جاتا ہے۔ تاج الملوک اپنی لاٹھی کی ضرب سے دیو کو مار ڈالتا ہے، یہ لڑائی ہوا پر ہوتی ہے

لیکن جب آڑتے کی ترکیب یہ ہے کہ لاٹھی کے دونوں سرے دونوں ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے تو دیو کو لاٹھی مارنے کے لئے جس وقت ایک ہی سرا تاج الملوک کے ہاتھ میں رہ گیا تھا خود اُسی کو زمین پر گر کر پاش پاش ہو جانا چاہئیے تھا!

اس طلسمی جزیرہ کے واقعات یہ ہیں کہ تاج الملوک جس درخت کے پھل پھول چھوتا ہے وہ ہاتھ لگاتے ہی غائب ہو جاتے ہیں اور ہُو کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن اسی طلسمی جزیرہ میں طلسمی نہیں اصلی گائیں چر رہی ہیں۔ کیا چر رہی ہیں جبکہ ہر پھول پھل ہوا ہی ہوا ہے؟ ان گایوں کا دودھ اصلی دودھ ہے اور گوبر واقعی گوبر ہے؟

تاج الملوک کی کیا عمر ہوگی جب بکاؤلی بچہ کا نصف حصہ جنم بن جانے کے بعد ایک دہقان کے گھر جنم لیتی ہے۔ اور پیدا ہو کر سنِ شعور کو پہونچتی ہے۔ اور دوبارہ تاج الملوک کو ملتی ہے؟ اگر قصہ کے کل واقعات پیش نظر رکھکر اندازہ کیا جائے تو عجب نہیں اگر اس کی عمر ساٹھ برس کی ٹھہرے جبکہ بکاؤلی کی عمر کم و بیش بارہ سال تھی!

فسانہ میں کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ بکاؤلی کا پھول کوئی طلسمی پھول تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اُس پھول اور اُس درخت کے باقی اور خواص سب وہی ہونا چاہئیے جو قانون فطرت کے مطابق ہوں۔ قصہ میں یہ امر صاف کر دیا گیا ہے کہ تاج الملوک نے محض ایک ہی پھول توڑا تھا۔ بعض درخت ایک ہی پھول کا ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ پھول ہمیشہ شاداب رہتا ہے اور اس کا شباب ازلی اور ابدی ہے؟ اگر وہ ایک ہی پھول والا درخت نہیں تھا تو اُس میں اور پھول اور کلیاں بھی ہونگی۔ پھر اُس ایک پھول کے چرائے جانے پر یہ قیامت برپا کرنا عقل کی بات نہ تھی۔ اگر وہ ایک ہی پھول تھا تو آخر کب تک قائم رہ سکتا تھا۔ قصہ سے ظاہر ہے کہ کافی مدت تک قائم رہ چکا تھا۔ ہر کمالے را زوالے۔ آخر اُس کی پنکھڑیاں ایک ایک کرکے جدا ہو جاتیں اور پھول فنا ہو جاتا۔ ایسے پھول پر آنا حشر برپا کرنے کے کیا معنی ہو سکتے تھے! اگر یہ پھول طلسمی تھا تو محافظانِ طلسم اُسی وقت سے خبر دینا شروع کر دیتے جب تاج الملوک نے پہلی مرتبہ دیو کو حلوہ کھلا کر اس سے اعانت کا وعدہ لیا تھا۔ اور حمالہ حمایت کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتی۔ اگر کرتی تو تاج الملوک اُسی کے گھر سے گرفتار ہو جاتا۔ یا زیادہ سے زیادہ جس وقت دیو زاد جو ہے بنکر سرنگ کھودنے چلے ہیں سب کے سب پکڑ لئے جاتے۔ جیسا کہ طلسم ہوشربا وغیرہ میں ہوا کرتا تھا۔

باپ کے کورچشم ہوتے ہی تاج الملوک گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ تھوڑی مدت بعد وہ دلبر سے ملتا ہے اور دلبر اُسے شادی کا پیام دیتی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ وہ اس عمر کا تھا جس میں عموماً شادی

کی جاتی ہے۔ ادھر وہ گھر سے نکلتا ہے۔ ادھر چاروں شاہزادے معہ لشکر گل بکاؤلی کی تلاش میں گھر سے
نکلتے ہیں۔ راہ میں لشکر دیکھکر تاج الملوک ایک سپاہی سے ہمکلام ہوتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ کس
کی فوج ہے اور کہاں جا رہی ہے؟ سپاہی سارا حال کہہ سناتا ہے۔ نہ سپاہی تاج الملوک کو پہچانتا ہے اور
نہ تاج الملوک ہی فوج کی وردی تک پہچانتا ہے نہ اُسے اتنی بھی عقل ہے کہ اس کے باپ کی سلطنت کے
اندر کسی اور بادشاہ کی فوج کیونکر داخل ہو سکتی تھی! علیٰ ہذا جب شاہزادے اُس سے پھول چھینتے ہیں اور
تاج الملوک فقیر کے بھیس میں ہے شاہزادے تاج الملوک کو مطلق نہیں پہچانتے۔

بکاؤلی یکایک تاج الملوک کی تلاش میں تنِ تنہا گھر سے غائب ہو جاتی ہے۔ زین الملوک کے دربا
میں فرخ وزیر بنکر رہتی ہے۔ تاج الملوک سے ملتی ہے، اُسے اُس کے باپ سے ملاتی ہے۔ اُسی کی
زبانی پھول چرائے جانے کی ساری داستان سنتی ہے اور خاطر خواہ تحقیقات کر لینے کے بعد یہاں سے
بھی یکایک غائب ہو جاتی ہے۔ بکاؤلی معمولی پری نہیں شاہزادی ہے۔ اس کے ماں باپ زندہ ہیں
اس کی یکایک گم گشتگی اور اتنی مدت تک غائب رہنے پر اس کے ماں باپ کا یہ تغافل اور یہ استغنا
قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ اس دراز مدت کے اندر نہ اُسے کوئی یاد کرتا ہے نہ کوئی جستجو ہوتی ہے اور
نہ اُس کی واپسی پر کوئی متنفس اس سے اتنا بھی پوچھتا ہے کہ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں، اور اتنے عرصے
تک کہاں رہیں؟ بعینہٖ اسی طرح شاہزادی چترا وت باپ ماں سے بے کچھ کہے سنے تاج الملوک اور بکاؤلی
کے ساتھ تخت پر بیٹھکر ہوا ہو جاتی ہے اور اُس کے ماں باپ نہ اُسے یاد کرتے ہیں نہ تلاش کرتے ہیں؟

تاج الملوک حمالہ دیونی کا بال آگ پر رکھتا ہے۔ ایک شدید آندھی اُٹھتی ہے جو حمالہ کی آمد کی خبر
دیتی ہے۔ لیکن وہی حمالہ جب تاج الملوک کو ساتھ لیکر واپس آتی ہے تو بکاؤلی کی ماں کو خبر بھی نہیں ہوتی
جو اُس وقت بکاؤلی سے سرگرم گفتگو ہے۔ حمالہ کو ہوا سے زمین پر اُترنے سے پہلے ہی علم ہو جاتا ہے کہ بکاؤ
کی ماں موجود ہے اور وہ اُسے وہاں سے کچھ فاصلہ پر اتارتی ہے۔ اگر حمالہ ساحرہ ہے اور عموماً دیو اور پریا
سحر جانتی ہیں تو بکاؤلی کی ماں کا اس فن سے محروم رہنا سخت تعجب خیز ہے! تعجب پر تعجب یہ ہے کہ حما
کے آنے پر آندھی کیوں نہیں آتی!

راجہ اندر کا عطیہ نولکھا ہار کیا قدر و قیمت رکھ سکتا ہے جب حال یہ ہے کہ بکاؤلی اسے اپنے پچھا
کے گلے میں ڈال دیتی ہے اور بھول جاتی ہے۔ اسی طرح بکاؤلی کی بارہ دری کی کیا وقعت باقی رہتی
جب معمولی دیوزاد جو پریوں کے ادنیٰ خدام کے درجہ کے ہوتے تھے بعینہٖ اسی کی دوسری نقل دم
دم میں بنا کے تاج الملوک کے لئے طیار کر دیتے ہیں اور بے جگری کا یہ عالم ہے کہ قیمتی قالین و جواہ

کے ڈھیر کے ڈھیر جو زین الملوک کی آمد کے اہتمام میں جنگل میں بجا دیئے گئے تھے، بادشاہ کی سواری ادھر آگے بڑھتی جاتی ہے اُدھر پیچھے کا سارا سامان لٹا دیا جاتا ہے۔

سحر و ساحری، جن و پری یا اسی قبیل کی اور مافوق العادت باتیں ادبی تصانیف میں داخل کرنا عیب نہیں بلکہ جائز ہے، اور یورپ کا ادب بھی ان سے خالی نہیں ہے۔ لیکن ربط اور تسلسل ہونے کی ضرورت ہے جو بات کہی جائے وہ اپنے دائرہ حدود اور مستثنیات کے اندر ممکن نظر آسکے۔ انمل بے جوڑ باتیں نہ کہی جائیں جن کی کوئی چول سیدھی نہ ہو۔ شاعری قانون فطرت کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ اور شاعر وہی ہو سکتا ہے جو فطرت انسانی کا ماہر ہو۔

مثنوی گلزار نسیم کی تاریخ تصنیف خود مصنف ہی کے مصرعہ "توقیع قبول روزیش باد" سے نکلتی ہے یعنی ۱۲۵۴ھ ہے۔ اس مثنوی نے گرم و سرد زمانہ کی کم و بیش ایک صدی دیکھی ہے۔ اُس زمانے سے آج تک سحر البیان کی مثنوی سے لیکر احمد علی شوق مرحوم کے ترانۂ شوق تک جو اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے کتنی مثنویاں لکھی گئیں اور کئی مثنویاں اپنی اپنی حدود کے اندر کامیاب بھی ہوئیں لیکن گلزار نسیم سے بڑھ جانا تو کار دارد گلزار نسیم کے پائے کی بھی کوئی دوسری مثنوی عالم وجود میں نہ آسکی۔ بعضوں نے کہنا شروع کر دیا کہ شوق نے نسیم کی مثنوی کا جواب لکھا ہے۔ شوق سے نہ رہا گیا، اُنھوں نے خود تردید فرمائی اور لکھا کہ "اگرچہ بحر میں نے بھی وہی اختیار کی ہے لیکن میں نے ہرگز گلزار نسیم کا جواب نہیں لکھا ہے۔ البتہ لکھتے وقت گلزار نسیم میرے پیش نظر تھی۔ اس کے بعد خود اعتراف فرماتے ہیں کہ نسیم کے ایک شعر:-

چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں

کے مقابل میں شعر کہتے وقت" دانتوں پسینہ آگیا" اور یہ حال ہمارے وقت کی بڑی سے بڑی ہستی ترانۂ شوق اور عالم خیال کے مصنف اور سب سے بڑے نقاد فن کا تھا۔

خوشی کا مقام ہے کہ مثنوی کے ابتدائی حصہ میں نسیم نے جو دعا مانگی تھی بارگاہ احدیت میں وہ لفظ بلفظ مقبول ہوئی۔ ایک ایک شعر پڑھکر خود ہی انصاف فرمایئے دعا مقبول ہوئی یا نہیں۔

یا رب مرے خامہ کو زباں دے منقار ہزار داستاں دے

منقار ہزار داستاں مل گئی یا نہیں!

افسانۂ گل بکاؤلی کا افسوں ہو بہار عاشقی کا
خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر نیرنگ نسیم باغ کشمیر

نیرنگ نسیم باغ کشمیر کا کیا کہنا، دلوں کے تسخیر کا عالم گواہ ہے!

نقطے ہوں سپند خوش بیانی | ہر دل ہو حصارِ سحر خوانی
جو نکتہ لکھوں کہیں نہ مرنے آئے | مرکز پہ کشش مرے پہونچ جائے

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کا پیغام

چندر نگر میں بنگال کے ہندوؤں کی کانفرنس ہوئی جس میں ڈاکٹر ٹیگور نے مندرجہ ذیل پیغام ارسال فرمایا

"ہم کتوں کو چھوتے ہیں مگر آدمی کے سایہ سے بھاگتے ہیں۔ بلی چوہے کھاتی ہے اور آدمی کی چھوٹی روٹی پر گذارہ کرتی ہے۔ یہ چیزیں کھا کر وہ منہ بھی صاف نہیں کرتی۔ اس حالت میں وہ برہمن کی گود میں بیٹھ سکتی ہے اس سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ مچھلی غلاظت کھاتی ہے وہی مچھلی برہمن اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے مگر اوس سے اسکا جسم ناپاک نہیں ہوتا۔ مہتر کے پیشہ میں جو غلاظت ہے وہ ہم سب کے جسموں میں بھی ہے۔ ماں بھی تو اپنے بچے کا میلا صاف کرتی ہے۔ مگر اس سے نفرت نہیں کیجاتی بلکہ اسکا احترام ہوتا ہے۔ ماہی گیر عورت مچھلی پکڑنے کیلئے گہرے کیچڑ میں جاتی ہے مگر اسکی وجہ سے اسکو غلیظ نہیں ٹھہرایا جاتا۔ جب وہ کیچڑ سے باہر آکر صاف ہو جاتی ہے تو پھر اسکے اور دوسری عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رہتا جن پیشوں کو ہم ادنیٰ کہتے ہیں وہ ہماری حاجتوں کے پورا کرنے کیلئے ہیں۔ حالات کے مطابق ہم کوئی بھی پیشہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ذہنیت سے زیادہ قابل نفرت اور کوئی بات نہیں کہ ہم ان لوگوں سے نفرت کریں۔ جو ہمارا کام کرتے ہیں۔ ان اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو مندر میں جانے سے کوئی نہیں روکتا جو اپنی بداعمالیوں سے ہریجنوں کے اخلاق کو بگاڑتے ہیں مگر ہریجنوں کو مندروں کے پاس نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ یہ خیال کرنا حماقت ہے کہ جس طرح پانی سے بدن کا میل اتر جاتا ہے اسی طرح نہانے سے دل کا میل بھی دور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اصول ہو کہ جس کا جسم میلا اور غلیظ ہوگا۔ اسکو مندر میں داخل نہیں کیا جائے گا تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا جس برہمن کو کوئی قابل نفرت بیماری ہوتی ہے اسکو سوسائٹی اور مندروں سے نکال دیا جاتا ہے؟ اگر کسی کو میلے بدن کی وجہ سے مندروں سے دور رکھا جائے تو میں اس میں کوئی ہرج نہیں دیکھتا۔ مگر یہاں اس کو معاف نہیں کرتا کہ تمام فرقہ کو اچھوت سمجھا جائے اور یقیناً اس نے ہندوستان کو بھی اس گناہ کے لئے معاف نہیں کیا۔ اگر جنم کی بنا پر کسی کو ادنیٰ قرار دینے کے اصول کو تسلیم کریں اور اگر یہ کہیں کہ وہ گورے رنگ کی وجہ سے ہندوستان پر حکومت کرنے کا مستحق ہو تو پھر ہندوستانیوں کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔

سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت

(۲)

(از جناب سلیم جعفر صاحب)

تصریف

تصریف مروجہ کی ترتیب پر ایک نظر

صرف کبیر کی جو ترتیب صفوۃ المصادر میں ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں چھ طرح کے ماضی لکھے جاسکتے ہیں اور دوسرے حصے میں مضارع سے لیکر اسم مفعول تک۔ اگر صفوۃ المصادر کو مستند نہ مانا جائے، اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں کہ اس کو مستند مانا ہی جائے، تو بھی قواعد فارسی کے مصنف پہلے ماضی سے بحث کرتے ہیں اور پھر مضارع اور حال وغیرہ سے۔ ماضی میں وہ جملہ اقسام ماضی کو شامل کر لیتے ہیں۔ اس لئے اس ترتیب کو قبول عام ضرور حاصل ہے اور اس کا عرصے سے رائج ہونا چاہتا ہے کہ اس سے کچھ بحث کی جائے۔ ترتیب زیر بحث کی تہ میں اس خیال کی جھلک نظر آتی ہے کہ تمام صیغے جن کا زمانۂ گذشتہ سے تعلق ہے وہ ایک جگہ جمع کر دئے جائیں۔ پھر مضارع اور حال، کیونکہ عام خیال ہے کہ مضارع سے حال بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مستقبل اور مستقبل کے بعد امر و نہی وغیرہ۔ مستقبل تک کی ترتیب ترتیب زمانی سے مطابقت رکھنے کے باعث درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ ماضی و حال و استقبال زمانے کی یہی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ امر و نہی، اسم فاعل و اسم مفعول کو ترتیب زمانی سے کوئی واسطہ نہیں مگر انھیں اس ترتیب میں شامل کرنا ضروری تھا اور شامل کر لئے گئے تاہم ان میں تقدیم و تاخیر کی گنجایش تھی شاید اس خیال سے کہ امر و نہی فعل ہیں اور ایک ایسی ترتیب میں جس کا زیادہ تر تعلق فعل سے ہے فعل کو تقدم حاصل ہے ان کو مستقبل کے بعد ہی جگہ دے دی گئی۔ اسم فاعل اور اسم مفعول کو فعل سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ یہ ایسے مشتقات ہیں جو اسم مانے جاتے اور صفت کا کام دیتے ہیں اس لئے ان کو اول تو اسمائے صفت میں جگہ دینی تھی اور وہاں نہیں تو ان کے لئے موزوں جگہ اسم ہے۔ لیکن اتنی سی نسبت کی بنا پر کہ وہ فعل سے بنائے جاتے ہیں، انکو بھی اسی ترتیب میں داخل کر دیا گیا۔

یوں تو یہ ترتیب درست ہی ہے لیکن سنسکرت کے اصول قواعد کے لحاظ سے اس میں ذرا سی کسر ہے۔ سنسکرت میں تصریف افعال کی ترتیب "صورت" (Mood = नियम) اور "زمانہ" (Tense = काल) پر مبنی ہے۔ صورتیں چھ ہیں۔ خبریہ (स्वार्थ) امکانیہ و احتمالیہ[1] (सम्भावनार्थ) امریہ (अनुमत्यर्थ) شرطیہ (आशंसार्थ) دعائیہ (आशीर्वादार्थ) اور مصدریہ (भाववाचक)۔ صورت خبریہ کے علاوہ سنسکرت جدیدہ نے اور صورتوں کے ماضی و حال و استقبال کو خیرباد کہہ دیا۔ اب ان کے محافظ وید مقدس ہی ہیں۔ اس لئے جن جن زمانوں کا جن جن صورتوں سے تعلق ہے ان کو انھیں کے تحت میں رکھنا چاہیئے۔

سنسکرت کی رو سے تصریف کی ترتیب یہ ہونی چاہیئے۔

صورت خبریہ = حال۔ ماضی مطلق۔ ماضی قریب۔ ماضی بعید۔ مستقبل۔

صورت امکانیہ و احتمالیہ = ماضی تمنائی و احتمالی۔ مضارع۔

صورت امریہ = امر و نہی۔

مصدر بابوں میں تقسیم کئے جانے چاہئیں

سنسکرت کے مادّے دس بابوں (गणों) میں منقسم ہیں۔ ہر باب میں صورت خبریہ کے بعض زمانے اور صورت ہائے امریہ و امکانیہ کے بنانے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ تصریف فارسی میں بھی اس کا پتا چلتا ہے۔ فرمودن سے فرمایہ اور گزیدن سے گزیند وغیرہ سے خیال ہوتا ہے کہ فرمودن و فرسودن وغیرہ کے مادّے دسویں باب سے تعلق رکھتے ہیں جو چاہتا ہے کہ ترمیم کردہ مادّے میں لاحقات لگانے سے پہلے اس کے آخر میں "اے" (अय) بڑھایا جائے۔ یا دیدن و شکستن وغیرہ کے مضارع دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق پانچویں یا ساتویں یا نویں باب سے ہے کیونکہ ان بابوں میں حال بنانے کے لئے بالترتیب नु - न - ना (نُ - نَ - نا) بڑھانا پڑتا ہے۔ یہ بات ایک طرف تو اس کا مزید ثبوت بہم پہونچاتی ہے کہ مادّے ہی اصل فعل ہیں اور سنسکرت و فارسی ایک ہی "شجر معرفت" کی دو شاخیں ہیں اور دوسری طرف اس کی متقاضی ہے کہ مصدر محض تختی اتہجی کے لحاظ سے ترتیب نہ دیے جائیں بلکہ بابوں کو مدّ نظر رکھکر یہ ترتیب بھی تقسیم کردی جائے یا یوں کیا جائے کہ پہلے مصدر بہ لحاظ مادّہ بابوں میں تقسیم کردیئے جائیں اور پھر ہر باب کے مصدر بہ لحاظ تختی تہجی رکھے جائیں۔

فعل

فعل کے اقسام مختلفہ سے بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے کہ

---

[1] تمنا بھی اسی میں شامل ہے۔

ارتقائی میں زبان نے جب ترقی و نمو کی ہے تو پہلے پہل کون سے صیغے بنائے گئے کیونکہ جب تک اس کا تعین نہ ہوگا، یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ساخ کو وحدت و جمعیت اور حاضر و غائب کا فرق بتانے کے لئے جو طریقہ انسان نے اختیار کیا ہے وہ کس زمانے سے مخصوص ہے۔ پروفیسر ہوٹنی نے زبان کے یک واحد الاجزاء (Monosyllabic) اور پھر کثیر الاجزاء (Polysyllabic) بن جانے کے متعلق جو بحث کی ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو صیغے بنائے گئے وہ زمانۂ حال پر دلالت کرتے تھے۔ پروفیسر موصوف کا یہ نظریہ معقول نظر آتا ہے۔ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہی انسان کو نہ تو کسی زمانے کا قطعی کوئی احساس و خیال ہی نہیں ہو سکتا یا ہو سکتا ہے تو سب سے پہلے زمانۂ موجودہ یعنی اس شے کا جو آنکھ کھولتے ہی اس کے سامنے آئے۔ زمانۂ گذشتہ کا خیال بعد میں آئے گا اور اس وقت جبکہ وہ دو واقعات میں تعلق و ترتیب قائم کرکے یہ فیصلہ کرے گا۔ ان میں سے بلحاظ ترتیب وقوع کون کس سے پہلے واقع ہوا۔ اگر بفرض محال اس ترتیب کی نوبت ہی نہ آئے یا اس کا حافظہ اس قدر کمزور ہو کہ واقعات کے ظہور پزیر ہوتے ہی ان کا خیال اس کے دل سے بالکل جاتا رہے یا اس کا واہمہ اتنا ناقص ہو کہ وہ تسلسل زمان کو بالکل نہ سمجھ سکے اور ساعتِ موجودہ کے بعد دوسری ساعت کے آنے اور اس میں واقعات کے ظہور پزیر ہونے کا تصور نہ کر سکے تو بھی آنکھوں کے سامنے جو شے ہر لمحہ و ساعت موجود ہے اس کا تصور اس کے لئے لازمی و لابدی ہے۔ مختصر یہ کہ زمانۂ حال کا تصور ہونا اور سب سے پہلے ہونا ناگزیر ہے۔ حالانکہ زمانۂ گذشتہ یا آیندہ کا تصور موقوف و منحصر ہے چند کیفیات و شرائط پر۔ اس تمہید کے بعد ہم مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حال و مضارع

سنسکرت میں حال (वर्तमान) و مضارع (सम्भाव्य) کی عجب کیفیت ہے۔ حال کبھی کبھی اپنے مخصوص معنی کے علاوہ استقبال کے معنی میں بھی آتا ہے مثلاً (कदा त्वां पश्यामि) (میں تجھے کب دیکھوں گا) اور کبھی امر کے بھی جیسے नत् कुर्म: (میں اس کو کروں)۔ مضارع کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کے بہت سے معنی ہیں، محل و موقع کا جیسا تقاضا ہو وہی سمجھ لو۔ مثلاً यस्याभाव: स्यात (جسکا ہو فراغ چاہیے) اور अप्राप्त कालवचनं प्रवन प्राप्नुयाद अपमानम (بے موقع بولنے والا ذلیل ہوتا ہے اور ہوگا) فارسی نے مضارع کو محض حال (گویند نلک ہمال روز فتح یافت) و استقبال (ع۔ گرم تا کے باند ایں بازار) کے معنی سے آراستہ کیا اور حال سے جب جی چاہا

ـــــــــــــــــــــــــــــ

سے صفحہ ۳ زبان و مطالعہ زبان مصنفہ پروفیسر ڈبلیو ڈی ہیوٹنی مترجمہ مولوی حمید احمد خاں صاحب ایم۔ اے پروفیسر اشاعت گورنمنٹ کالج لاہور

استقبال (حالا بندہ رخصت می شوم) کے معنی بھی لے لئے مگر تعداد منبع فعل (وحدت و جمعیت فاعل) اور فعل ہے صدور فعل۔ اس کا تعلق بہ لحاظ مکان و انتساب صدور فعل (یعنی بات کرنے والا صدور فعل جس کی ذات سے منسوب کر رہا ہے وہ بوقت کلام اس جگہ موجود (حاضر) ہے یا نہیں (غائب) اور موجود ہے تو کس حیثیت سے۔ بہ حیثیت اس شخص کے جس کی جانب صدور فعل ایک غیر شخص منسوب کر رہا ہے (مخاطب) یا بہ حیثیت اس کے جس کا کلام صدور فعل کو خود اس کی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے (متکلم)) معین کرنے چلے تو کچھ لاحقات سنسکرت کے حال سے لئے تو کچھ مضارع سے اور یوں سامان تصریف بہم پہنچا کر ایک ایسا قاعدۂ کلیہ بنا لیا جس پر وہ باستثنائے صیغۂ واحد غائب ہر حال میں عامل رہے۔

وہ لاحقات جو مضارع سے لئے گئے		
शत्त्यर्थ प्रस्मै पद		
मध्यम पुरुष		
एक बचन	इ: *	ی
" बहु "	एत	ئے
उत्तम पुरुष		
बहु बचन	एम	یں

* ان کے سوا سب میں अ بڑھا ہوا ہے۔

وہ لاحقات جو حال سے لئے گئے		
वर्तमान प्रस्मै पद		
अन्यपुरुष -		
एक बचन	अति	ے
" बहु "	अन्ति	ند
उत्तम पुरुष		
एक बचन	मि *	م

عــہ یہاں کوئی بات خلاف مسلمات نہیں کہی گئی ہے، بالعموم فاعل کی تین حالتیں مانی گئی ہیں۔ غائب۔ حاضر۔ متکلم جن کی بنیاد "انتساب" و "مکان" پر رکھی گئی ہے: "انتساب" پر اس طرح کہ کلام کرنے والا صدور فعل کو اپنی طرف منسوب کر رہا ہے (متکلم) یا غیر کی طرف (حاضر و غائب) اور "مکان" پر اس طرح کہ صدور فعل جس کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ وہاں موجود (حاضر و متکلم) ہے یا نہیں (غائب)۔ انتساب و مکان ہر ایک سے یہ دو شقیں پیدا ہوئیں۔

انتساب = (۱) انتساب نفسی یعنی متکلم (۲) انتساب غیری یعنی غائب و حاضر

مکان = (۱) موجود یعنی حاضر و متکلم (۲) غیر موجود یعنی غائب۔

فرق و امتیاز کے لئے دونوں میں سے قدر مشترک کو الگ کر کے بلحاظ وصف اس کا نام تراشا گیا اور باقی کے دو ناموں میں "مکان" کا لحاظ کیا گیا۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جسے اصطلاح قواعد میں متکلم کہتے ہیں وہ نحو تو تینوں حالتوں میں سے کوئی بھی پیدا نہیں ہو سکتی قواعد میں متکلم محض اس واسطے متکلم نہیں ہے کہ وہ باتیں کرتا ہے۔ بلکہ وہ صدور فعل کا منبع خود کو بتاتا ہے اس لئے متکلم ہے۔ بیچ ہی وہ اور ہستیوں کو وجود میں لاتا ہے جن میں سے ایک وہیں موجود ہے جہاں وہ خود ہے اور اس سے وہ کہتا ہے تجھ سے فلاں فعل صادر ہوا۔ اور دوسرے وہاں موجود نہیں جہاں وہ خود ہے مگر اس کا ذکر کرتا اور اس کی نسبت کہتا ہے کہ فلاں فعل کے صادر ہونے کا وہ باعث ہے

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ سنسکرت کی "ت" فارسی میں اکثر "د" سے بدل گئی ہے علاوہ اس کے جو فرق نظر آتا ہے وہ تغیر صوتی کا کرشمہ ہے۔ اس کو تاویل لایعنی پر محمول کرنا حقایق کا خون کرنا ہے۔
رفع التباس کے لئے ایرانیوں نے مضارع پر "می" بڑھا کر "حال" بنانا شروع کیا۔ یہ لفظ وہ کہاں سے لائے اس کے لئے سنسکرت میں کون سی مشابہت موجود تھی جس نے شمع ہدایت کا کام دیا اس کا پتا نہیں لگتا لیکن خیال ہوتا ہے کہ شاید "سم" (सम) سے "ہمی" اور "ہمی" مخفف ہو کر "می" رہ گیا۔

مستقبل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل عربوں، ایرانیوں اور ہندیوں سب کے لئے دقتیں پیش کرتا رہا ہے اگرچہ ذہن میں اس کا تصور صاف صاف پیدا ہو چکا تھا اور زمانہائے گذشتہ و موجودہ سے وہ ایک بالکل الگ اور نئی چیز سمجھا جاتا تھا۔ مگر زمانہ موجودہ سے اس کا تعلق اتنا گہرا اور زمانہ گزشتہ سے اتنا دور نظر آتا تھا کہ انہوں نے اسے زمانۂ گزشتہ سے تو بالکل الگ کر دیا لیکن زمانۂ موجودہ سے الگ نہ کر سکے۔ عربوں نے حال کے لئے جو صیغہ بنایا اسی سے استقبال کا کام لیا۔ سنسکرت والوں نے اس خیال کو اسم فاعل ترکیبی اور حال کے صیغوں کو ملا کر ظاہر کیا۔ فارسی نے اپنی بہن سنسکرت کا اسی وقت تک ساتھ دیا جب تک امتداد زمانہ نے اس کے خط و خال پر اپنے گہرے نقش مرتسم نہ کئے جب دونوں بہنوں کو بچھڑے صدیاں گزر گئیں اور عادات و اطوار میں اتنا فرق پڑ گیا کہ ظاہر بیں نظریں انھیں دیکھ کر ماں جائی بہنیں کہنے سے دریغ کرتی ہیں تو اس نے بھی سنسکرت کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنی ڈھائی اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ جس ترکیب سے ایرانی زمانۂ استقبال ظاہر کرتا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں خیالات میں تو اس کے بھی وہی کھٹک ہے جو عربی اور سنسکرت بولنے والوں کی پائی جاتی ہے مگر اس کے نزدیک آئندہ زمانے میں کسی فعل کے وقوع پزیر ہونے کا اظہار مرادف ہے اُس کے اُس زمانے میں وقوع پزیر ہونے کی خواہش کے اب سے چند صدی پہلے کا ایک بزرگ کہتا ہے ؎

رفتم از کوئے تو اے خو بہ جفا کردہ بہ گو صرف اوقات بہ آزار کہ خواہی کردن

اور اس کی اختصار پسند اولاد میں سے ایک بحالت وجد یوں نغمہ سرا ہوتا ہے ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

سنسکرت میں مستقبل کی دو قسمیں ہیں، قریب و بعید۔ اس نے اس کی پرواہ ہی نہ کی۔ مستقبل تو مستقبل

ﻋ۵ قواعد سنسکرت مصنفہ مونیر ولیم ترجمہ جانی بہاری لال صـ۵۷ - ۲۵۱

ﻋ۵ جامع القواعد صـ۲۱۲ و ۲۱۳ از پروفیسر آزاد۔

یعنی ہے کیا قریب کیا بعید۔

امر

مصدر کے بیان میں کہا جا چکا ہے کہ مادہ قبل اس کے کہ اس سے کچھ مشتق کیا جائے چند مقررہ اصول کے مطابق اکثر صورت بدلتا ہے۔ یہ صورت سنسکرت میں کلام ناقص (प्रातिपदिक [illegible]) سے موسوم ہے۔ امر میں بھی اور زمانوں کے صیغوں کی طرح بغرض امتیاز زمانہ و فاعل کلام ناقص کے آخر میں علامتیں بڑھا کر کلام تام بنایا جاتا ہے۔ ویدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صیغۂ واحد حاضر امر کی علامت धि تھا جو تصنیف مہابھارت کے وقت हि سے بدل گیا اور یہ دونوں علامتیں بھی سنسکرت جدید میں پہنچ کر قلیل الاستعمال ہو گئیں یہاں تک دو ہزار مادوں میں سے قریب قریب تین چوتھائی میں گر جاتی ہیں۔ فارسی میں کثرت قلت پر غالب آگئی اور اس نے اصول ہی یہ مقرر کر لیا کہ کلام ناقص سے صیغۂ واحد حاضر امر کا کام لے۔ مثلاً "پچ" (पिच) مادہ بمعنی پٹنا ہے اسیں جب ترمیم کر کے کلام ناقص بنایا جائے گا تو یہ "پیچ" (पेच) ہو جائے گا۔ یہی مصدر پیچیدن کا امر ہے۔
اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ "حال کے اہل تحقیق" اس دھوکے میں پڑ گئے کہ "فارسی زبان میں امر اصل[1] فعل ہے۔ ان کا دھوکا کھانا بجا ہے، وہ جانتے ہی نہیں کہ امر کیونکر بنا اور فعل واسم وغیرہ بنانے سے پہلے ایک چیز جسے مادہ کہتے ہیں وہ چند اصول کے مطابق کلام ناقص بنتا اور پھر ہر رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر انھیں یہ بات معلوم ہوتی تو اپنے کلام کی تائید میں جو دلیل پیش کرتے ہیں نہ کرتے۔ وہ ہرگز نہ کہتے کہ "اس سے مضارع، حال، نہی، اسم فاعل وغیرہ کتنے صیغے نکلتے ہیں" اس لیے یہ اصل ہے۔ اس معاملے میں پروفیسر آزاد مرحوم بھی کوئی قطعی رائے نہ قایم کر سکے، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک طرف تو انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ افعال مشتقہ کی اصل کیا ہے، دوسری طرف یہ دقت تھی کہ گو ابتدائی زمانہ میں فارسی اصول سنسکرت کی پابند رہی، زمانۂ مابعد میں جب لوگ حقیقت سے بے خبر ہو گئے اور خیال پیدا ہو گیا کہ امر ہی اصل اشتقاق ہے تو اکثر مصدر بعض مصدروں کے امر سے بنا ڈالے۔ مثلاً خواستن سے خواہ بطور امر بولا جاتا تھا اس سے خواہیدن گھڑ لیا گیا۔ جہاں کہیں ماضی و مضارع میں اختلاف ہے اکثر اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف بحث مصدر میں اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی دو مصدروں کے صیغے ملا کر مطلب برآری۔
سنسکرت میں امر کے صیغہائے غائب و متکلم بھی ہیں لیکن فارسی نے انھیں ترک کر دیا۔

---

[1] صفحہ ۱ جامع القواعد مصنفۂ پروفیسر محمد حسین آزاد

نہی

اسکو ایسی کوئی خصوصیت حاصل نہیں کہ ایک الگ صیغہ مانا جائے۔ جتنے فعل ہیں وہ مثبت و منفی دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں، اور یہ بھی اسی طرح مستعمل ہے۔ اگر اس کے اشتقاق کا کوئی خاص قاعدہ ہوتا تو یہ کہنا بجا ہوتا کہ اس کا رتبہ کسی صیغے سے کم نہیں۔ سنسکرت میں نفی فعل کے لئے "ن" (न) "نو" (नो) "نہہ" (नहि) بمعنی نہیں اور "ما" (मा) "ماسم" (मास्म) بمعنی "مت" آتے ہیں۔ فارسی، امر کے سوا، تمام صیغوں میں "ن" لگا کر نفی اثبات کرتی ہے لیکن اس کی نفی کے لئے شروع میں "م" لگاتی ہے پھر بھی "ن" سے پرہیز نہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ سنسکرت بھی امر پر मा لگا کر نہی بناتی ہے: मा कार्षीः (مت کر)۔

اسم فاعل

قاعدہ نویس بحث اسم میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی دلالت و استعمال اس کے منبع و طریق اشتقاق سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان اوراق میں طریق اشتقاق پر زور دیا گیا ہے اس لئے بحث فعل میں اس کا بیان قابل عفو سمجھا جائے۔

اسم فاعل کا مقابل سنسکرت میں प्रस्मै पद वाली वर्तमान गुण क्रिया معلوم ہوتی ہے۔ فارسی والے کہتے ہیں کہ امر کو کسرہ دیکر "ندہ" لگا دو۔ سنسکرت والوں کا مقولہ ہے کہ مادے میں ترمیم کرو، پھر صیغہ جمع غائب حال کا حرف آخر گرا کر کلام ناقص بناؤ اور کلام تام بنانے کے لئے اس کی تصریف اس طرح کرو جس طرح اُس کلام ناقص کی کرتے ہو جس کا حرف آخر "ت" (त्) ہوتا ہے۔ اس پر یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ "ن" غنہ کبھی قایم رہے اور کبھی گر جائے گا۔ مراد یہ کہ ترمیم کردہ مادہ کے آخر میں کبھی "انت" (अन्त) اور کبھی "ات" (अत) لگ کر کلام ناقص بنتا ہے۔ اس کلام ناقص کی صورت فاعلی بحالت واحد ایک ہائے مختفی چاہتی ہے۔ ادبی سنسکرت میں اس صیغے کی جو صورت نظر آتی ہے وہ خوش الحانی وغیرہ کی رعایت سے مسخ ہو جاتی ہے۔ مثلاً पचन्तस् صورت بدلے ہوئے पचन् ملے گا۔ مگر ہر سنسکرت داں جانتا ہے کہ اصل شکل کیا ہے۔ فارسی نے صرف اصل پر نگاہ رکھی اور اپنی عادت کے موافق "ت" کو "د" سے بدل دیا۔

"گن کریا سمبندھی کرتر واچک نام" (गुण क्रिया संबंधी कर्तृ वाचक नाम) کے کلام ناقص بنانے کا طریقہ اسم فاعل کے طریقے سے ایک حد تک ایسی مطابقت رکھتا ہے کہ خود بخود طبیعت اس طرف مائل ہوتی ہے کہ اس کو اسم فاعل کا مترادف مانیئے۔ مثلاً مادہ میں "ان" (इन) کا لگایا جانا یا جن مادوں کے آخر میں "آ" (आ) ہو ان میں "ی" (य) کا بڑھانا۔ لیکن ہمارا اس خیال سے مانع

ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں "ت" یا "د" کہیں نہیں آتی کہ کلام تام بنانے کے لئے بجائے "تحتی" بڑھا کر فارسی کے اسم فاعل کا "مطابق" (Correspondent) پیش کر دیا اور کہا جائے کہ فارسی نے اصل ہیئت قائم رکھی۔

اسم مفعول

یہ سنسکرت کا "کرمن واچیہ بھوت گن کریا" (कर्मणि वाच्य भूत गुण क्रिया) ہے جس کا کلام ناقص مادہ میں "ت" بڑھا کر بنایا جاتا ہے اور جس میں "ت" کے اضافہ سے کلام تام بنتا ہے مثلاً "کرت" (कृत) سے "کرتہ" (कृतः)۔ فارسی نے कृत کو "کرد" بنایا اور "ہ" زیادہ کر کے اسم مفعول "کردہ" بنا لیا

ماضی

سنسکرت نے زمانۂ ماضی میں تین قیدیں لگا دی ہیں، ان سے وہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وقوع فعل کو کتنی مدت گزری۔ جو کام آج سے پہلے ہو چکا وہ ختم تو ہو چکا لیکن اُسے گزرے بہت زمانہ نہیں ہوا تو اس کے لئے ایک ایسا صیغۂ فعل تراشنا لازمی ہے جو زمانۂ قریب ظاہر کرے اور گزشتہ کے دامن کو موجودہ سے باندھ دے (अनद्यतन वा अपूर्ण भूत) پھر ایک ایسا صیغہ بھی ہونا چاہیئے جو بتائے کہ کام کو کئے ہوئے مدت مدید گزری (प्रोक्त भूत) اور جب ماضی قرب و بعد کو نظر انداز کر بنا ڈالیں تو وہ صیغہ کیوں نہ ہو جس کو قرب و بعد دونوں ہی سے کوئی تعلق نہ ہو اور صرف زمانۂ ماضی میں ظہور فعل پر دلالت کرتا ہو۔ کیونکہ قرب و بعد کا مسئلہ تو اعمال دماغی کی دوسری منزل ہے، سب سے پہلے جو شعور ہو گا وہ تو اتنا ہی ہو گا کہ فعل وقت حاضرہ میں نہیں ہوا اس سے پہلے ہی یعنی زمانِ گزشتہ میں ہو چکا ہے۔ پس اساس و بنیاد تو یہی ماضی ہے (अनियत भूत)

ماضی کی حقیقی قسمیں یہی تین ہو سکتی ہیں لیکن یہ تعین محض امتداد زمانہ پر مبنی ہے۔ اور اسباب بھی تو پیدا ہو سکتے ہیں جو بے تاب جلوہ ہوں مثلاً متکلم کی معلومات ناقص مانع ہے کہ وہ ایک امر کی نسبت اس پیرائے میں گفتگو کرے جس سے وثوق مترشح ہو اور سامع کے دل میں اس کے وقوع پزیر ہونے کا الیقین ہو جائے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اسلوب کلام سے اس کی راست بازی پر حرف نہ آئے۔ لیجئے اب شک و احتمال پیدا ہو گیا۔ اسی طرح وہ کبھی فعل کا جاری رہنا اور کبھی آرزوؤں کا خون ہو جانا ظاہر کرنا چاہتا ہے لہذا وضع افعال سننے والے کے دل میں کیوں نہ خیال استمرار و تمنا پیدا کرے۔ اس طرح امتداد زمانہ اور اسباب مختلفہ نے ملکر بہو ماضی بنا ڈالے اگرچہ سنسکرت میں تین ماضی حقیقی معنی میں موجود ہیں لیکن ان سے زمان گزشتہ میں کسی کام

…میل ظاہر کرنے کا کام بہت کم لیا جاتا ہے۔ اکثر یہ غرض مرکب صیغوں سے کام لے کر پوری کی
…ی ہے۔ یہ صیغے کبھی "اس" (अस् = ہونا) اور کبھی "بھو" (भू = ہونا) کے صیغے "کرمن واچیہ
…گن کریا" (कर्मणि वाच्य भूत गुण क्रिया) سے ملا کر بنائے جاتے ہیں۔

سنسکرت کا ساتھ چھوڑنے کے بعد فارسی نے اختصار و سادگی پر بہت نظر رکھی اس لئے اس
…تیق ماضیوں میں سے صرف ایک کو جو قیدوں سے آزاد تھا اصل مانا اور اس کے لئے مفرد صیغے
…نے دیئے، اور باقی ماضی دو دو صیغے ملا ملا کر بنانے شروع کئے۔ ماضی قریب بالکل اسی طرح
…ا جیسے سنسکرت بناتی تھی یعنی اسم مفعول کے آخر میں مادہ "اس" (अस्) کے صیغۂ واحد غائب
…ی "اَسْت" (अस्ति) لگا کر۔ ماضی بعید میں ایک ماضی بڑھا دیا۔ ماضی احتمالی میں مضارع بڑھا دیا
…ر و استمرار کے لئے ماضی مطلق پر "می یا ہمی" اور تمنا کے لئے ماضی مطلق کے آخر میں صیغۂ حال
…حقات لگا دیئے۔ ماضی مطلق ہمیشہ سے کلام ناقص میں "اَت" (अत = त्) بنایا جاتا تھا۔
…نے تقلید کی۔

مصدر و امر کے بیان میں مفصل بحث کر کے بتایا جا چکا ہے کہ مادہ اصل فعل ہے۔ ماضی مطلق
…س نظریہ کا ایک مزید ثبوت پیش کر دیا۔ اور اس وجہ پر روشنی ڈال دی جس نے ایک گروہ کو
…رف مائل کیا کہ وہ ماضی کو اصل اشتقاق سمجھے۔ سنسکرت میں ماضی مطلق کا لاحقہ अत् یا त
…ور مصدر کا तुम इस لئے جن بزرگوں کے علم و تبحر کے دائرہ سے مطالعۂ سنسکرت خارج تھا
…دھوکا کھانا بالکل طبعی تھا اور جس قسم کے نظریے پروفیسر آزاد مرحوم نے جامع القواعد (صفحہ ۱۴-۱۲)
…پیش کئے وہ سراسر معقول۔

طورِ مجہول

جہاں تک فعل کے طورِ معروف سے بحث کی جاتی رہی ہے، اب اس کا طورِ مجہول بیان کیا
…ہے۔ سنسکرت نے طورِ مجہول بنانے میں بہت دریا دلی سے کام لیا ہے۔ فعل متعدی (سکرمک
(सकर्मक क्रिया) ہی سے مجہول نہیں بنائے بلکہ فعل لازم (اکرمک کریا = अकर्मक क्रिया)
…ی نوازا ہے۔ اگرچہ اس کو برابر کا حصہ نہیں دیا۔ فعل لازم سے جو صیغہائے مجہول بنائے گئے ہیں
…و کرمن واچیہ = भाव कर्मणि वाच्य) ان کی تصریف صرف صیغۂ واحد غائب ہی
…کی جاتی ہے، اور صیغے نہیں آتے۔ فعل متعدی سے جو مجہول کے صیغے آتے ہیں ان میں ایک
…یہ فرق بھی پیدا کیا ہے، جس کا مدار نوعیت فعل ہے۔ اگر معنی فعل سے یہ ظاہر ہو کہ اس کا کوئی

فاعل ہے تو اس کا نام "کرمنی" (कर्मणि) ہے اور اگر اس سے یہ مطلب نکلے کہ فعل کا اثر فاعل کی ذات ہی پر پڑتا ہے تو اس کو "کرمن کرتا" (कर्मणि कर्ता) کہتے ہیں مثالیں بالترتیب یہ ہیں۔

(۱) भूयते त्वया تجھ سے ہوتا ہے۔ (۲) तुद्यते وہ پیٹا جاتا ہے۔ (۳) भिद्यते काष्ठं لکڑی کٹتی ہے۔

سنسکرت نے فعل کے طور مجہول کا نام "کرمنی واچیہ" کے علاوہ "کرم پردھان" (कर्म: प्रधान) بھی رکھا ہے دونوں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مفعول نے فقرے کے کل اجزاء سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی اور متکلم ہیئت فعل سے اس بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہے۔

تعریف کے لئے محض لاحقات معروف نفسی سے کام لیا ہے مگر اس کی تہ میں کوئی خاص بات پنہاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ سنسکرت میں طور معروف کے لئے دو طرح کے لاحقے ہیں، ایک طرح کے لاحقے (आत्मने पद के प्रत्यय) لاحقات معروف نفسی) یہ ظاہر کرتے ہیں کہ صدور فعل سے خود فاعل مستفید ہوا ہے، اور دوسری طرح کے لاحقے (परस्मै पद के प्रत्यय = لاحقات معروف غیری) اس وقت کام آتے ہیں جبکہ صدور فعل سے فاعل نہیں بلکہ کوئی اور فائدہ اٹھائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طور معروف نفسی ہی قابل لحاظ ہے کیونکہ ایک تو سب فعل متعدی دونوں طرح کے لاحقوں کے معمول نہیں دوسرے لاحقات معروف نفسی جملہ مشتقات فعل میں کام آتے ہیں خواہ وہ براہ راست مادّوں سے بنائے گئے ہوں (सवि सुत क्रिया) خواہ ان میں کچھ اضافہ کر کے (निसृत क्रिया) اس صورت میں طور مجہول کے لئے جو مادہ میں اضافہ کر کے بنایا جاتا ہے لاحقات طور نفسی کا لگانا ایک طبعی امر ہے۔ طور معروف غیری کو سنسکرت کی وسعت و دقت نظر پر محمول کرنا چاہئیے۔

سنسکرت کے قواعد نویسوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ طور مجہول مادہ سے براہ راست نہیں بنتا بلکہ انہیں य بڑھانا پڑتا ہے اور وہ فعل مفرد نہیں فعل مرکب ہے لیکن مونیر ولیم صاحب اسپر یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ اس य کی اصل مادہ या (جانا) معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے فارسی اور سنسکرت کے طریق کار میں اگر کہیں مطابقت ہے تو وہ اتنی سی ہے کہ دونوں طور مجہول کو فعل مرکب ہی خیال کرتی ہیں۔ فارسی نے اپنی سہل انگاری کے باعث جہاں اور بہت سے فعل دو دو فعل ملا ملا کر بنالئے وہاں اس بارہ میں بھی وہی روش اختیار کی چنانچہ اسم مفعول اور مصدر شدن کے مختلف صیغے حسب ضرورت ملا ملا کر طور مجہول بنایا۔ اور سنسکرت باریکیوں سے جن کا ذکر آچکا ہے چشم پوشی کی۔

فلسفۂ تاریخ

(از مسٹر سلیم حامد رضوی بھوپالی (یونگ کرسچن کالج الہ آباد)

بعض علمائے یورپ کا خیال ہے کہ نیچر جو تبدیلیاں انسان میں اور انسان جو تصرفات نیچر میں کرتا ہے اُن کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے۔ اگر ہم اُن کے اس خیال کو اچھی طرح سمجھ لیں تو یقیناً ہم بے تکلف کہہ سکتے ہیں۔ کہ علوم انسانی کے مہتم بالشان شعبوں میں سے تاریخ ہی ایسا علم ہے جس نے حقائق و معلومات کا انکشاف کرکے مدنیت میں زبردست تبدیلیاں کردی ہیں۔ تاریخ کی اہمیت و عظمت کا احساس وہ لوگ خوب کر سکتے ہیں جو علوم جدیدہ" سے دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگرچہ تاریخ سب علوم سے مؤخر ہے لیکن نتائج و ترتیب کے لحاظ سے اس کو دیگر علوم میں اولیت حاصل ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تاریخ ہی ہماری زندگی کے بہت سے عقدوں کو حل کرتی اور ہمارے ہزاروں سوالات کا شافی جواب دیتی ہے۔ تاریخ اُن تمام باتوں کا حقیقی ماحصل ہے جو انسانی دل و دماغ میں پیدا ہوئیں، اور جو انسانی محنتوں کا نتیجہ ہیں۔

تاریخ سے نہ صرف انسان کے آغاز و آفرینش کا عقدہ حل ہوتا ہے بلکہ اُس کے انجام کا حال بھی معلوم کر لینا دشوار نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ انسان کی اُس عقل و فہم کا نتیجہ ہے جیسے وہ ابتدائی حالت کو چھوڑ کر ترقی کے خاص درجہ پر پہونچکر حاصل کرتا ہے۔ اس عالم کے بسنے والے صفحۂ زمین پر جو اپنے نقش قدم چھوڑ گئے ہیں وہ مستقبل کی ذہنیتوں اور عقلوں کے لئے گویا تجربہ کا کام دیتے ہیں، اور اُن نقوش کو تاریخ سے موسوم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے دنیا کے ابتدائی دور میں تاریخ صرف چند حکایتوں اور قصوں کا مجموعہ تھی جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ واقعات میں تصنع اور ناقابل یقین تذکرات کی آمیزش ہوگئی اور واقعات ہمارے سامنے بالکل مسخ شدہ حالت میں آئے جس کا انجام یہ ہوا کہ ہم دنیا کی ابتدائی تاریخ سے بالکل محروم ہوگئے۔ جس قدر ہم اس قدیم تاریخ کے متعلق واقفیت کا دعوی کرتے ہیں وہ سب کچھ نیم تاریخی مذہبی داستانوں سے حاصل کیا ہوا ذخیرہ ہے جس کو آریہ چینی اور یونانی ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ ایک محقق نے انھیں غیر مربوط واقعات سے نہایت ہی تنقید و تبصرہ کے ساتھ تاریخ مرتب کی۔

ایسا کرنا اُس کے لئے ضروری تھا۔ کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کی تمام ترقیاں تدریجاً ہوتی ہیں اور دنیا کا ہر موجودہ واقعہ گزشتہ واقعہ کا ایک نتیجہ ہے۔

غرض تاریخ اپنے اولین دور میں اس لئے غیر مربوط حالت میں تھی کہ دنیا فن کتابت سے ناآشنا تھی گو خطوط ہجری کے ارتسامات موجود تھے لیکن فن کتابت کی ترقی سے تاریخ اب اصلاح یافتہ صورت میں نظر آنے لگی ہے۔ قصص وحکایات کے بجائے واقعات کی تفصیل انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو پر غور کرکے اور افعال انسانی کو دیکھکر گزشتہ اور آئندہ واقعات؛ اُن کے اسباب ونتائج، تہذیب وتمدن اور اُن کے معرکۃ الآرا انقلابات پر بحث کی جانے لگی جس نے سلاطین ومشاہیر کے ذاتی تذکروں اور اُن کی سوانح عمریوں کو تاریخی حدود سے خارج کردیا۔

تاریخ کا موضوع کیا ہے؟ اس کا جواب ابن خلدون یہ دیتا ہے کہ تاریخ کا موضوع معاشرتی زندگی ہے یا دوسرے الفاظ میں جماعت کا مجموعی مادی اور ذہنی تمدن دکھانا تاریخ کا کام ہے۔ یعنی لوگ کس طرح محنت کرتے اور روزی کماتے تھے۔ وہ کیوں آپس میں لڑتے اور الگ الگ سرداروں کے ماتحت بڑی بڑی جماعتوں میں مربوط ہوتے ہیں۔ اور بالآخر کیونکر حضری زندگی میں اُن کو اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ اعلیٰ علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کس طرح آغاز سے رفتہ رفتہ ایک لطیف تمدن بن جاتا ہے اور کس طرح معدوم وفنا ہوجاتا ہے۔ جبکہ تاریخ کا کام کسی قوم کی تہذیب واخلاق سیاسیات ومعاشرت اتحاد وباہمی صنعت وحرفت، تمدن واقتصاد دکھانا ہے تو ایک محقق کے لئے یہی لازمی ہے کہ ان باتوں کو سمجھنے کے لئے وہ جغرافیہ داں ہو۔ علوم طبعیہ، اقتصادیات وسیاسیات میں کافی معلومات رکھتا ہو۔ قانون داں ہو، علم آثار قدیمہ، علم الالسنہ سے بھی واقف ہو تاکہ وہ انسان ونیچر کی باہم کشمکش کے رازکو سمجھکر دوسروں کو سمجھانے کی قابلیت پیدا کرسکے اور اُن واقعات کے اسباب ونتائج کو بیان کرسکے جن کے مجموعہ کو تاریخ کہتے ہیں۔ تاریخ کے دیکھنے سے ایسے تمام واقعات مسلسل اور مرتب صورت میں نظر کے سامنے آجاتے ہیں جن کے مطالعہ سے قوموں کے عروج وزوال کا حل معلوم ہوجائے۔ یعنی دنیا میں کسی قوم کے وجود کا آغاز کیونکر ہوا، اُس نے ترقی کے منازل کس طرح طے کئے، مدارج عروج سے گذر کر اُس کا زوال کیونکر ہوا۔ اگر نہیں تو وہ کون سے ذرائع اختیار کئے گئے جنھوں نے اس کو مناظر فنا سے دور رکھا۔ زندگی کے ارتقا وانحطاط پذیر زمانوں میں اُس قوم کی معاشرت کیا تھی، اخلاق کیسا تھا، مذہب وسیاسیات کی کیا حالت تھی، اُن کے اشغال واہتمامات زندگی کیا تھے، علوم وفنون میں کیا کیا کامیابیاں حاصل کیں اجتماعی زندگی میں اُن کے حقوق وفرائض کیا تھے۔ بغرض ہر ایک جزو پر مفصل بحث ومذاکرہ تاریخ کا ضروری

مضمر ہوگا۔ ایک تاریخ لکھنے والے کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ واقعات کو مسلسل حالت میں اُن کے اسباب و علل کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ لیکن ایک فلسفی مؤرخ اپنی تاریخ کی تیاری کے سلسلہ میں واقعات و اسباب کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگا کر تاریخ صحیح کے دُرِّ آبدار سے دنیا کی نگاہوں کو دعوت تماشا دیتا ہے۔ اس قسم کی تاریخ کی بنیاد بحیثیت فن کے کس نے رکھی؟ اس کے متعلق یقینی طور پر فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ قدیم مصریوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اس کی اہمیت کو سمجھا۔ اس کے ثبوت کے لئے علماء تاریخ نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں جو مصریوں کے چند آثار سے مستنبط ہیں۔

اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی کتاب جس میں واقعات ترتیب وار دکھائے گئے ہیں تورات ہے بعض بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے کسی حد تک ایسی فلسفیانہ تاریخ سینٹ آگسٹائن ایک رومی پادری نے لکھی جس میں واقعات سنہ ۴۱۳ء سے ۴۲۶ء تک ملتے ہیں۔ پانچویں صدی میں اور بھی بہت سے علماء نے ایسی تاریخ لکھنے کی سعی کی۔ لیکن بحیثیت فن کے اصول و ضوابط کو مدنظر رکھکر ہیروڈوٹس ایک مشہور مؤرخ و سیاح نے جس کو ابتک دنیا "ابوالتاریخ" کے لقب سے یاد کرتی ہے ایک مکمل تاریخ لکھی۔

اُسی زمانہ میں طوتیسیدیس و زینوفن وغیرہ بھی پیدا ہوئے بسنہ [illegible] قبل مسیح میں ایک فارسی طبیب نے بھی اسی وضع کی ایران قدیم کی تاریخ مرتب کی جس کا نام تسیاس تھا۔ ان کے بعد جس قدر بھی مؤرخ پیدا ہوئے وہ اُنھی کے نقش قدم پر چلتے رہے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں بھی ایسے مؤرخ پیدا ہوئے جنھوں نے اور زیادہ محققانہ طرز اختیار کیا۔ مثلاً ۱۷۴۸ء میں مان تسکیو ۱۸۳۵ء میں شلیگل ۱۸۳۷ء میں ہیگل ۱۸۴۲ء میں کامٹی، اور ۱۸۵۷ء میں بکل وغیرہ پیدا ہوئے عرب مورخین میں ابن خلکان، ابن اثیر، ابوریحان البیرونی. علامہ یاقوت، مسعودی، ابن جریر طبری، ابوالفدا مقریزی، اور ابن خلدون جیسے مؤرخ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

مغرب کو ناز ہے کہ اُس نے تاریخ نویسی کا جدید فلسفیانہ اصول ایجاد کیا ہے لیکن فلسفۂ تاریخ کا بانی علامہ ابن خلدون تھا۔ اس حقیقت کو مصنف ترجمان فرنگ بھی تسلیم کرتے ہیں اور علامہ صدیو فرانسیسی نے بھی اپنی کتاب تمدن اسلام میں اس کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ عیسائیوں کی فاتحانہ شوکت کے آگے نہ صرف مسلمانوں کا مادی بلکہ اُن کا ذہنی تمدن بھی پسپا ہوتا جا رہا تھا، اُس وقت جبکہ اُن کا مغربی تمدن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر زمانہ کے نشیب و فراز دیکھتا ہوا منزل فنا کی طرف جا رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ بالکل معدوم ہو جاتا، اُس وقت اُس نے ایک ایسا شخص پیدا کیا جس کی بصیرت افروز قابلیت سے تمدن کی نشو و نما کا نیا قانون مرتب ہوا اور اس طرح ایک نئے علم فلسفۂ تمدن یا فلسفۂ تاریخ کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہ

عجیب غریب شخص ابن خلدون تھا جس کی ولادت ۱۳۳۲ء میں اشبیلیہ کے رہنے والے ایک خاندان میں بمقام تونس ہوئی۔ علامہ دعوے کے ساتھ اُٹھا تھا کہ وہ فلسفہ کی ایک نئی شاخ کی بنیاد ڈالے گا جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ آئی تھی۔ اُس نے اپنے اس جدید علم کے ذریعہ سے تاریخ کا ایک نیا راستہ تیار کیا کہ تمام تاریخی واقعات جس حد تک اپنے اسباب کی طرف منسوب کئے جاسکتے ہیں اور اصول و قوانین کے تحت میں لائے جاسکتے ہیں۔ اُن کو علم اور فلسفہ کا جز کہلانے کا مستحق ٹھہرایا اس طرح تاریخ کا خیال بحیثیت علم کے پیدا ہوگیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس فن کو محض تفاخر رفع عام اور نصیحت وتلقین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ علم زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے ماتحت ضرور ہے لیکن بجائے خود اس کا کام بجز واقعات کی تحقیق اور اُن میں علت ومعلول کا تعلق تلاش کرنے کے اور کچھ نہیں۔ یہ کام نقادانہ حیثیت سے بلاتعصب کرنے کا ہے۔

جب مسلمانوں کا علمی خزانہ مغرب کے ہاتھوں میں پڑگیا، اُسی وقت سے مسلمانوں کے ہاتھ خالی ہوگئے اور اب وہ مغرب کے محتاج ہیں۔ بقول ٹی۔جی۔دوبوئر "عالم اسلام میں جس طرح ابن خلدون کا کوئی پیش رو نہ تھا، اُسی طرح اُسے کوئی جانشین بھی نصیب نہ ہوا۔ تاہم اُس کی تصانیف کا اثر مشرق میں دیرپا ضرور تھا۔"

فی الحقیقت دنیا کی فلسفیانہ تاریخ لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، نہ ہر شخص اس میدان کا مرد ہوسکتا ہے لیکن فن تاریخ کے مواد کے اس قدر افراط پر بھی خاص اس فن پر دنیا کی معلومات بہت کچھ ناقص ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کی تحقیق بمقابلہ پہلے کے اب وسیع پیمانہ پر کی جائے تاکہ یہ فن بھی دوسرے فنون کی طرح اور زیادہ مکمل ہوتا جائے جس سے علوم میں ایک تناسب قائم ہوسکے۔ کیونکہ دنیا اپنی ترقی کے لئے پچھلے نقوش کی بہت کچھ محتاج ہے۔

پردیس میں
(چینی شاعری۔ تائی۔ پو)

میں پردیس میں تھا،
میرے خیمے کے سامنے چاند نے چمکتی ہوئی سفید چاندنی بچھادی تھی
سمجھا کہ شاید صبح کا سفیدہ ہے جس کی چمک دیکھ رہا ہوں
غور سے دیکھا، نہیں یہ تو چاند ہے چاند، میرا چاند۔ میں نے آنکھیں نیچی کرلیں۔
وہ جسے کسی نے میرے وطن سے، مجھ سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ دیا۔

(دین ودنیا)

خودنوشت حالات

(نواب حیدر یار جنگ بہادر مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی)

۱۵ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ کو اکاسٹھی برس کا میرا سن ہوا لکھنؤ میں پرانا حیدر گنج لکڑ منڈی جائے ولادت ہے۔
منشی مینڈو لال زار میرے والد کے دوستوں میں میرے ہم محلہ تھے اُن سے فارسی پڑھی۔ ملا طاہر مرنی سے صرف و نحو عربی کی حاصل کی جناب خاتمۃ الدین سے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں سنہ ۱۳۰۱ھ میں تشریح الافلاک پر میرا حاشیہ کلکتہ کے مطبع اُردو گائیڈ اخبار سے شائع ہوا جسے میں نے مسٹر کرافٹ وزیر تعلیمات کے نام سے معنون کیا تھا۔ اسی زمانہ میں مدرسۂ شاہ آودھ میں شاہزادوں کی تعلیم پر میرا تقرر ہوا۔ تعریب الاطفال میں نے انھیں طلبہ کے لئے تصنیف کی اسے دیکھکر صدہا کتابیں اسی طرز کی لوگوں نے تصنیف کرکے شائع کرنا شروع کیں۔ کلکتہ سے میں نے دکن میں آکر اسی طرز کی دو کتابیں مبنیات و معربات لکھیں جنھیں لوگ کرامات سمجھتے ہیں۔

نظام کالج میں تقرر ہونے کے بعد مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا ایک رکن میں بھی مقرر ہوا اور میری ہی تحریک سے اردو دیوان مرزا نوشہ کا بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سارے دیوان کی شرح لکھنا پڑی اس شرح کو دیکھ کر استاذ السلطان استاذ العلما آقا سید علی شوستری نے کہا کہ اُردو کے دیوان کی شرح لکھنا میری رائے میں اُس کے لئے سُبکی کا باعث ہوا اسے چاہیئے تھا کہ عربی کے کسی دیوان کی شرح لکھتا۔

یہ قول مجھ تک پہنچا اور میں نے امرؤ القیس کے دیوان کی بھی شرح اُردو میں لکھ ڈالی۔ یہ عرب کا ملک الشعرا اسلام سے پہلے کا شاعر ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شرحیں لکھ کر میں نے اپنی زبان کو بڑی رونق دی۔

حیدرآباد کے مدرسہ دارالعلوم میں عربی و فارسی پڑھنے والے طلبہ ہمیشہ سے پنجاب یونیورسٹی میں فاضل و عالم کے امتحانات دیا کرتے تھے۔ پنجاب سے مدرسہ میں سوالات آجایا کرتے تھے۔ لارڈ کرزن کے عہد فرمانروائی میں ملک ہند کی تعلیمات کا دورہ کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ پنجاب

یونیورسٹی سے حیدرآباد کا تعلق نہ رہا۔ یہاں یہ خبر پہنچی کہ امتحان دینے کا زمانہ بہت قریب تھا۔ طلبہ سال بھر کی محنت کا صلہ پانے کے مستحق ہو چکے تھے۔ میں نظام کالج میں تھا۔ مجھے دار العلوم کے مدرسے سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ برسوں سے ہر سال وہاں کے اعلیٰ درجوں کا امتحان لینا میرے سپرد ہی ہوتا تھا۔ اس سال بھی میں امتحان لے چکا تھا اور اسی امتحان کے بموجب جو طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے فاضل و عالم کے امتحان میں شریک ہونے والے تھے اُن کا انتخاب بھی ہو چکا تھا۔ مجھے ان طلبہ کی مایوسی پر نہایت افسوس ہوا۔ میں نے نظام کالج میں ڈاکٹر اگھورناتھ سے یہ ذکر کیا کہ ہم لوگ ان طلبہ کا امتحان یونیورسٹی سے بہتر لے سکتے ہیں اور خطابات بھی دے سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر اگھورناتھ، ڈاکٹر دینشی کانتا، محمد عبد المنعم صاحب ایک اعلیٰ درجے کے طالب العلم اس بات پر آمادہ ہو گئے۔ حیدرآباد کے مشاہیر علما کا ایک بورڈ مقرر کر کے امتحان کا اشتہار دے دیا۔ سوالات مرتب ہوئے اور ہم لوگوں کی نگرانی میں چھاپے گئے۔ غرضکہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان سے بڑھکر یہ امتحان ہوا اور ان طلبہ کو آج تک اوس امتحان پر فخر و ناز ہے۔

اس سے پیشتر مدراس یونیورسٹی میں فارسی و عربی کے امتحانات اور "دبیر" و "افضل العلما" کے خطابات وغیرہ نہ تھے یہ بھی میری کوشش سے جاری ہوئے ہیں۔

جاری تو ہو گئے لیکن کئی برس کے بعد رجسٹرار کا ایک مراسلہ میرے نام پر آیا کہ فلاں تاریخ سینیٹ ہوس میں مجلس شوریٰ میں آکر اس بات کا فیصلہ کر دینا چاہیئے کہ "چھ برس سے برابر فارسی و عربی کے امتحانات کا نصاب "دبیر" و "افضل العلما" کے طلبہ کے لئے یونیورسٹی کے کلنڈر میں شائع ہو رہا ہے لیکن آج تک کسی نے شریک امتحان ہونے کی درخواست نہیں دی۔

حیدرآباد میں عربی و فارسی کا جس قدر چرچا تھا اُس سے میں واقف تھا۔ درخواست نہ دینے کی وجہ بھی فوراً میں سمجھ گیا۔ وہ یہ کہ مدراس والوں نے عربی و فارسی کے طلبہ کے لئے "افضل العلما" اور "دبیر" وغیرہ کے خطابات تو تجویز کئے مگر شرط یہ لگا دی کہ انگریزی میں میٹرک پاس ہونا ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔ اور یہ شرط پنجاب میں نہ تھی۔ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ حقیقت امر کو مجلس کنگاش کے آگے عرض کر کے میٹرک کی شرط کو موقوف کرانا چاہیئے۔

مدراس یونیورسٹی کی مجلس نصاب کے صدر اس زمانہ میں سر عبد الرحیم صاحب تھے۔ مجلس شوریٰ ہونے سے دو دن پیشتر میں جناب ممدوح کی کوٹھی پر گیا۔ میں نے پوچھا کہ جناب نے کیا فیصلہ اس امر کا تجویز فرمایا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ عربی و فارسی کے امتحان میں جب کوئی آتا ہی نہیں تو سوا موقوف کر دینے کے اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے؟ اب میں نے عرض کیا کہ حیدرآباد میں صدرا، شرح سلم، حماسہ، معلقات، و اسرار البلاغہ، دُرّہ نادرہ

ذعرفی و ظہوری و اخلاق ناصری و جلالی وغیرہ کے درس جا بجا ہو رہے ہیں، میٹرک تک انگریزی کی شرط انھیں امتحان میں آسانے کو مانع ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں یہ شرط نہ تھی ہر سال سیکڑوں طلبہ فاضل و عالم و مولوی و منشی کے امتحانوں میں کامیاب ہوا کرتے تھے۔"

اسی طرح شفیق مکرم مولوی بذل اللہ خاں صاحب کے پاس بھی گیا، یہ مدراس کارپوریشن کے صدر مجلس نصاب کے رکن رکین تھے۔ کرم فرما نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب شاطر وغیرہ سے بھی اس باب میں گفتگو کی۔ ان سب صاحبوں نے یہی فرمایا کہ "خوب ہوا آپ نے پہلے سے ذکر کردیا ورنہ عربی و فارسی کے امتحانات مدراس یونیورسٹی سے اٹھ گئے ہوتے"۔ دو دن بعد سینیٹ ہوس میں ارکان مجلس نصاب جمع ہوئے مسئلہ پیش ہوا میٹرک کی شرط بآسانی سے اُڑا گئی۔ اور میرے مجموعۂ اشعار کا پہلا حصہ "نظم طباطبائی" مدراس کے بی۔ اے ایف اے کے کورس میں داخل ہوا

اعلیحضرت غفران مکان کے جشن جوبلی کی تاریخ نواب فصاحت جنگ جلیل نے دو جلدوں میں لکھی تھی وہ تاریخ نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ کی دیوانی کے زمانہ میں پیشگاہ خسروی سے اس فرمان کے ساتھ بھیجی گئی کہ علی حیدر طباطبائی کو یہ تاریخ دیدی جائے کہ بنظر اصلاح دیکھیں۔

اس تاریخ دکن کے متعلق میں نے بڑا کام یہ کیا کہ حیدرآباد افیرز کی سب جلدیں اول سے آخر تک پڑھیں اور مضامین ضروری کا اضافہ کیا۔ سنتا ہوں کہ یہ تاریخ شائع ہونے والی ہے۔ ایک بڑا کلمہ میں کہتا ہوں لیکن باللہ العظیم بالکل صحیح ہے۔ یعنی فارسی و اردو والے عرب کے عروض کو نہ سمجھے تھے اس فن کو اُلجھا کے رکھ دیا تھا یہی حال قافیہ کا بھی تھا میں نے تلخیص عروض و قافیہ لکھکر تمام گتھیوں کو سلجھا دیا اور حشو و زوائد کو چھانٹ دیا۔

۱۳۳۵ھ ہجری میں شاہزادگان والا جاہ دام اقبالہما کی تعلیم ادب پر میرا تقرر ہوا۔ اس خدمت گزاری کا شرف چار برس مجھکو حاصل رہا۔

۱۳۴۶ھ میں دارالترجمہ کی اصلاح زبان و طرز بیان کی خدمت بھی مجھ سے متعلق ہوئی تین سال یہاں رہکر کیرسن کے سبب سے وظیفہ ہوگیا۔ وظیفہ کے چند ماہ کے بعد اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ نے از سر نو دارالترجمہ میں میرا تقرر فرمایا چھ برس تک میں نے پھر ترجموں کی اصلاح کا بھی کام کیا اور تاریخ طبری کی ایک جلد کا ترجمہ بھی کیا۔ صلہ جس کا مجھکو تنخواہ کے علاوہ عنایت ہوا اور یہ جلد دارالطبع میں چھپ گئی۔

گو اب میں وظیفہ لیکر دارالترجمہ سے الگ ہوں مگر دارالترجمہ نے مجھے نہیں چھوڑا اصطلاحات علمی کی کمیٹیوں میں معذاً مجھے جانا پڑتا ہے۔ سرکار فیس دیتی ہے اور مجھ سے کام لیتی ہے۔

قضیۂ منچوریا

منچوریا | منچوریا کا ملک چین خاص، منگولیا، روس اور کوریا (جاپان) کے درمیان واقع ہے اور سیاسی حیثیت سے ہمیشہ چین کا صوبہ رہا ہے۔ اس کے لغوی معنی "سرزمین مانچو" (قوم مانچو کے ملک) کے ہیں۔ چین میں اس ملک کو "تین مشرقی صوبے" کہتے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) ہیلنگ کیانگ (۲) کیرین، اور (۳) لیاؤننگ یا فنگٹین۔

منچوریا کا رقبہ اڑتیس لاکھ مربع میل یعنی جرمنی اور فرانس دونوں کے مجموعی رقبہ کے برابر ہے۔ اور آبادی تین کرور ہے جن میں دو کرور اسی لاکھ تو چینی اور مانچو ہیں (یہ دونوں قومیں باہم جذب ہو گئی ہیں) آٹھ لاکھ اہل کوریا (جاپانی رعایا) ہیں، ڈیڑھ لاکھ سفید روسی۔ دو لاکھ تیس ہزار جاپانی اور بقیہ منگول ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ملک کی آبادی صرف ایک کرور اسی لاکھ تھی لیکن گذشتہ بیس سال کے اندر چینی تارکان وطن کی کثرت آمد سے اسکی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے۔ چینی آبادی میں ہر سال تقریباً دس لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

چین کو منچوریا سے کم از کم چار اہم فائدے پہونچتے ہیں:۔

(۱) اضافہ آبادی کے لئے یہ ایک عمدہ میدان ہے، (۲) فصل کے موقعوں پر منچوریا میں چینی بیکار روزگار پاتے ہیں (۳) چین کو منچوریا سے سامان خوراک و اجناس خام ملتے ہیں اور (۴) چین کیلئے منچوریا اولین خط استحکامات کے بمنزلہ ہے۔

منچوریا کا تمام کوہستانی علاقہ ہمالیہ کی طرح سرسبز ہے۔ جہاں اعلیٰ درجہ کی چوب عمارتی اور معدنیات خصوصاً کوئلہ پیدا ہوتا ہے، لوہا، سونا اور دیگر معدنیات بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ملک کی زمین اس قدر سرسبز ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء میں تقریباً ایک ارب تیس کرور پاؤنڈ کی زرعی پیداوار ہوئی تھی۔

سیاسی رقابتیں | جزائر برطانیہ کی طرح جاپان کی سلطنت بھی مجمع الجزائر سلطنت ہے، اس کا رقبہ محدود اور آبادی روز افزوں ہے۔ برطانیہ کی طرح جاپان بھی ایک تجارتی اور صنعتی ملک ہے۔ چنانچہ وہ مندرجہ ذیل باتوں کے لئے دیگر ممالک کا محتاج ہے:۔

(۱) آبادی کے لئے اجناس خوراک (۲) صنعت و حرفت کیلئے اجناس خام (۳) زائد آبادی کیلئے میدان استعمار

چونکہ جاپان امپریلزم میں دول یورپ کا شاگرد ہے، اس لئے کچھ عرصہ سے اس نے حصول اغراض و مقاصد

سکے لئے ہمسایہ کی کمزور سلطنتوں پر ہاتھ صاف شروع کر دیا، اور پہلے ملک کوریا پر قبضہ کرکے اپنی ہوس استعمار پوری کی، اس کے بعد کوریا کے ہمسایہ ملک منچوریا پر دست درازی شروع کر دی۔

پچھلی صدی میں ملک منچوریا مختلف سلطنتوں کی متضاد حکمت عملیوں کا جولانگاہ بنا رہا اور چونکہ اس ملک کی صنعتی ترقی کے امکانات بہت وسیع ہیں اس لئے اس پر مختلف شہنشاہیت پرست سلطنتوں کا دانت رہنے لگا۔

۱۸۹۴ء و ۱۸۹۵ء کی جنگ چین و جاپان میں جب چین کو شکست ہوئی تو معاہدہ شیمونوسکی مورخہ ۱۸۹۵ء کی رو سے چین کو مجبور ہو کر جزیرہ نمائے لیاؤتنگ کا پٹہ جاپان کو دینا پڑا۔ لیکن بعد میں روس، جرمنی اور فرانس نے جاپان پر اس قدر سیاسی دباؤ ڈالا کہ بالآخر اسے چینی علاقہ واپس کرنا پڑا۔ روس نے تاوان جنگ ادا کرنے میں بھی چین کو اس قدر مدد دی کہ چین نے اپنی احسان مندی کے اظہار میں روس کو چیتا اور ولاڈی وسٹک کے درمیان سیدھی ریلوے لائن تعمیر کرنے کی اجازت دیدی جو منچوریا سے گذرتی ہے۔ روسی سرمایہ سے تعمیر شدہ مشرقی چینی ریلوے کے وجود میں آتے ہی روس کو اس رقبے میں اقتدار فرمانروائی حاصل ہوگیا۔ ۱۸۹۸ء میں چین نے پچیس ۲۵ سال کے لئے روس کو وہی علاقہ پٹہ پر دیدیا جو جاپان نے دباؤ میں آکر واپس کیا تھا اور چینی مشرقی ریلوے میں پورٹ آرتھر تک توسیع کی اجازت بھی دیدی۔ ۱۹۰۰ء میں باکسروں کی بغاوت کے زمانہ میں روس نے اپنی رعایا کی حفاظت کے بہانہ سے منچوریا پر فوجی قبضہ کرلیا اور دول یورپ کے احتجاج کے باوجود اپنی فوجیں نہ ہٹائیں۔ روس کی اس جارحانہ کارروائی سے کوریا میں جاپان کے مفادات کو خطرہ محسوس ہونے لگا جس کی وجہ سے ۱۹۰۴ء میں جنگ روس و جاپان چھڑ گئی۔ چین اس جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ ۱۹۰۵ء میں معاہدہ پورٹسمتھ کی رو سے روس نے مجبور ہو کر جنوبی منچوریا کے متعلق اپنے تمام سیاسی حقوق جاپان کے حق میں منتقل کر دیے، انھیں میں جنوبی منچوریا میں ریلوے لائن چلانے کا بھی حق شامل تھا۔ اس طرح منچوریا کا ملک دو حلقہ ہائے اثر میں منقسم ہوگیا شمالی علاقہ روس کا اور جنوبی علاقہ جاپان کا تسلیم کیا گیا اور چین کو مجبوراً اس ذلت کو خاموشی سے برداشت کرنا پڑا۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد جب دولت روسیہ اُن تمام حقوق سے دست بردار ہوگئی جو اسے شمالی منچوریا میں حاصل تھے تو چین نے ۱۹۲۲ء تک از سر نو منچوریا کے روسی علاقہ پر تمام و کمال قبضہ کرلیا، اور معاہدہ چین و روس مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کی رو سے روس نے بھی منچوریا پر چین کا قبضہ تسلیم کرلیا جس کی بدولت چینی مشرقی ریلوے ایک خالص تجارتی ادارہ بن گیا۔

جاپان کی دست درازیاں | لیکن جاپان نے چین پر اپنی دست درازیوں کا سلسلہ جاری رکھا حتی کہ جنگ عظیم

کے زمانہ میں جبکہ تمام دول عظام لڑائی میں مصروف تھے جاپان نے اپنے مشہور اکیس مطالبات چین
کے سامنے پیش کر دیئے۔ اور چونکہ معاہدہ پورٹسمتھ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے چین کی منظوری کے بغیر ہوا
تھا، اس لئے جاپان نے ۱۹۱۵ء میں چین پر دباؤ ڈال کر معاہدہ پیکن کیا، جس کی رو سے جزیرہ نمائے
کوانتنگ پر از روئے پٹہ جاپان کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اور چینی مشرقی ریلوے کا جنوبی حصہ بھی چانگچون تک
جاپان کو مل گیا۔ علاوہ ازیں چین نے جاپان کو پندرہ سال تک اس بات کا بھی اجارہ دیدیا کہ وہ آنتنگ
اور مکڈن کے درمیان فوجی ریلوے لائن کو ترقی دے۔ جاپان نے ان بیش قیمت کوئلہ کی کانوں پر بھی
قبضہ کر لیا جو فوشن اور ینتائی میں ہیں۔

الغرض منچوریا میں اس قدر وسیع حقوق حاصل کرنے کے بعد جاپان نے ۱۹۱۰ء میں ملک کوریا
کا الحاق کر لیا۔ اور ۱۹۱۵ء میں جاپان نے چین سے اپنے اکیس مطالبات منوالئے لیکن جنگ عظیم
کے بعد ۲۲-۱۹۲۱ء میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، اطالیہ، بلجیم، ہالینڈ، پرتگال، وغیرہ نے ملکر جاپان پر دباؤ
ڈالا اور بہت سے ٹھیکے جو چین سے جبراً حاصل کئے گئے تھے واپس کرا دیئے، اور نو سلطنتوں کے درمیان
جن میں مندرجہ بالا سلطنتوں کے علاوہ چین اور جاپان بھی داخل تھے ایک معاہدہ ہوا جس میں چین کے
استحکام اور اس کے اقتدار فرمانروائی کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا۔ اس میں منچوریا بھی داخل تھا۔

لیکن چونکہ یہ محض کاغذی کارروائی تھی اور معاہدہ کی تعمیل کرانے کے لئے دول متحدہ کسی قسم کی
عملی کارروائی کرنے کے لئے تیار نہ تھے، اس لئے جاپان رقبہ پٹہ داری پر بدستور حکومت کرتا رہا۔ جنوبی
منچوریا ریلوے کی آڑ میں جاپان نے تمام ریلویجاتی رقبہ میں جس میں مکڈن اور چانگچون جیسے بڑے بڑے
شہر اور وسیع رقبے بھی شامل تھے، اپنی حکومت قائم کر لی۔ ان علاقوں میں پولیس، ٹیکس، تعلیمات، امور
رفاہ عام وغیرہ کے تمام کام جاپان کے زیر انتظام ہونے لگے۔ جاپان نے اپنی فوجیں بھی منچوریا کے
مختلف حصص میں متسلط کر دیں اور کوانتنگ کے علاقہ پٹہ داری میں اس کی باقاعدہ فوج رہنے لگی۔
ریلویجاتی رقبوں میں اس نے ریلوے گارڈ قائم کر لیا جو درحقیقت ایک باقاعدہ بری فوج ہے۔ علاوہ ازیں
تمام ملک میں جاپانی قنصلخانوں کی حفاظت کے بہانہ جاپانی پولیس تعینات کر دی گئی ہے۔ غرض جاپان
ملک منچوریا کو اپنا ایک مفتوحہ صوبہ سمجھنے لگا۔

بیداری چین کے زمانہ میں جب چین کی کومنتانگ پارٹی (حزب الاحرار) وجود میں آئی اور اس
نے "بازیافت حقوق" کے لئے جدوجہد کرنا شروع کر دیا تو جاپان نے محسوس کیا کہ ملک منچوریا اس کے ہاتھ
سے نکل جائیگا اس لئے وہ اپنی بری و بحری طاقت سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور ۱۹۲۷ء میں بیرن تنا

کی جاپانی گورنمنٹ نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وہ ہر طرح سے منچوریا میں امن وامان قائم رکھنے کا انتظام کرے گی۔ اور اگر پیکن یا ٹین ٹسین کی سمت میں اس قسم کی کوئی بات ہوئی جس سے منچوریا کے امن وامان کو خطرہ کا اندیشہ ہوا تو جاپان انسدادی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔

خانہ جنگی کی حالت میں جب بعض شکست خوردہ چینی فوجیں منچوریا کی طرف پسپا ہونے لگیں تو جاپان نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ کسی چینی فوج کو منچوریا میں آنے نہ دیگا۔ اس اعلان سے جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ملک منچوریا جاپان کی ملکیت ہے معاملہ حد کو پہونچ گیا۔ اور جاپان چینیوں کی بیخ کنی پر تل گیا۔ ۱۸ و ۱۹ ستمبر ۳۱ء کی درمیانی رات کو ان جاپانی سپاہیوں نے جو جنوبی منچوریا ریلوے کے رقبہ میں تعینات تھے اچانک ان چینی سپاہیوں پر حملہ کر دیا جو بمقام مکڈن تعینات تھے۔ اور ہفتہ عشرہ کے اندر صوبجاتی فوجوں کے سوائے تمام چینی فوجوں کو چین کی دیوار اعظم کے جنوب میں نکال دیا۔ اور اس طرح جاپان تمام ملک پر قابض ہوگیا۔ تمام شہر مکڈن چینیوں سے خالی ہوگیا۔ اور جاپانی کرنل ڈوہی ہارا نے شہر کے جملہ انتظامات جاپانی حکام کے ہاتھ میں دیدیئے۔ اس کے بعد یعنی ۲۰ ستمبر ۳۱ء سے جنوری ۳۲ء تک جاپانیوں نے ملک کے مختلف صوبوں میں ایسی حکومتیں قائم کر دیں جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں تھیں۔ اور بالآخر ۱۰ فروری ۳۲ء کو منچوریا اور جہول کو ملا کر ایک خود ساختہ پیدائشی ریاست سلف گورنمنٹ بورڈ کے ماتحت رکھکر تمام ملک کی آزادی وخود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد جاپان نے یہ چال چلی کہ چین کے معزول شہنشاہ ہنری پوائی کو جو اپنی معزولی کے زمانہ سے ابتک جاپان کی حفاظت میں تھا جدید خود مختار سلطنت کا نام نہاد بادشاہ بنا کر ۹ مارچ کو اس کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور نام نہاد گورنمنٹ منچوریا نے جاپان سے ایک معاہدہ کر لیا جس کے بموجب دولت جاپان تمام منچوریا کی عملاً مالک ہوگئی۔ ملک میں برائے نام مانچو وزارت قائم ہے لیکن فی الحقیقت تمام بڑے بڑے عہدے اور نظم ونسق جاپانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جاپانیوں نے چین کی بڑی فوج کو بھی مار کر دیوار اعظم کے جنوب میں بھگا دیا۔ جس سے جنوبی اور شمالی صوبجات کی چینی فوجوں کا سلسلۂ تعلق منقطع ہوگیا اور اب ان فوجوں کے منتشر شدہ سپاہیوں کی تعداد کثیر جدید سلطنت کے مختلف مقامات میں جاپانیوں سے قزاقی جنگ (گوریلا وار) میں مصروف ہے۔ اور جاپان ان لوگوں کو قزاق بتا کر قتل کر رہا ہے۔

مجلس اقوام سے فریاد | ماہ ستمبر ۳۱ء میں بمقام جنیوا مجلس اقوام کی اسمبلی کا بارہواں سیشن ہو رہا تھا کہ ۲۱ ستمبر کو اپنی گورنمنٹ کی ہدایت سے چینی نمائندہ نے زیر دفعہ ۱۱ میثاق مجلس اقوام سکریٹری جنرل سے درخواست کی کہ "اس نزاع کی روک تھام کے لئے فوری تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ اقوام کا امن وامان خطرہ میں نہ پڑ جائے۔" مجلس اقوام کے لئے یہ معاملہ سخت نازک تھا کیونکہ چین وجاپان دونوں مجلس کے ممبر تھے اور دونوں میثاق

لیگ اور معاہدہ کیلاگ و برآیان پر دستخط کر چکے تھے، جاپان ایک درجہ اول کی طاقت تھی، مجلس اقوام کی ممبر تھی مگر وہی مجلس اقوام کے اصول کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔ اس کے علاوہ جن طاقتوں کا مجلس اقوام کی کونسل پر اثر ہے وہ اپنے کسی نہ کسی مفاد کے سلسلہ میں چین کی رہین منت نہیں، اور چین کی تحریک بازیافت حقوق (Rights Recovery) کا براہ راست اثر ان کے مفاد پر پڑتا تھا۔ فرانس کو اپنے مقبوضات ہند چینی کی فکر تھی اور وہ ہمیشہ جاپان کا لحاظ و پاس کیا کرتا تھا، اور تنازعہ چین و جاپان کے دوران میں بھی فرانس نے جاپان کو اسلحہ سے امداد دی تھی۔ دوسری طرف انگلستان اصول کی اس قدر پروا نہیں کرتا جس قدر کہ اپنے مطلب کی بات دیکھتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں عظیم طاقتوں کی سہل انکاری دیکھتے ہوئے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو کونسل نے ایک ریزولیوشن پاس کر کے فریقین کو اپنے دوستانہ تعلقات بحال کرنیکی ہدایت کی، اور جاپان کو حکم دیا کہ وہ اپنی سپاہ ریلوے رقبہ کے حدود سے ہٹالے۔ مگر اس کام کے لئے کوئی مدت معین نہ کی لیکن جاپان نے مجلس اقوام کی کچھ پروا نہ کی اور ۱۳۔ اکتوبر تک جبکہ مجلس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا اُس نے منچوریا میں چینی اقتدار حکومت کی تمام و کمال بیخکنی کر کے تحریک ہوم رول کو خوب تقویت دی۔

۱۰۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب لیگ کی کونسل کا اجلاس بمقام پیرس منعقد ہوا تو قضیۂ منچوریا کی تحقیقات کے لئے لارڈ لٹن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا جو پانچ ممبروں پر مشتمل تھا، لیکن جب تک کمیشن موقع پر پہونچکر اپنا کام شروع کرے جاپان کی افتراق انگیزانہ تدابیر بار آور ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ۱۸ فروری ۱۹۳۲ء کو منچوریا کے سلف گورنمنٹ بورڈ نے زیر سایہ جاپان منچوریا کی آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد ۲۹۔ فروری ۱۹۳۲ء کو لٹن کمیشن ٹوکیو پہونچا لیکن اس سے پیشتر ہی شنگھائی میں جنگ شروع ہو گئی اور چین کی حکومت نانکن مجلس اقوام سے اپیل پر اپیل کرتی رہی لیکن اُسکی کوئی پروا نہ ہوئی۔

بہرحال لٹن کمیشن نے جس طرح بنا اپنا کام ختم کر کے اپنی رپورٹ پیش کر دی جس کا لب لباب یہ ہے:-

(۱) چین کے زیر سیادت منچوریا میں ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے۔

(۲) جاپانی فوجیں ملک سے ہٹالی جائیں۔

(۳) داخلی انتظامات کے لئے اسپشل پولیس رکھی جائے جو کسی غیر ملکی انسپکٹر جنرل کے ماتحت ہو۔

(۴) جاپان اور چین کے درمیان منچوریا اور جہول کے متعلق تین معاہدات کئے جائیں جن میں جاپانی مفادات کی حفاظت، منچوریا کی حفاظت اور تجارت باہمی کے احترام کے بارہ میں شرائط ہوں۔

چونکہ یہ تمام تجاویز جاپان کے خلاف ہیں اس لئے اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور مجلس اقوام

دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اگر مجلس اقوام اس مصیبت کے وقت چین کی حمایت کرنا چاہتی ہے لیکن اپنا فیصلہ منظور کرانے کے لئے اس کے ہاتھ پاؤں وہی طاقتیں ہیں جو اس کی ممبر ہیں۔ مگر یہ سلطنتیں خود امپریلسٹ ہیں اس لئے جاپان پران کا زیادہ زور نہیں پڑتا ہے۔ اور لیگ آف نیشن کے پاس خود کوئی طاقت نہیں ہے جس کو وہ ایسی حالت میں جاپان کے خلاف استعمال کر سکے۔ جاپان کے جارحانہ طرز عمل کے سامنے عدالت العالیہ ہیگ بھی بے بس ہے لیکن رائے عامہ کا جہانتک تعلق ہے وہ چین کے ساتھ ہے۔ مجلس اقوام نے بھی اپنے گذشتہ اجلاس میں یہ فتویٰ دیدیا ہے کہ اس معاملہ میں جاپان ہی کی زیادتی ہے۔ حال میں ایک تہدیدی نوٹ بھی جاپان کو پیش کیا گیا ہے جس کا جواب جاپان نے ہنوز کچھ نہ دیا۔

نوٹ مضمون ہذا لکھنے کے بعد مشرق اقصیٰ کے واقعات یہاں تک پہونچ گئے ہیں کہ قضیہ منچوریا و جہول کے متعلق مجلس اقوام نے ایک کمیٹی مقرر کی جسمیں امپیریل سلطنتوں کے نمائندے شامل ہیں چنانچہ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوگئی ہے جسکا لب لباب یہ ہے:-

(۱) منچوریا اور جہول سلطنت چین کے اجزائے لاینفک ہیں جن پر چین کا اقتدار فرمانروائی ہے لہٰذا سلطنت مانچو کو علٰحدہ سلطنت کی حیثیت سے تسلیم نہ کرنا چاہیئے۔

(۲) منچوریا میں ایسا نظم ونسق قائم کر دیا جائے کہ وہاں چین کا اقتدار فرمانروائی بحال رہے مگر ملک کو اندرونی طور پر وسیع خود مختاری حاصل ہو جائے۔

(۳) چونکہ زیادتی جاپان کی طرف سے ہوئی ہے اسلئے اس کو اپنی فوجیں ہٹا لینا چاہیئے۔

(۴) چین و جاپان کے درمیان ایسے جدید معاہدات کئے جائیں جنکی رو سے جاپان اور دیگر سلطنتوں کے حقوق و مفادات کا احترام ہو۔

مگر جاپان اپنی ضد سے باز آنیکو تیار نہیں ہے اس نے چینی کمانڈر متعینہ جہول کو الٹی میٹم دیدیا ہے کہ وہ فوراً شہر خالی کر دے ورنہ حملہ کر دیا جائیگا چینیوں نے اس دھمکی کی کوئی پرواہ نہیں کی اب جاپانی فوجیں جنکی تعداد ساٹھ ہزار ہے مع مکمل ہوائی جہازوں اور مسلح کاروں کے ڈیڑھ لاکھ چینی سپاہ پر حملہ کرنیکو تیار ہے۔ دو طرف جنگی اسپتالیں تیار ہو رہی ہیں چین کے وزیر اعظم نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ ہرگز جہول سے دست بردار نہ ہونگے خواہ دشمن انکے دار الحکومت نانکن پر قبضہ کر لے۔ ادھر حکومت جاپان نے اپنے نمائندہ متعینہ جنیوا کو ہدایت کر دی ہے کہ اگر مجلس مذکورہ انہیں سلطنتوں کی رپورٹ منظور کرے تو وہ مجلس اقوام سے علٰحدہ ہو جائے۔ الغرض اسوقت معاملہ سخت نازک صورت اختیار کر گیا ہے آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

(ا - ز)

بھکاری

(از مسٹر محمد اسحاق ایم اے)

رات کی تاریکی بڑھتی جارہی تھی، ایک بھکاری سردی سے بچنے اور رات بسر کرنے کے لئے گاؤں سے باہر راستے کے کنارے کوئی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی جس کو وہ اپنی لاٹھی کے سہارے کندھے پر لاد کر یہاں تک لایا تھا۔ اس نے گٹھڑی کو زمین پر رکھا اور اس پر سر رکھکر اپنے تھکن سے چور جسم کو فطرت کے سبز فرش پر دراز کر دیا۔ رات کی تاریکی میں اَن گنت تارے آسمان میں جگمگا رہے تھے۔ وہ ان کے نظارہ میں محو ہو گیا۔ راستے کے دونوں طرف سنسان جنگل تھا، پرندے درختوں کی شاخوں پر میٹھی نیند سو رہے تھے، بھکاری بھی بے خبر سو رہا تھا۔

وہ باپ ماں کی صورت تک سے واقف نہ تھا، نہ معلوم اس کو کس نے پرورش کیا تھا، لیکن بچپن ہی سے وہ پیٹ بھرنے کے لئے آوارہ گردی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دنیا اس پر نامہربان تھی۔ زندگی میں وہ صرف دکھ ہی سے واقف تھا۔ کتنی راتیں اس نے چوپال میں گذاری تھیں۔ بھیک مانگنے کی ذلت موت سے بدتر تھی۔ اس نے بارہا سوتے وقت یہ خواہش کی کہ الٰہی میری یہ نیند ابدی نیند ہو۔ جو کوئی بھی دیکھتا وہی اس سے نفرت کرتا اور شبہ کی نظر سے دیکھتا۔ ہر شخص اس سے بگڑ چلتا۔ لڑکے اسے دیکھکر بھاگ جاتے۔ اس کے میلے کچیلے اور پھٹے کپڑے دیکھکر کتے بھی اس کے پیچھے دوڑتے تھے۔ پھر بھی دنیا میں اسے کسی سے عداوت نہ تھی۔ وہ دنیاوی آلام کا خوگر ہو گیا تھا اس لئے اس کی فطرت میں سکون کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔

وہ بے خبر سو رہا تھا کہ یکایک گھنٹی کی آواز اس کے کان میں آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، ایک تیز روشنی اس کی طرف آرہی تھی اس نے دیکھا کہ ایک گھوڑا بھاری گاڑی کو کھینچتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے۔ گنگناہٹ کی آواز میں گیت گاتا ہوا ایک شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے گھوڑے کو چابک سے مارتے ہوئے کہا "اُٹھ... اُٹھ..."

گھوڑا گاڑی کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھینچتے کھینچتے وہ دو تین مرتبہ رکا اور زمین پر گھٹنوں تک
زور لگایا، پھر اٹھا، آخر اس نے اس قدر زور لگایا کہ اس کا سارا جسم پسینہ میں تر ہوگیا اور وہ بے دم ہوکر
ایک طرف کو جھک گیا اور گاڑی بھی رک گئی۔

گاڑی بان نے پہئے کو کندھے کا سہارا لگاتے ہوئے پھر زور سے ہانکا:

"چل...... چل......... آگے.......... آگے بڑھ......"

مگر گھوڑے کی جان توڑ کوشش سے بھی گاڑی نہ ہلی

"ہٹ!...... ہٹ...... آگے ہٹ!"

گھوڑا چاروں پاؤں پھیلا کر اور نتھنے پھلا کر جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ اپنے دونوں سموں سے
زمین پکڑے ہوئے تھا تاکہ بھاری بوجھ کی کوشش سے وہ پیچھے نہ ہٹ جائے

یکایک گاڑیبان کی نظر بھکاری پر پڑی اور اس نے چلا کر کہا

"بھائی ذرا مدد کرو، جانور ہلنا ہی نہیں چاہتا، ذرا اٹھکر سہارا دینا۔"

بھکاری اٹھ کھڑا ہوا اور گاڑی بان کے ساتھ گھوڑے کو ہانکنے لگا۔ مگر سب کوشش بیکار ہوئی۔

گھوڑے کی تکلیف دیکھکر بھکاری نے کہا

"بیچارے کو ذرا دم لے لینے دو۔ بوجھ بھی بہت بھاری ہے۔"

"بالکل نہیں۔ یہ بڑا بدمعاش ہے۔ اگر آج گاڑی کو نہ کھینچا تو کل یہ پہاڑی راستہ پر بھی نہیں چڑھیگا۔
بھائی تم ذرا ایک پتھر لاکر پہیہ کے پیچھے روک لگا دو۔ پھر ہم دونوں ملکر اسے چلا ہی لیں گے......"

بھکاری ایک پتھر اٹھا لایا۔

گاڑی بان نے کہا "میں پہیہ پر ہوں، چابک وہاں ہے۔ چابک لیکر اسے اچھی طرح مارو، کھال
ادھیڑ دو، تب یہ ٹھیک ہوگا۔"

چابک کی مار کھا کر گھوڑے نے پھر ایک مرتبہ جان توڑ کوشش کی۔ سموں کی رگڑ سے پتھر سے
چنگاریاں اٹھنے لگیں۔

"بہت اچھا! بہت خوب!"

گھوڑے نے جب خدا کی کے ساتھ ایک زور کے جھٹکے سے گاڑی کھینچی تو گاڑیبان پہیہ کے
نیچے سے پتھر ہٹانے لگا مگر اس کا پیر پھسل گیا، اور اس کے ساتھ ہی گاڑی کے بوجھ نے گھوڑے کو پیچھے
دھکیل دیا۔ ایک دردناک چیخ کے ساتھ گاڑیبان زمین پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ ہوگئیں۔ اور اسکی

کتنی مٹی میں گڑ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی شکن پڑ گئی۔ گاڑی بوجھ کے ساتھ کہیں اس پر دھنس جائے اس ڈر سے وہ پہیہ کو انتہائی زور کے ساتھ آگے کو ڈھکیل رہا تھا۔

گاڑی بان نے چلا کر کہا:۔

"آگے ہانکو، آگے ہانکو، میں پس گیا"

بھکاری نے بغیر دیکھے اندازہ سے سمجھ لیا کہ کیا ہو گیا۔ اس نے چابک سے گھوڑے کی کھال ادھیڑ دی۔ گھوڑا دوزانو ہو کر ایک طرف کو جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی بھی جھک گئی اور زمین پر گر پڑا۔ لالٹین بھی گر کر ٹوٹ گئی۔ اب تاریکی میں گاڑی بان کی آواز اور گھوڑے کے ہانپنے کی آواز کے سوائے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

"اٹھ! ...... اٹھ! ......"

بھکاری جب کسی طرح گھوڑے کو نہ اٹھا سکا تو جلدی سے گاڑی بان کی مدد کو دوڑا۔ لیکن گاڑی بان اس وقت تک پہیہ میں پھنس گیا تھا۔

ایک غیر معمولی انسانی طاقت کی زور سے اس نے پہیہ کو اپنے بدن سے دو ایک انچ دور ہٹا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ کے پھسلنے سے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی اور تھوڑی سی قوت کی بھی کمی ہوتی تو وہ بھاری گاڑی کے نیچے دب کر پس جاتا۔ وہ خود بھی یہ سمجھ رہا تھا۔ بھکاری کو آتے دیکھ کر اس نے چلا کر کہا:۔

"ہاتھ نہ لگاؤ ہاتھ نہ لگاؤ .... دوڑ کر اس گاؤں میں جاؤ .... جلدی .... گھر میں ابا ہیں .... لوسا کے گھر .... داہنے ہاتھ کا پہلا گھر دس منٹ تک پہیہ کو روکے رہونگا۔ جلدی ..... جلدی ......"

بھکاری دم سادھ کر دوڑا اور سیدھا جا کر گاؤں میں داخل ہو گیا۔ سب دروازے بند تھے۔ نہ کہیں روشنی نظر آتی تھی نہ کوئی آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔ پہاڑی کے نیچے کس تکلیف سے وہ شخص گرتی ہوئی گاڑی کو اپنے بدن سے تھوڑی دور روکے ہوئے تھا، اسی خیال میں وہ بیخود ہو رہا تھا۔ آخر وہ ٹھہرا۔ سامنے کا راستہ چورس تھا، دائیں طرف ایک گھر تھا، کھڑکی سے روشنی باہر آ رہی ہے۔ اس نے سمجھا ضرور یہی گھر ہو گا، جلدی سے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کسی نے پوچھا:۔

"کون، جولوا کیا تو پھر آ گیا؟"

اس کا دم پھول رہا تھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ صرف بار بار کھڑکی پر دستک دینے لگا۔

ایک شخص نے کھڑکی کھول کر سر باہر نکالا، اور کہا:۔

"مجھو! تو آگیا؟"

ذرا دم لیکر بھکاری نے کہا۔

"نہیں...... میں آیا ہوں......"

اُس شخص نے بھکاری کو اپنی بات ختم نہ کرنے دی اور کہنے لگا:۔

"دوپہر رات گئے گاؤں میں لوگوں کو مارنے آیا ہے۔ جا دُور ہو...."

اس کے بعد اس نے کھڑکی بند کر لی، اور بڑبڑانے لگا۔

"سب ننگے، کوڑھی، بھک منگے......"

اس بے رحمانہ برتاؤ سے بھکاری مبہوت ہو کر ٹھٹک گیا۔

"ان لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے کیا جب میں آتا ہوں بھیک ہی مانگنے آتا ہوں؟ آخر میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے، شاید کچی نیند میں اُٹھانے سے اس قدر غصہ ہے، کاش وہ یہ جانتا؟"

ڈرتے ڈرتے پھر اُس نے دستک دی۔

اندر سے پھر وہی شخص چلّایا:۔

"ابتک نہیں گیا؟ کھڑا ہے؟ اچھا کھڑا رہ۔ اب کی بار تجھے مزہ چکھاؤنگا"

بھکاری نے ہمت کرکے کہا

"کھڑکی کھولو...."

"جا۔ جا۔ کہیں اور دیکھ...."

"کھڑکی کھولو......"

اس مرتبہ پھر کھڑکی کھلی، مگر اس قدر زور سے کہ بھکاری کو سر بچانے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑا۔ کھلی ہوئی کھڑکی پر کھڑا ہوا وہ شخص غصے سے کانپ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔

"بدمعاش، سنتا نہیں، اگر تو یہاں سے جلد ہی دُور نہ ہوگیا تو جان کی خیر نہیں"

اندر سے کسی عورت کی سخت آواز کان میں آئی۔

"گولی مار دو، گاؤں کے لوگ دعا دیں گے۔ کوئی کام کاج نہیں، دنیا بھر کے ننگے بھکاری، رات کو گھروں میں آکر چوری کرتے پھرتے ہیں"

اُس نے بھکاری کو بندوق کا نشانہ بنانا چاہا۔ مگر وہ بیچارہ خوف سے تاریکی میں پیچھے ہٹ گیا اور

تھوڑی دیر کے لئے گاڈیان کو جو اس وقت جنگل میں موت کا انتظار کر رہا تھا بالکل بھول گیا۔
تھوڑی دیر بعد جب گاڈیان کی نازک حالت کا خیال آیا تو ایک بار پھر اس نے کھڑکی کھلوانے کا ارادہ کیا مگر سوچا کہ اگر پھر آواز دی تو اس مرتبہ ضرور بندوق کا نشانہ بنا دیا جاؤنگا، شور وغل مچانے سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ گاؤں کے لوگ میری بات سننے سے پہلے ہی مجھے مار ڈالیں گے۔
صرف ایک لمحے کے پس وپیش کے بعد وہ دوڑا، شاید اُن کی مدد کے بغیر وہ خود ہی تنہا گاڈیان کو بچا سکے، وہ دیوانہ وار دوڑا، لیکن کسے معلوم تھا کہ اس وقت تک کیا گذر چکا ہے
اس عزم کے ساتھ ہی اس کے جسم میں جوانوں کی سی قوت آگئی تھی۔ گاڑی کے پاس پہونچکر اس نے آواز دی:۔
"ارے دوست!"
کوئی جواب نہ ملا، پھر آواز دی:"
"دوست!"
تاریکی اس قدر غالب آگئی تھی کہ گھوڑا تک نظر نہ آتا تھا، صرف اس کی آواز کانوں میں آتی تھی، بھکاری نے قریب جاکر دیکھا کہ گھوڑا ایک طرف جھک گیا ہے اور گاڑی بھی سامنے کو گری ہوئی کھڑی ہے
"دوست!..... دوست!....."
وہ جھک کر کچھ تلاش کرنے لگا، یکایک چاند نے ایک ابر کے ٹکڑے سے منہ نکالا۔ بھکاری نے اس کی روشنی میں دیکھا کہ گاڈیان چت پڑا ہوا ہے اور اُس کی دونوں آنکھیں بند ہیں۔ منہ سے خون جاری ہے۔ گاڑی کا پہیہ جس طرح کیچڑ میں دب جاتا ہے اسی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گیا ہے۔
یہ حالت دیکھکر اس کو گاڈیان کے ماں باپ پر غصہ آیا اور پھر اسی گھر کی طرف دیوانہ وار دوڑا۔ اب اُس کے دل میں بندوق کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہا، اُس نے بے خوف ہوکر کھڑکی پر دستک دی۔
"جولو، کیا تو پھر آگیا!"
بھکاری نے کچھ جواب نہ دیا۔ کھڑکی سے منہ نکال کر جب دوبارہ اُس نے سوال کیا تو بولا۔
"نہیں! تمہارا لڑکا راستے میں مرا پڑا ہے، جس خبر کو پہونچانے کیلئے میں پہلے آیا تھا اسی کے لئے اب پھر آیا ہوں۔"
گاڈیان کے باپ ماں دونوں چیخ اُٹھے۔
"کیا کہتا، کیا کہتا ہے؟ اندر آ، اندر آ.......جلدی.......جلدی...."

لیکن بھکاری اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں سر چھپا کر چل دیا اور چلتے چلتے بولا۔
"سمجھ اور کام کرنا ہے۔ اب شور و غل سے کیا فائدہ، تم نے بہت دیر کر دی۔ اگر پہلے ہی سے تھوڑا خیال کرتے تو اس کی جان بچا لیتے۔ اب تو وہ گاڑی کو بوجھ سمیت اپنے سینے پر لئے بے فکر سو رہا ہے۔"
گاڑیبان کی ماں چلائی "جاؤ پیارے دوڑو، فوراً جاؤ ......"
باپ نے فوراً چادر اوڑھ لی اور کہنے لگا۔
"کہاں چلا گیا، بھکاری تو کدھر غائب ہو گیا؟ آ۔ آ۔ تجھے خدا کی قسم بتا کیا ہوا؟"
مگر بھکاری اپنی لاٹھی کندھے پر رکھے تاریکی میں غائب ہو گیا۔
ان کے شور و غل سے پرندے جاگ اٹھے، اور گاؤں کے کتے خوفزدہ ہو کر بھونکنے لگے لیکن بھکاری کا کہیں پتہ نہ تھا۔

(پلاٹ ماخوذ)

برسات اور گنگا کا کنارہ

(از شریمتی شیو کماری دیوی)

شام کا وقت ہے سخت گرمی پڑ رہی ہے جسکو دیکھو پسینے پسینے ہے۔ ہوا بند ہے، وہ اُمس ہے کہ دم گھٹا جاتا ہے۔ پنکھے جھلے جا رہے ہیں، ہر شخص کی زبان پر پانی پانی ہے۔ یہ لو! کالی کالی گھٹائیں پورب سے اٹھیں بڑھیں پھیلیں اور تمام آسمان پر چھا گئیں، دلوں میں طراوت آ گئی، چہروں پر خوشی نمودار ہے معلوم ہوتا ہے کہ بیجان چیزوں میں بھی جان پڑ گئی تیز ہوا چلنے لگی، پتی پتی خوشی میں جھومنے لگی، درخت جلنے لگے۔ ع

خود بخود تازہ اُمنگیں جوش پر آنے لگیں دل کو گرمانے لگی ٹھنڈی ہوا برسات کی

پہلے ننھی ننھی بوندیں پڑیں، ہونے زور ملا تو بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں، اب موسلا دھار برس رہا ہے، ہوا بھی زور شور سے چل رہی ہے دریا میں غضب کا تلاطم ہے، موجیں ہیں کہ تیوں اچھل رہی ہیں، پانی پہ پانی مطر رہا ہے بادل گرج رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے، وہ شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، جہاں تک دیکھو پانی ہی پانی نظر آتا ہے ایک دھواں سا اٹھ رہا ہے سبز و سپید دھند چھائی ہے کہیں کہیں بڑے بڑے درخت نظر آتے ہیں مگر کاجل کے سے دھبے۔ اس گہری دھند نے دریا سے آسمان تک ایک کر دیا ہے دو کشتیاں دریا پر رواں ہیں جو کنارے کے قریب پہنچ چکی ہیں کچھ لوگ چھتریاں لگائے ہیں کسی نے اپنے سر پر ٹاٹ ہی ڈال رکھا ہے کسی نے سر پر پنکھا ہی رکھ لیا۔ کوئی تنکا بھی نکلا ہے مگر سب تر بتر ہیں۔ وہ دیکھو ملاح ناؤ کو چلائے چپ چپ کرتے آہستہ آہستہ ناؤ کو کنارے کھینچے لئے جا رہے ہیں، اب ناؤ میں ہلچل ہے آوازیں بلند ہوئیں "گنگا ماتا کی جے" سب پار اتر گئے۔

تنقید کتب

گنجِ معانی

(منشی تلوک چند محروم بی۔اے۔ کی اخلاقی، ادبی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ)

منشی تلوک چند صاحب محروم سرزمین پنجاب کے مایۂ ناز شاعر ہیں، آپ ضلع میانوالی کے رہنے والے ہیں جہاں اُردو زبان کا بہت کم چرچا ہے۔ مگر بقول سر عبدالقادر اس جنگل نے وہ خودرو پھول پیدا کیا جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی۔ چنانچہ اب تک کلامِ محروم کے نام سے آپ کی دلکش نظموں کے دو مجموعے شائع ہوکر قبول عام ہو چکے ہیں۔ اب آپ کی ۱۹۱ ادبی اخلاقی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ گنجِ معانی کے نام سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اور آنریبل شیخ عبدالقادر صاحب جج ہائیکورٹ پنجاب نے اس کا دیباچہ تحریر فرمایا ہے جس میں محروم کی شاعری پر لطیف بحث کی گئی ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ میانوالی میں پیدا ہو کر ایسی صاف اور سلیس زبان لکھنا جیسی صوبجات متحدہ کی ہوتی ہے عجائبات میں ہے اور اس بارے میں محروم صاحب کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

اس دلچسپ مجموعے پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ محروم کی طبع رسا میں کس قدر تنوع کس قدر بوقلمونی، کس قدر رعنائی اور کس قدر رنگینی ہے۔ اس مجموعے کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کا ہر حصہ بجائے خود مکمل اور مستقل رسالہ ہے۔ اس کی اکثر نظمیں درسی کتب میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔

مختلف نظموں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ محروم صاحب کو زبان و تخیل پر کس قدر زبردست قدرت حاصل ہے بقول میتھو ارنلڈ "شعر تنقید حیات کا دوسرا نام ہے" اس اعتبار سے ہر چیز جسکا انسان کی زندگی سے تعلق ہے شعر کا موضوع بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ محروم کی ۱۹۱ نظموں سے بھی اس قول کی حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ فلسفۂ اخلاق، جذبات کی تحلیل و تشریح، مذہب، روحانیات، غرض ہر چیز پر محروم صاحب نے قلم اُٹھایا ہے اور بحد کمال پہونچا دیا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور پھر اپنے کمال فن کی بدولت مختصر الفاظ میں اس حسن کو منکشف کر دیتے ہیں جو موضوع میں اس طرح پوشیدہ تھا جیسے سنگ میں شرارہ

...ں ہے کہ کلامِ محروم کا ... کر الفاظ میں دکھایا جاسکتا ہے لیکن اس کی معنوی
معنوی گہرائیوں اور لطیف نازک ادائیں الفاظ کی تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتیں پھول کی بو، ساز کا نغمہ
غروب کا نقشہ لفظوں کی قید میں نہیں آسکتا ہے، اور اس کے لئے ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک گلشنِ معانی
کی سیر نہ کی جائے اس وقت تک احباب لطفِ سخن سے محروم رہیں گے۔

زمانہ کو شروع سے کلامِ محروم کی اشاعت کا موقع ملتا رہا ہے اس لئے ہم کو یہاں پر اس کے مفصل اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن آپ کے کلام معجز نظام کی بعض خصوصیات کا مختصر تذکرہ بے موقع نہ ہوگا۔

اکثر شعرا کے شاعرانہ محسوسات کا میلان ایک خاص مرکز پر ہوتا ہے، اُن کے قلب سے ایک خاص صدا نکلتی ہے، اُن کا سازِ ہستی تمام ہم آہنگیوں کے ساتھ ایک خاص نغمہ بلند کرتا ہے، اُن کے قدم ایک خاص منزلِ مقصود کی طرف اُٹھتے ہیں، اُن کی روح کا ایک پیغام ہوتا ہے، چنانچہ محروم کی روح کا پیغام دردو غم ہے۔ اُن کی زندگی ایک داستانِ غم ہے۔ آپ کی رفیقۂ حیات شادی سے چند ہی سال بعد ایک ننھی سی بچی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئیں۔ بچی کی بے بسی، اپنی خانہ ویرانی، اور اسی طرح کے صدمات پیہم نے محروم کو مجسم درد یا سوز و گداز کا پُتلا بنا دیا ہے۔ جوانی کی امنگیں ہٹ گئیں، ولولے جاتے رہے، دل کی بستی غموں نے اُجاڑ دی۔ "دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ" کی حقیقت نظر آنے لگی، ہجومِ آلام سے پریشان ہو کر اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور وہ یہ آہِ سرد کہنے لگتے ہیں:-

کبھی ابرِ کرم کی نہ بوند گری۔ ہوئی آہ! شاخِ امید ہری
ترے دل کی کلی نہ کھلی نہ کھلی۔ ترے باغ میں بادِ صبا نہ چلی
نظر آئی نہ صبحِ وصال کبھی، شبِ غم نہ ٹلی نہ ٹلی نہ ٹلی
جسے ڈھونڈھ رہا تھا حرم میں کبھی کبھی دیر میں جس کی تلاش رہی
رگِ جاں سے وہ تیرے قریب رہا — تری آنکھیں نہیں ہیں نظر ہی نہیں
نہ بہارِ نشاط دو روزہ پہ مر، کہ ہے باغِ جہاں میں خزاں کا گذر
یہ طلسم ہے سارا فریبِ نظر، نہ ہے غنچۂ تر نہ شجر نہ ثمر
جو رکھے تو مآلِ جہاں کی خبر، تو اُٹھائے کبھی نہ ملالِ مرز
رہا طالبِ عیشِ فنا تو اگر، تو حریمِ بقا کی امید نہ کر
وہ دوام ہے جس سے گذر ہی نہیں — یہ وہ شام ہے جس کی سحر ہی نہیں

منشی تلوک چند محروم

اس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ مگر بتقاضائے بشریت بعض مقامات میں نظرِ ثانی کی فرصت باقی رہ گئی ہے
مثلاً زمزمۂ توحید میں "حسین نے تجھ میں سمائی پائی" فصیح نہیں ہے۔ اسی طرح کشفِ حقیقت میں خیال
دعا و دوا نہ رہا کے بجائے اگر خیال دعا و دوا نہ رہا ہوتا تو بہتر تھا۔ فریادِ یتیم اور کولھو کے بیل میں
تیل اور کھیل مؤنث مستعمل ہوئے ہیں۔ اسی نظم میں ریٹ۔ تیلی کے کولھو کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح
بعض خفیف خفیف غلطیاں دو ایک مقامات میں اور رہ گئی ہیں۔ مگر بڑے سے بڑے استادوں کا کلام
بھی اس قسم کی نکتہ چینی سے بالاتر نہیں۔ مرحوم جیسی صاف اور ستھری زبان میں اپنے شاعرانہ خیالات ادا
کر لیتے ہیں وہ نہ صرف اُن کے لئے بلکہ تمام اہلِ پنجاب کے لئے باعثِ فخر و مباہات ہے، اور حقیقت تو
یہ ہے کہ کسی قدر دانِ فن یا کتب خانۂ اردو کو گنجِ معانی سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ اس کی لکھائی چھپائی
اور کاغذ نہایت دیدہ زیب ہے۔ شروع میں مصنف کی عکسی تصویر بھی دی گئی ہے۔ یہ بیش بہا مجموعہ نفیس
فل اسکیپ سائز کے ۲۰۴ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ شائقین مسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشرز، انارکلی
لاہور سے طلب فرمائیں۔ قیمت صرف ۲/ ہے۔

"ریاست"

یہ حکیم افلاطون یونانی کی کتاب "اسٹیٹ" کا ترجمہ ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پی ایچ۔ ڈی۔
پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے کیا ہے۔ حجم تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات اور انگریزی وضع کی جلد پارچہ پشتہ
و ٹائیٹل پر کتاب کا نام چھپا ہوا ہے اور پانچ روپیہ میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے۔
مشہور و معروف انگریز ادیب و شاعر رڈیارڈ کپلنگ کا قول ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب
اور دونوں میں اتفاق و اتحاد ناممکن ہے۔" یہ قول صحیح ہو یا غلط مگر پورب ہو یا پچھم، اُتر ہو یا دکن سب ایک
نقطے یا مرکز پر آ کر ضرور ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ نقطہ "فلسفہ یا حکمتِ یونان" ہے۔ مشرق و مغرب دونوں کے
صاحبِ فکر حکمائے یونان کے پرستار ہیں جن کا معلم اول حکیم افلاطون تھا۔ پھر جس کتاب کا مصنف دُنیا
کا یہ حکیم اعظم ہو اُس کتاب کا کیا کہنا۔ خود فاضل مترجم نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا ہے کہ "دنیا کے
سب سے بڑے مصنف کی یہ سب سے اہم کتاب اور افلاطون کے شجرِ علم کا پختہ ثمر ہے۔" اس کا نام گو
"ریاست یا تحقیقِ عدل" ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کا موضوع صرف سیاسیات یا قانون ہوگا
اس کتاب میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے جس میں انسان کے اخلاق کا حصہ نمایاں ہے اس
میں روحِ انسانی کے محاسن کی لطیف و دقیق تحقیق کی گئی ہے۔ سیاسیات کے حق میں یہ کتاب خضرِ راہ ہے

ہے فلسفہ تاریخ کی کلید ہے اجتماعات انسانی کے عروج و زوال کا مرقع۔ اس اہم کتاب کا
ترجمہ بھی فاضل مترجم نے اس قدر قابلیت سے سلیس اور شستہ زبان میں کیا ہے کہ زبان سے بے اختیار
تحسین نکلتی ہے۔ جلد کے نمونہ کی گنجائش نہیں ورنہ تھوڑا سا اقتباس ضرور نذر ناظرین کیا جاتا۔ ہم امید کرتے
ہیں کہ کوئی کتب خانہ اور کوئی لکھا پڑھا ہاتھ اس کتاب سے خالی نہ رہیگا۔

مشاہیر ادب اردو

مرتبہ منشی مہیش پرشاد مولوی فاضل (آنرز ان عربک) لکچرار عربی و فارسی و اردو ہندو یونیورسٹی بنارس

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت شمس الدین ولی دکنی سے لیکر سر محمد اقبال تک ایک سو تیس ۱۳۰ ایسے مشاہیر ادب اردو کے مختصر حالات لکھے ہیں جو اردو نظم و نثر کے بہترین خادم تھے۔ حالات اگرچہ مختصر ہیں مگر سبق آموز اور طلبا کے لئے کافی ہیں۔ حالات کے علاوہ ان مشاہیر کی نظم یا نثر یا دونوں کے نمونے بھی دیے گئے ہیں جس سے یہ کتاب اور بھی زیادہ مفید ہو گئی ہے۔ کیونکہ ان نمونوں ہی کے ذریعہ سے ایک محقق اگر چاہے تو ادب اردو کی تدریجی تاریخ لکھ سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب بڑی جماعتوں کے طلبا کے لئے مفید ثابت ہوگی

اگرچہ فاضل مؤلف نے مشاہیر کے حالات میں حتی الامکان تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے لیکن ایک آدھ جگہ غلطیاں بھی رہ گئی ہیں مثلاً میر امن دہلوی کے حالات میں یہ واقعہ غلط درج ہو گیا ہے کہ باغ و بہار کا اصل منبع امیر خسرو دہلوی کا فارسی قصہ چہار درویش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو دہلوی نے کوئی قصہ چہار درویش نہیں لکھا بلکہ فارسی زبان میں یہ قصہ کسی اور صاحب کا لکھا ہوا پہلے سے موجود تھا جسے ممکن ہے امیر خسرو نے اپنے پیر کو سنا دیا ہو۔ یہ بات مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اپنے مقدمہ باغ و بہار میں بخوبی ثابت کر چکے ہیں

ہماری رائے میں فاضل مؤلف کو نظیر اکبرآبادی اور پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی کے حالات بھی اس مجموعے میں شامل کرنا چاہیئے تھا۔ زبان اردو ان دونوں نامور شعرا کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی صاف، کاغذ عمدہ اور حجم ۱۳۴ صفحات ہے قیمت ۸ر ملنے کا پتہ اسٹینڈرڈ پریس الٰہ آباد

یاد رفتگاں

جان گالزوردی مرحوم

زمانہ بابت اکتوبر ۳۲ء میں ہم نے نوبل پرائز کے سلسلے میں انگلستان کے نامور مصنف و ڈراما نویس جان گالزوردی کا مختصر تذکرہ کیا تھا۔ افسوس ۳۱ جنوری گذشتہ کو یہ بیمثل ادیب و شاعر اس جہان فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہوگیا۔ پچھلا مہینہ انگریزی ادب کیلئے خاص طور پر منحوس ثابت ہوا کیونکہ گالزوردی کے علاوہ دو اور مشہور و معروف ادیب جارج مور اور جارج سینٹس بری کا بھی اسی ماہ میں انتقال ہوگیا۔ انگریزی زبان ان تینوں اصحاب کے احسانات سے ہمیشہ گرانبار رہیگی لیکن جان گالزوردی کو ایک فلسفی مصنف، ہمدرد انسان اور نکتہ دان علم کی حیثیت سے لافانی شہرت حاصل ہوگئی ہے اور ان کی تصانیف کے قدردانوں کی تعداد روز افزوں ہوتی رہیگی۔ گالزوردی کی عمر ۶۶ سال کی تھی۔ آپ ۱۸۶۷ء میں بمقام کومب واقع ضلع سرے پیدا ہوئے تھے، ہیرو اور نیو کالج آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۰ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی لیکن وکالت کا پیشہ اختیار نہ کیا طبیعت میں سیر و سیاحت کا بیحد شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ کناڈا۔ آسٹریلیا جنوبی افریقہ مصر و روس میں نہایت وسیع سیاحت کی۔

سیر و سیاحت سے فارغ ہوکر گالزوردی نے صحیفہ نگاری اختیار کی، اسی سلسلے میں ۱۸۹۶ء میں افسانہ نگاری شروع کردی۔ لیکن ابتدا میں آپکے ناولوں کی زیادہ قدر نہ ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں انکا ناول "صاحب جائداد آدمی" (مین آف پراپرٹی) شائع ہوا۔ یہ دراصل اس دلچسپ سلسلہ کی ابتدائی کڑی تھی جو دنیائے ادب میں "فورسائتھ ساگا" کے نام سے مشہور اور گالزوردی کا ایک کارنامۂ اعظم ہے۔ اس سلسلہ میں ایک متمول خاندان کی کئی پشتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پورا سلسلہ چھ طولانی اور چار مختصر ناولوں پر مشتمل ہے اور اس کی تصنیف میں گالزوردی کی عمر عزیز کے بائیس برس صرف ہوئے۔ آخری حصہ زیادہ تر ۱۹۲۷ء میں اس وقت لکھا گیا تھا جب گالزوردی جنوبی افریقہ کی سیاحت کر رہے تھے۔ اس سلسلہ کا ہیرو سوامیس فورسائٹ دنیائے افسانہ میں ایک نہایت دلچسپ

اور مکمل کردار خیال کیا جاتا ہے۔

اسی اثنا میں گالزوردی دیگر ناول ڈرامے اور مضامین بھی لکھتے رہے جن میں زیادہ تر مظلوم انسانوں اور بے زبان جانوروں سے ہمدردی ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے نشیب و فراز پر غائر فلسفیانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ گالزوردی کی تصانیف میں جذبات۔ خیالات تاثرات اور محاکات سبھی کچھ موجود ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز نہیں ہے تو شوخی جسکا ادب میں وہی درجہ ہے جو طعام میں نمک یا حسن وجمال میں ملاحت کا۔ گالزوردی کی کتاب "انصاف" (جسٹس Justice) اس قدر مؤثر اور دلکش پیرایہ میں تحریر ہوئی ہے کہ اس کے شائع ہوتے ہی ملک میں ہلچل پیدا ہوگئی اور اسکا عملی نتیجہ نکلا کہ انگلستان کے قیدخانوں کے انتظام و اہتمام میں معقول اصلاح کردی گئی۔

اس کے ڈرامے واقعات زندگی اور حقائق سے اس قدر مملو ہیں کہ ان کے دیکھنے یا مطالعہ کرنے سے جذبات فوراً متاثر ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک روز جرمنی کے شہر ہمبرگ میں جب گالزوردی کا جسٹس نامی ڈراما کھیلا جارہا تھا تو ناظرین کے قلوب پر اس ڈرامے کے واقعات کا اس قدر اثر ہوا کہ کئی خواتین پر غشی طاری ہوگئی۔ اس کا دوسرا ڈرامہ "اسٹرائف" (Strife) بھی نہایت زبردست ڈراما سمجھا جاتا ہے اس کے دیگر ڈرامے یہ ہیں:۔ چاندی کی ڈبیہ (سلور بکس Silve Box) "خوشی" (جوائے Joy) "جنگل" (فارسٹ Forest) "مجمع (ماب Mob)" ذرا سا عشق (اے بٹ آف لو A bit of Love) "گرہست آدمی" (اے فیملی مین A Family man) "تماشا" (شو Show) "فرار" (اسکیپ Escape) وغیرہ

گالزوردی نے متعدد ناول لکھے ہیں جن کے نام ہم بخوف طوالت یہاں پر نظرانداز کرتے ہیں گالزوردی کے ناولوں کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ان کی فکر رسا نے سطح قرطاس پر جتنے بھی کردار (کیرکٹر) پیدا کئے وہ ایسے نہیں جنھیں اپنے عشق و محبت یا فکر وصل کے سوائے دنیا ومافیہا سے کچھ تعلق نہ ہو۔ ان کے ناولوں اور ڈراموں کے افراد سب کے سب دنیا میں رہنے اور چلنے پھرنے والے دنیا دار لوگ ہیں۔ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور دنیوی زندگی بسر کرتے ہیں نہ وہ زاہد خشک ہیں نہ فرشتے۔ ان کرداروں کے نقل وحرکت اوضاع و اطوار نشست و برخاست اور جملہ معاملات سے ناظرین کو عہد حاضرہ کی تاریخ سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ناول کیا ہیں عہد وکٹوریا و مابعد کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔

گالزوردی کی ہمیشہ یہ عادت تھی کہ وہ اپنی تصانیف کی خود زیادہ قدر نہ کرتے تھے جو چیز لکھی بے پروائی سے ڈال دی لیکن ان کی نیک نہاد بیوی اپنے نامدار شوہر کی ادبی قدر و منزلت سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ ہمیشہ ہر چیز کو دیکھ کر احتیاط سے ٹائپ کردیا کرتی تھیں۔ مسز گالزوردی میں بہترین

خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بہترین نقادِ فن تھیں۔ چنانچہ اُن کی تنقیدیں اور مشوروں سے اس نامور ادیب کی تصانیف کے ساتھ سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ اسی رفیقۂ حیات کی ترغیب تھی کہ گالزوردی نے اٹھائیس سال کی عمر میں سیف کے بجائے قلم کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا لیکن انھوں نے روپیہ کی خاطر کبھی کوئی کام نہیں کیا، ان کے پاس دوسرے ذرائع آمدنی بھی تھے اور اُن کی زندگی کا معیار نہایت بلند اور ان کے خیالات نہایت اعلیٰ تھے۔ انھوں نے کبھی دولت و ثروت کا رعب نہیں مانا اور نہ کبھی شہرت اور دنیوی اعزازات کی کوئی پرواہ کی۔ ابھی چند ہی سال کی بات ہے کہ سلطنت برطانیہ کی طرف سے انھیں سر (نائٹ ہڈ) کا خطاب پیش کیا گیا تھا۔ مگر اس عافیت پسند اور مستغنی المزاج ادیب نے اس اعزاز کو قبول نہیں کیا، اس پر گورنمنٹ نے ۱۹۲۹ء میں انھیں "آرڈر آف میرٹ" کا تمغہ و نشان دیا۔

گالزوردی کی تصانیف کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے، اور ان کے ڈرامے مختلف مغربی ممالک میں کھیلے جا چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اسکی مشہورِ عالم تصنیف "اسکیپ" (Escape) کا خود ان کی نگرانی میں متکلم فلم تیار کیا گیا۔ انگریز مصنفین کی صفِ اول کا یہ پہلا ڈراما تھا جو دنیائے فلم میں مقبولِ عام ہوا۔ اس کا مکالمہ خود گالزوردی نے لکھا تھا۔

گالزوردی کا دل حبِ وطن سے سرشار تھا۔ انگریزی ادیبوں میں ان کا شمار سر والٹر اسکاٹ وغیرہ معدودے چند محبانِ وطن میں ہوگا۔ لیکن ان کی حب الوطنی دوسرے ملکوں اور قوموں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے اپنے حبِ وطن میں انسان دوستی اور انصاف پسندی کے اعلیٰ ترین معیار کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ پچھلے سال لندن اسپکٹیٹر کے کرسمس نمبر میں "ستارۂ وطن" کے نام سے گالزوردی کی جو نظم شائع ہوئی تھی اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ ناظرین کرام لطف اندوز ہوں اور دادِ سخن دیں۔ ہمارے معزز دوست اور رفیق کار منشی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔ اے نے ناظرینِ زمانہ کی خاطر ان بے نظیر جذبات کا اُردو ترجمہ بھی کر دیا ہے جو اصل اشعار کے بعد ہی ہدیۂ ناظرین ہے:-

In many countries I have stood,
Where miracles have thronged,
To God's imaginative mood,
And yet my heart has longed,
For English sound and scent and scene,

Though all my reason knows.

They'll never be, have never been.

Fit to compare with these.

Why this should be, I cannot tell.

Of man it seems decreed.

That he shall feel the moving spell.

Of his especial breed.

(ترجمہ)

پھر کے دنیا بھر میں دیکھے میں نے امصار و دیار
جن میں تھی معجز نما، تخئیلِ ذاتِ کردگار

لیکن اے انگلینڈ! اے میرے وطن! اے میری جان
تیرے منظر، تیری نکہت، تیری آوازیں کہاں

ہاں جو سچ پوچھو تو ہے یہ فتوے عقل و گماں
ان کا ان سے کیا تقابل، یہ کہاں اور وہ کہاں

آخر اسکی وجہ کیا ہے اور یہ صورت ہے کیوں؟
یہ تخالف، یہ کشش، یہ اُنس، یہ حالت ہے کیوں؟

وجہ کیا؟ یونہی مقدر ہے بشر کے واسطے
اس کا دل مضطر رہیگا اپنے گھر کے واسطے

ملک و ملت کی محبت کا ایک دریائے ناپیدا کنار گالزوردی نے کس قابلیت سے صرف چند اشعار کے کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ان اشعار آبدار سے اس کے اعلیٰ تخیل اور اسکی فلسفیانہ نکتہ دانی کا بھی پورا ثبوت ملتا ہے۔ بہر حال گالزوردی محض قافیہ پیما شاعر یا داستان گو ادیب نہ تھے بلکہ فطرت کے پیغامبر تھے اور جو شئے دنیا میں لیکر آئے تھے اس کا پیغام "حقیقت و صداقت" تھا۔ نثر ہو یا نظم گالزوردی نے اس پیغام کو دنیا کے کانوں تک پہونچانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ وہ خود اپنی قوم کی طرف سے جنگ کر چکے تھے لیکن وہ جنگ سے متنفر اور پورے صلح پسند واقع ہوئے تھے۔ گالزوردی کی زبان سادہ و سلیس اور خیالات اس قدر پاکیزہ و نفیس ہیں کہ زبان سے نکلتے ہی دل و دماغ سے اپیل کرتے ہیں۔ ایک

ماہر فن انگریزی نقادنے گالزوردی کے متعلق حسب ذیل ریمارک کئے ہیں:۔

"انگلستان جدید کے ذیلئے ڈراما میں گالزوردی ایک ہستی اعظم ہے۔ اس کے ڈراموں کا لفظ لفظ جواہر پارہ اور ہر سطر سلک مروارید جس میں پند و نصائح اور اصلاح و درستی کے موتی چن چنکر پروئے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے کھیل نہیں ہیں بلکہ شانہ ارحکمت و موعظت کے دفتر ہیں۔ اس کی تصانیف حقائق سے مملو اور ٹھوس واقعات پر مبنی ہیں۔ وہ ناظرین کے سامنے حقیقت پیش کرتا ہے۔ اور اُن کے قلوب کو متاثر کرکے ہیجان میں لے آتا ہے۔ وہ جو تصویر کھینچتا ہے اس کے خدو خال کی تفصیلات پر پوری نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک زبردست آرٹسٹ ہے، وہ جذبات پیش کرتا ہے۔ مگر جذبات کی رَو میں خود نہیں بہہ جاتا۔ وہ ڈرامہ پیش کرتا ہے مگر خود اپنا تماشا نہیں دکھاتا۔ خدا کی مظلوم مخلوق کے لئے خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان اس کی ہمدردیاں وقف ہیں۔ ظلم کاروں اور ستمگاروں کے حق میں اس کا قلم نیزہ ہے۔"

جان گالزوردی نے مرتے مرتے بھی دنیائے علم و ادب پر ایک احسان عظیم کیا، یعنی مرنے سے پہلے اس عالی ہمت اور الوالعزم ادیب نے یہ وصیت کردی کہ اس کو نوبل پرائز میں جو رقم بطور انعام ملی ہے وہ ایک ٹرسٹ کے ذریعہ سے "پن کلب" کو دیدی جائے۔ مسٹر گالزوردی اس کلب کے صدر تھے یہ انشاپردازوں کی ایک عالمگیر انجمن ہے جس کے مرکز دنیا کے پچاس مقامات میں قائم ہیں۔ مسٹر موصوف نے یہ بھی شرط لگادی ہے کہ اگر یہ کلب ٹوٹ جائے تو یہ رقم رائل لٹریری فنڈ کے حوالہ کردی جائے۔ بہرحال

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

تصحیح

زمانہ جنوری ۱۹۳۳ء نمبر میں "مرزا رسوا مرحوم" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں مندرجہ ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ناظرین کرام تصحیح فرمالیں:۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۳	بقیہ السیف	بقیہ السلف
۳	۱۱	درسیات پڑھیں	درسیات پڑھے
۹	۸	اور انکا مذاق	اون کا مذاق
۱۲	۲۵	اگر زندگی ہے تو	اگر زندگی ہے تو آئندہ

(اڈیٹر)

مشاہیر عالم

شاہ کجکلاہ ایران رضا شاہ پہلوی

(از منشی محمد یعقوب خاں کلام بی-اے)

اینگلو پرشین تیل کمپنی کے اجارہ کی تنسیخ کے متعلق ایران و برطانیہ کے درمیان جو تنازعہ چھڑ گیا ہے وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ دو اہم شخصوں کے مختصر حالات ہدیۂ ناظرین زمانہ کئے جائیں۔ ان میں ایک تو اس کمپنی کا بانی ہے جس نے ایران میں شاہان قاچار سے مٹی کے تیل کا اجارہ حاصل کیا۔ اور دوسرا وہ جس نے اس اجارہ کو سیاسی یا اقتصادی لحاظ سے مضر سمجھ کر منسوخ کر دیا۔ پہلا شخص مسٹر ڈارسی ہے اور دوسرا شاہ کجکلاہ ایران رضا شاہ پہلوی کسی نے کیا خوب کہا ہے سہ

خدا کی دین کا موسیٰ کا پوچھیے احوال — کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ شعر جس قدر موجودہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی پر صادق آتا ہے کسی دوسرے پر نہیں آ سکتا۔ قدرت کے کارخانے دیکھئے کہ دیہات کا رہنے والا محمد رضا نامی ایک نوعمر لڑکا فاقوں سے تنگ آ کر دار السلطنت طہران میں آتا ہے اور یاوریِ قسمت سے شاہی اصطبل میں سائیسی کی خدمت پر مامور ہو جاتا ہے۔ یا بقول بعض محلات شاہی کا دربان بن جاتا ہے، اس وقت وہ محمد رضا خاں کہلاتا ہے اور چند سال بعد جب وہ فوج شاہی میں ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدہ پر پہونچ جاتا ہے اور فوج میں اپنی ہر دلعزیزی کے باعث تاج و تخت ایران کا مالک بنتا ہے تو شاہ کجکلاہ ایران ہز مجسٹی رضا شاہ پہلوی کہلانے لگتا ہے

رضا شاہ نے گذشتہ چند سال کے اندر دوست ایران کے پیکر مردہ میں زندگی کی روح پھونکدی ہے اور رستم و اسفندیار کی اس محبوب سرزمین کو جو شاہان قاچار کی عیش پرستیوں اور آرام طلبیوں کے باعث ٹرکی کی طرح ایشیا کا مرد بیمار بنی ہوئی تھی اور جس کے ضعف و انحطاط سے فائدہ اٹھا کر روس و برطانیہ نے خفیہ معاہدہ کر کے حصے بخرے کر لئے تھے۔ اغیار و اجانب کے پنجۂ آہنی سے آزاد کر دیا اور ابھی جو کچھ اثر اغیار کا باقی ہے اس کی بھی بیخکنی پر آمادہ ہے۔

بلحاظ صورت و شکل ایران کا یہ مرد فولاد بازو کشیدہ قامت ہوئے مونچھوں والی اور خوبصورت سپاہیانہ

ہونٹوں، مخمور آنکھوں اور سرخ و سفید رنگ کا مالک ہے۔ اس کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ خصائل کریمانہ اور مشاغل شریفانہ ہیں۔ فنون سپہگری اور جہاں بانی سے خاص دلچسپی رہتی ہے، اور سپہگری ہی وہ چیز ہے جس نے رضا شاہ کی بلند خیالی اور صحیح قوت فیصلہ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالکر اس کو فرش خاک سے اٹھایا اور تخت طاؤس کے عرش پاک پر متمکن کردیا ہے۔

رضا شاہ کی عمر تقریباً ستر سال ہوگی کہ وہ دیہات سے آکر ایران کی کاسک فوج میں بھرتی ہوا اور یہیں سے اس کی تاریخی زندگی شروع ہوگئی۔ اس کے اصلی حالات کے بارہ میں مختلف بیانات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک کسان زادہ تھا، مگر بعض کا قول یہ ہے کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے اور اس کا باپ دو شاہان ایران کے دربار میں وزیر سوم رہ چکا تھا۔ بہرحال اس ہونہار اور بلند اقبال سپاہی نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے لئے شاہراہ ترقی تعمیر کی۔ اس کی جنگی قابلیت اور سپہگری نے اسے چند ہی دنوں میں ایک بااختیار اور ذمہ دار افسر بنادیا۔

جو سپہگرانہ خصوصیات انگلستان کے مشہور و معروف ڈیوک آف ولنگٹن میں تھیں وہی بلکہ اس سے بڑھ چڑھکر سرزمین ایران کے اس "مرد فولادباز" میں ہیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے بہت جلد جنرل اور پھر فیلڈ مارشل ہوگیا۔ اسی زمانہ میں خوزستان کے عرب قبائل نے جنوبی ایران میں شورش برپا کی رضا خاں کو ان سرکشوں کی تادیب کے لئے بھیجا گیا جس نے جاتے ہی نہ صرف بغاوت کا خاتمہ کردیا بلکہ شیخ محمرہ کو بھی پابزنجیر طہران لے آیا۔ جس وقت وہ قیاصرۂ روم کی طرح فاتحانہ جلوس کے ساتھ دارالسلطنت میں داخل ہوا تو وہ عالم دیکھنے کے قابل تھا۔ جن جن سڑکوں سے اس فاتح کا گذر ہوا اُن پر میلوں تک خوبصورت اور قیمتی فرش بچھا دیا گیا تھا۔ طہران نے اس خوشی میں کئی روز تک جشن فتح منایا اور رضا خاں وزیر جنگ ہوگیا۔

۱۹۱۷ء میں رضا خاں نے ایران کے کاسک بریگیڈ پر قبضہ کرلیا، اور بریگیڈیر جنرل کو جو اس زمانہ کے شاہ قاچار کا عزیز تھا برخاست کردیا۔ اس کے بعد اس نے ایرانی سپاہ کی تنظیم و ترتیب شروع کی جو نہایت پریشان اور بے سروسامان ہورہی تھی۔ تین سال لگاتار محنت کرکے اس نے پانسو آدمیوں کا ایک دستہ بھرتی کیا جو اس پر ہر وقت جاں نثاری کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ انھیں سرفروشوں اور جاںبازوں کی مدد سے اس نے ایران کے فاتح اعظم نادر شاہ کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ نادر شاہ کی مشہور تلوار زیب کمر کی۔ تاج کیانی سر پر رکھا اور سرزمین کسریٰ کا شہنشاہ کجکلاہ بن گیا اور رضا شاہ پہلوی خطاب اختیار کیا۔

جس دن سے رضا شاہ پہلوی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے اُسی دن سے ایران

کے جسم مردہ میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اس نے تمام محکموں کی از سرِ نو تنظیم کی، اور جس قدر خرابیاں حکومت میں نظر آئیں سب کو دور کیا۔ تمام ملک میں شاہراہیں تعمیر کرادیں۔ پرانی عمارتوں کی مرمت کرائی، ایرانیوں کو قوم اور ایران کو صحیح معنوں میں "ایران" بنادیا۔

اس کی طرزِ معاشرت نہایت سپاہیانہ اور سادہ ہے، جب کبھی تفریح کو دل چاہتا ہے تو زیادہ سے زیادہ پیانو بجا لیتا ہے، جو اس نے روس میں سیکھا تھا۔

اس اولوالعزم پہلوی تاجدار کے کیا عزائم ہیں اور اس کو اپنے وطن عزیز سے کس قدر محبت ہے؟ اسکا اندازہ اس گفتگو سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو انگلستان کی مشہور و معروف سیاح اور جہانگرد مصنفہ مس روزیٹا فوربس نے سعد آباد کے قصر گرمائی میں شہریارِ ایران سے کی تھی، اور جو ولایت کے مشہور اخبار "ڈیلی میل" میں شائع ہوئی ہے۔ مس موصوفہ تحریر فرماتی ہیں کہ باریابی کے موقعہ پر شاہ ایران نے مجھ سے فرمایا:۔

"میرے ملک کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی اعانت کے بغیر اپنا کام چلانے پر قدرت حاصل کرے۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ چند سال بعد ایران میں کسی غیر ملکی کو ملازم رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ۱۹۳۴ء تک باستثنائے چند ماہرین صنعت و حرفت و زراعت کے جن کا ہونا ضروری ہے ہم تمام یوروپینوں کی خدمات سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ ہمیں کیانیوں اور اکاسرہ کی جانشینی کا فخر حاصل ہے اور زمانۂ قدیم سے ہم ان کی روایات عظمیٰ کے وارث چلے آ رہے ہیں جبکہ ایشیا قافلۂ تمدن کا قائد اعظم تھا۔

اب اس کی سخت ضرورت ہے کہ قومی اسپرٹ اور جذبات وطنیت مؤثر طور پر جاری و ساری ہو جائیں، میرا ملک بہت کافی عرصہ تک اجنبیوں کی دستگیری کا محتاج رہ چکا ہے۔ میں ایرانیوں کو یہ سکھانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی قدر و قیمت پہچان لیں تاکہ وہ ذہنی و عملی دونوں طرح پنجۂ اغیار سے آزاد ہو جائیں، ہر ملک کی معاشرت جداگانہ ہوتی ہے، میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ایران یورپ کی کورانہ اور بھل تقلید کرے، کیونکہ ایران خود عظیم الشان روایات کا حامل ہے میں اہل ایران کو تاحد امکان "بہترین ایرانی" بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، جو نہ خالص یوروپین ہوں نہ ایشیائی۔ ہر ملک کے لئے اپنا مخصوص جداگانہ سانچہ ہوتا ہے، اہل ملک کو اسی مخصوص قالب میں ڈھال کر ایسی ترقی دینے کی ضرورت ہوتی ہے جس سے ایسا شہری پیدا ہو جو کسی دوسرے کی نقل نہ ہو بلکہ خود ایک مستقل وجود رکھتا ہو، جسے خود پر اعتماد کامل اور اپنی قومیت پر جائز فخر حاصل ہو۔

ایران اپنے گھر کا خود مختار مالک ہے۔ اُسے حق حاصل ہے کہ یہ اپنی دولت کو ترقی دے اور اپنی حفاظت خود اپنی قوت بازو سے کرے۔

"میرا اصلی حربہ فوج ہے۔ تعمیر مملکت کے لئے زمین اسی کی بدولت تیار ہوئی ہے۔ میں محض ایک سپاہی ہوں سیاست داں نہیں ہوں"

رضا شاہ پہلوی کی عمر اس وقت اگرچہ ساٹھ برس سے متجاوز ہے مگر باینہمہ وہ ہر وقت تدبیر مملکت اور جہانبانی میں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔ ان کی میز پر ایسے تاجروں کی عرضیوں کے علاوہ جو خام پیداوار کی درآمد سے قاصر ہوتے ہیں، زراعتی رپورٹوں، اعداد و شمار کے نقشوں، اجناس اور ملکی پیداوار کے نمونوں کے انبار، فوجی بھرتی کی تفصیلات، محکمہ جات جمرک (کسٹم)، ریلوے، مہاجرین، زائرین و تعمیرات شوارع وغیرہ کے متعلق رپورٹوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

وہ عزم راسخ اور قلب مطمئن کے مالک ہیں، کیا مجال جو چہرہ پر کسی قسم کے اضطراب یا تفکر کی جھلک بھی نمودار ہو سکے۔ ان کے ہر انداز سے وقار و تمکنت برستی ہے۔ گفتگو میں آہستہ روی اور تبسم میں اس سے زیادہ نرم رفتاری پائی جاتی ہے۔ زبان سے الفاظ تلے ہوئے نکلتے ہیں، باتیں کھری کھری اور مختصر کرتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ فطرتاً اپنے وطن سے عشق رکھتے ہیں۔ ان کو اگر کسی بات کا کبھی اندیشہ ہوتا ہے تو صرف اس کا کہ کہیں یورپ والے ایران کے ان بیش بہا قدرتی وسائل و ذرائع پر قبضہ نہ کریں جن کے ذریعہ سے وہ ایران کے پرعظمت و شان دورِ ماضی کا احیاء کرنا چاہتے ہیں۔

شہریار ایران کی اولوالعزمی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ایک ہی نسل کے عرصہ میں ایران کو اتنی ترقی دے دینا چاہتے ہیں جس کے لئے عموماً ایک صدی کی مدت درکار ہوتی ہے۔ حکومت ایران درحقیقت کوئی چیز نہیں، خود رضا شاہ کی ذات "حکومت ایران" ہے۔ وہ اپنے وزراء کے اختیارات و اعزاز کو اس تناسب کے ساتھ قائم رکھتے ہیں کہ کبھی کوئی وزیر اس قدر ذاتی اثر و اقتدار حاصل ہی نہیں کر سکتا جو ایک ترقی پذیر سلطنت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکے۔

رضا شاہ نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ جنوبی ایران سے تمام برطانوی اثر قطعی زائل کر دیا جائے وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ایران والے یورپینوں سے زیادہ ربط و ضبط رکھیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک جدید فرمان شاہی صادر ہوا جس میں ایران کے اعلیٰ حکام کا غیر ملکی عورتوں سے شادی کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ فرمان اس نظام عمل کا ایک لازمی جزو ہے جس کے ماتحت قومیت ایران کی تعمیر کی جا رہی ہے۔

رضا شاہ کو ایرانی نوجوانوں کی اعلیٰ تعلیم وتربیت کا بے حد خیال رہتا ہے۔ ایران ماضی میں متوسط درجہ کے خاندان کا نوجوان حرم کی چہار دیواری کے اندر پرورش پاتا تھا، دس برس کے بعد کہیں مدرسہ کا منہ دیکھتا تھا اور رسمی نوشت وخواند کے بعد پندرہ سولہ برس کی عمر میں اس کی شادی کر دی جاتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ راحت پسند اور عیش طلب بن جاتا تھا، اس کے دل میں بجز اس کے اور کوئی تمنا نہیں ہوتی تھی کہ کسی سفارش یا خوشامد و رشوت سے کوئی سرکاری ملازمت حاصل کرلے۔ مگر اب ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت اعلیٰ پیمانہ پر غیر ملکی درسگاہوں میں ہوتی ہے، جہاں انھیں صنعت وحرفت کی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہی نوجوان جب تکمیل تعلیم کے بعد اپنے وطن کو واپس آتا ہے تو اس کے دل میں تیل کے سلسلہ میں کام کرنے کی امنگ اور شاہ کی ذات پر یقین ہوتا ہے۔ اب ایران کا ہر تعلیم یافتہ نوجوان یہ محسوس کرتا ہے کہ ایران کو اس غیر محدود خداداد خزانہ کے استفادہ سے محروم کر دیا گیا ہے جو لُرستان کی سنگلاخ زمین میں مدفون ہے۔

شاہ کو تنظیم عسکری کا خاص شوق ہے۔ پہلے فوج پینتیس ۳۵ ہزار تھی مگر اب اس کی تعداد ساٹھ ہزار کر دی گئی ہے۔ ایران کی موجودہ تاریخ میں یہ پہلا دور ہے کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسافروں کے جان ومال کو کوئی خطرہ نہیں۔ رضا شاہ ایران کی بحری اور فضائی قوت کو بھی نشو ونما دے رہے ہیں۔ اگر یہ شہریار زندہ رہا تو دیکھئے ایران کو کس قدر چار چاند لگاتا ہے۔

اینگلو پرشین آئل کمپنی کا بانی

ولیم ناکس ڈی آرسی ٹیوٹن ابٹ میں ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوا جہاں سے اس کا باپ اُسے سترہ برس کی عمر میں آسٹریلیا لے گیا۔ وہ راک ہیمٹن کوئینس لینڈ میں تھا کہ ایک کسان اُس کے پاس اپنے کھیت سے پتھر کے کچھ ٹکڑے لایا اور دریافت کیا کہ یہ کیا چیز ہے۔

ڈی آرسی نے فوراً جواب دیا کہ پتھر میں سونے کے ریزے موجود ہیں۔ اس انکشاف کا یہ نتیجہ نکلا کہ ڈی آرسی کو آسٹریلیا کی نہایت دولتمند مونٹ مارگن منکشفہ معدنیات کمپنی میں اس انکشاف وتحقیقات کے صلہ میں ایک حصہ مل گیا۔ اور ڈی آرسی کو اپنے اس حصہ سے دس لاکھ پونڈ یا ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ منافع حاصل ہوا اور وہ ایک دولتمند آدمی ہو گیا۔ اُس نے اپنا کام ترک کر دیا، اور اپنی بیوی کے ساتھ تمام دنیا کی سیر وسیاحت شروع کی، آدمی اگرچہ متمول تھا لیکن اُس کے پاس کوئی کام یا مشغلہ نہ تھا۔ وہ کام جس سے اُس کی قسمت کا ستارہ چمکا اور کافی دولت حاصل ہوئی وہ ترک کر چکا تھا۔ اب بیکاری اُس

کے لئے عذاب جان ثابت ہونے لگی اور اُس نے سوچا کہ پھر کوئی کام شروع کرے۔ اتفاقاً اُسی زمانہ میں اُس کی ایک نوجوان ایرانی سے ملاقات ہوئی جس نے ڈی آرسی سے برسبیل تذکرہ کہا کہ اُس کے وطن میں تیل کے ذخائر ہیں۔ یہ سنکر ڈی آرسی نے ایران جاکر تیل کے چشموں کے انکشاف کا تہیہ کر لیا۔

اس ابتدائی تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ سنہ ۱۹۰۱ء میں ڈی آرسی نے شاہ ایران سے درخواست کی کہ اُسے اس علاقہ میں جہاں تیل کے ذخائر موجود ہیں تین سو میل تک زمین کھودنے اور تیل کے چشموں کے نکالنے کا ٹھیکہ مرحمت فرمایا جائے۔ الغرض اُسے ساٹھ برس کے لئے یہ ٹھیکہ حاصل ہوگیا۔

اب اُس نے مٹی کا تیل نکالنا یا دوسرے معنوں میں مٹی سے سونا نکالنا شروع کر دیا۔ اُس نے میدان نفت میں ڈیرا ڈال دیا اور مسجد سلیمانیہ کے آثار قدیمہ میں جو بالکل ویران پڑا ہوا تھا تیل کے چشمے نکالنے شروع کئے۔ کوشش کے ابتدائی دور میں اُسے دشواریوں اور مایوسیوں کا بھی سامنا ہوا خاصکر اس وجہ سے کہ تیل کے نقل و حمل کے لئے سوائے خچر اور اونٹ کے دوسرا کوئی ذریعہ باربرداری کا نہ تھا۔

اول دو تین سال میں اُس نے تین لاکھ پونڈ صرف کئے لیکن اتنی دولت صرف کرنے کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ مایوس ہوکر وہ اپنی اس مہم کو ترک کرنے ہی والا تھا کہ لارڈ اسٹریتھ کونا برما آئل کمپنی کے افسر اعلیٰ اور دیگر لوگ اُس کی امداد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی امداد کے سہارے پر ڈی آرسی نے صبر و استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا یہاں تک کہ مئی سنہ ۱۹۰۸ء میں ایک دن ایسا آیا کہ بختیاری علاقہ کے ویرانہ میں تیل کا ایک بہت بڑا چشمہ برآمد ہوا، اب اُس کو محسوس ہوا کہ اُس کی قسمت دوسرا خوشگوار پلٹا لے رہی ہے۔

اِس چشمہ سے اس قدر نفع ہوا کہ اوسی سال اینگلو پرشین آئل کمپنی قائم ہوگئی جس کے صدر لارڈ اسٹریتھ کونا مقرر ہوئے اور مسٹر ڈی آرسی اس کمپنی کے ڈائرکٹر منتخب کئے گئے۔ اب چشمے پر چشمے مختلف مقامات پر نکلنا شروع ہوئے، اور ایک دس انچ کی پائپ لائن اس ویران حصۂ ملک میں ایک سو تین میل تک قائم ہوگئی۔ سر جان کیڈمین تیل کے ایک بہت بڑے ماہر اس زرخیز مہم کو ترقی یافتہ حیثیت دینے کے لئے برائے امداد روانہ کئے گئے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں اس کمپنی کا اصل بانی ڈی آرسی اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سو گیا اور اُس کی موت کے ساتھ ہی ساتھ برطانوی گورنمنٹ نے اس کمپنی کے پچھتر لاکھ پونڈ کے حصے جو کمپنی کے نصف سرمایہ کے برابر تھے خرید لئے۔

(ماخوذ)

عالمِ نسواں

ہندوستان کی عورتوں کو عنقریب ہی نئے آئین ملکی میں ووٹ کا حق ملنے والا ہے جس کے لئے بیگم شاہنواز صاحبہ مسلسل تین سال سے کوشش کر رہی ہیں۔ آپ واحد ہندوستانی خاتون ہیں جنھوں نے لندن کی تینوں گول میز کانفرنسوں میں شرکت فرمائی۔ اس مسئلہ میں اب صرف اس قدر طے ہونا باقی ہے کہ حق رائے دہی کے لئے عورتوں میں کیا خصوصیات ہونا چاہیئے۔ گول میز کانفرنس نے اتفاق رائے سے لوتھین کمیشن کی سفارشات منظور کر لی ہیں، یعنی اس بارے میں جو شرائط مردوں کے لئے مقرر ہوں وہی عورتوں پر عائد ہوں۔ اس تجویز پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا کہ عورتوں میں تعلیم کا معیار کم رکھا جائے۔ اگر عورتوں کے لئے بھی اعلیٰ تعلیم کی شرط عاید کی گئی تو بہت ہی کم عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہو سکے گا۔ عام رائے یہ ہے کہ عورتوں کے لئے صرف خواندہ ہونا کافی ہونا چاہیئے۔ اس طرح گھروں کے اندر تعلیم حاصل کر لینے والی عورتیں بھی حق رائے دہی سے مستفیض ہو سکیں گی۔ بیگم شاہنواز نے جو آل انڈیا ومنس کانفرنس کی ترجمان ہیں اصولاً تمام بالغہ عورتوں کے لئے حق رائے دہی ملنے کا مطالبہ کیا ہے اور وہ اس کے خلاف ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے لئے مختلف شرائط ہوں بہر نوع اگر ملکیت کی شرط عورتوں کے لئے بھی رکھدی گئی تو ہندوستان بھر میں صرف پچیس لاکھ عورتوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہو سکیگا۔ دیکھئے گورنمنٹ برطانیہ کا فیصلہ اس معاملہ میں کیا صادر ہوتا ہے۔

حال میں مسٹر ڈبلیو۔ جی۔ لیسی نے پٹنہ یونیورسٹی میں بہار واڑیسہ کی مردم شماری کے بعض پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے چند ریمارک ایسے بھی کئے جو عالم نسواں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی رائے ہے کہ ملک میں گذشتہ دس برس کے اندر عورتوں کی پوزیشن میں نمایاں تغیر ہو گیا ہے جس کی وجہ توسیع تعلیم نسواں، سیاسیات میں عورتوں کا مزید انہماک اور مغربی تہذیب کے اثرات ہیں۔ یورپ کی سیر و سیاحت کرنیوالوں کے علاوہ اب وہ لوگ بھی جو کبھی ہندوستان سے باہر نہیں نکلے یہی چاہتے ہیں کہ ان کی دلہنیں شائستہ اور تہذیب یافتہ ہوں اور وہ رکاوٹیں جو عورتوں کی راہ ترقی میں اب تک حائل تھیں رفع ہو جائیں۔ البتہ معدودے چند دقیانوسی خیال کے لوگ ابھی تک بدستور لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔

یہ خبر نہایت مسرت سے سنی جائیگی کہ انجمن نسواں لکھنؤ (لکھنؤ وومنس ایسوسی ایشن) نے ہندوستانی خواتین کو انگریزی، ہندی، اُردو، سوزن کاری، نقاشی وغیرہ سکھانے کے کلاس کھول دیئے ہیں جن میں یہ سب باتیں بلا فیس سکھائی جاتی ہیں اور ایسوسی ایشن مذکور نے پردہ کا بھی انتظام کیا ہے۔ اس مدرسہ میں ہر قوم ہر طبقہ اور ہر پوزیشن کی عورتیں داخل ہو سکتی ہیں اور غریبوں کو درسی کتب اور اسٹیشنری بھی مفت دی جائیگی۔ ہفتہ میں دو بار سوموار کو چار بجے سے چھ بجے شام تک بمقام بیرتاب لواس شاہ نجف روڈ لکھنؤ میں اور جمعرات کو زنانہ پارک امین آباد لکھنؤ میں سبق دیئے جاتے ہیں۔

ان کلاسوں میں مندرجہ ذیل خواتین نے درس دینے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی ہے:-

لیڈی وزیر حسن۔ مسز ڈبلیو۔ ایچ۔ ولیس۔ مسز الٰہی بخش۔ مسز بھارگو۔ مس پی۔ بھاٹیہ۔ مس سیتاوتی۔ مس ایس مجید حسن۔ بیگم رضا۔ اور بیگم علی ظہیر۔

بمبئی کی دو خاتونوں (مس بیا بائی جوگ اور مس مینا بائی جوگ) کو سنگتراشی میں کمال حاصل کرنے کے صلہ میں بنگلور۔ ٹراونکور اور بمبئی کی نمائشوں سے طلائی تمغے اور سرٹیفکیٹ عطا کئے گئے ہیں۔

پچھلے ماہ سرانل چندر چٹرجی کی اہلیہ محترمہ نے بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے وکالت کی سند حاصل کرلی ہے۔

مس سیتادیوی داس بیرسٹرایٹ لا جو مسٹر داس ریٹائرڈ ہائیکورٹ جج مدراس کی دختر نیک اختر ہیں پریکٹس کرنے کے لئے کائمبٹور بار میں شامل ہوگئی ہیں۔

صوبہ بنگال میں حال ہی میں سترہ خاتونیں آنریری مجسٹریٹ مقرر کی گئی ہیں۔

حال میں بمقام بنارس یو۔ پی میشوری کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت کے لئے شریمتی کملادیوی ایلورید وشارد اجمیری کا انتخاب ہوا تھا۔ اس صوبے میں غالباً یہ پہلی تمدنی کانفرنس ہوئی ہے جس میں ایک لیڈی نے صدارت کی۔

ایجاد و اختراع کے میدان میں بھی عورتیں مردوں سے پیچھے نہیں، چنانچہ پچھلے سال انگلستان میں عورتوں نے مندرجہ ذیل ایجادیں پیٹنٹ کرائیں

(۱) آلو آسانی سے چھیلنے کا آلہ (۲) موم بتی بنانے کی مشین (۳) ایسی کھڑاؤں جو چلنے والے کے بوجھ سے خود بخود چلتی ہیں۔ (۴) شعلوں کے خطرناک صورت اختیار کرنیکی حالت میں گیس کا سلسلہ خودبخود کاٹ دینے والی مشین

معرکۂ حسن و عشق

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی، بی اے)

صبحِ طرب تھی آشکار، عہدِ فراق خواب تھا
طرّہ کشائے صد بہار، جلوۂ بے نقاب تھا

سنبل و گل چمن چمن، موجِ صبا شکن شکن
خون رگوں میں جوش زن، مثلِ شرابِ ناب تھا

اوس میں ڈوبے پھول تھے، چھلکے ہوئے ایاغ میں
پھول جو تھا گلاب کا، شیشۂ پُر گلاب تھا

یادِ سحر کی مستیاں، غنچوں کی نرم سسکیاں
ایک سے ایک ملتفت، کہنے کو اجتناب تھا

خندۂ گل کی التجا، نالۂ عندلیب میں
نالۂ عندلیب کا خندۂ گل جواب تھا

پھوٹ رہی تھیں کونپلیں، جھوم رہی تھیں ڈالیاں
موجِ ہوا میں سر بسر کیفِ مئے شباب تھا

نشے میں ڈھونڈھنے لگا، ساز، مغنیِ نمو
شاخ جو تھی وہ چنگ تھی، برگ جو تھا رباب تھا

ایک طرف تھی آبجو کھولے ہوئے کنارِ شوق
خیرہ مثالِ چشمِ گل، دیدۂ ہر حباب تھا

ایک طرف تھیں چشمکیں ساقیِ شوخ و شنگ کی
جام کی گردشیں نہ تھیں، دَور میں آفتاب تھا

حسنِ کرشمہ ساز ادھر، محوِ غرورِ دلبری
عشقِ خلش نواز ادھر، پیکرِ اضطراب تھا

آنکھیں جو چار ہوگئیں، جیسے قیامت آگئی
تیوری تھی چڑھی ہوئی، زلف کو پیچ و تاب تھا

عشق نے اک نگاہ میں بھر دیا جذب اس قدر
حسنِ ستیزہ جو تھا شرم سے آب آب تھا

ماتھے پہ کچھ عرق بھی تھا، کانپ رہے تھے ہونٹ بھی
باطنی اضطراب کا، چہرہ کھلی کتاب تھا

نظروں میں تمکنتیں بھی تھیں اور ملامتیں بھی تھیں
وعدۂ مہر تھا کبھی، اور کبھی عتاب تھا

نام کو تھا بس امتیاز، حسن میں اور عشق میں
ناز تھا سر بسر نیاز، پردہ فقط حجاب تھا

معرکہ ختم یوں ہوا، فتح شکست ہوگئی
عشقِ نبرد آزما اپنے پہ فتحیاب تھا

نظریں جو اٹھ کے رخ پہ تھیں سوئے زمیں وہ جھک گئیں
آنکھوں میں تھے سرشکِ غم، سینے میں دل کباب تھا

پھر تھی وہی فسردگی، پھر وہی درد و خستگی
دل کہ تھا جلوہ گاہِ دوست، غمکدۂ خراب تھا

پھر وہی آہ آہ تھی، پھر وہی دورِ ابتلا
پھر وہی سوزِ ہجر تھا، پھر وہی التہاب تھا

جوشِ جنوں میں یا کبھی لب پہ یہ مصرعِ آخر
"صبحِ بہار وہم تھی، عہدِ نشاط خواب تھا"

کلام نظم

(از حیدر یار جنگ صاحب نظم طباطبائی)

مسکرانے سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے ۔ بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے
گرد میں قافلۂ نکہت گل کی سمجھا ۔ دیکھکر رنگ پریدہ کو گلستانوں کے
آتش افروز ہوئی برق صدائے مطرب ۔ نغمۂ نے نہیں شعلے ہیں نیستانوں کے
لذت نغمہ سے ہوتی نہیں زحمت محسوس ۔ ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے
اوج پر اپنے بہت ہفت فلک ہیں نازاں ۔ میں سمجھتا ہوں بگولے ہیں بیابانوں کے
آزمانے کو جو ابنائے زمانہ کے اُٹھا ۔ دیو بھی مجھکو ملے بھیس میں انسانوں کے
لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجھکو ۔ پہرے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ارباب کمال ۔ حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے
خوانِ نعمت پہ ہجوم اہل ہوس کا ہے عبث ۔ من و سلویٰ نہیں حصہ میں مگس رانوں کے
اُسکی محفل میں خبر کچھ دلِ مضطر کی نہیں ۔ لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا پروانوں کے
مجکو حیرت ہے کہ رخسار تو لو دیتے ہیں ۔ اور مرجھاتے نہیں پھول ترے کانوں کے
کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ ۔ خاک ہی خاک ہے دامن ہیں بیابانوں کے
ڈال دی نالۂ پُر درد نے اُس میں بھی کمند ۔ کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے
جلد اے بادِ مراد آ کہ ہے کشتی اپنی ۔ منہ میں گرداب کے آغوش میں طوفانوں کے
چاہئیں عرش کے مضمون غزل میں اے نظم ۔ ساتھ ہی اس کے مضامین پرستانوں کے

جلوۂ کن فیکوں ہے ترے فرمانے سے ۔ کیا کمی ہوگی تمنا مری بر لانے سے
اُس طرف عرش کے ہے منزل مقصود اپنی ۔ رہ گیا میں کشش ارض کے آجانے سے
آکے تو بیٹھ یہاں کام نہیں ناصح کا ۔ میں سمجھ جاؤنگا سب کچھ ترے سمجھانے سے

آنکھ تھی محو تماشا کہ گری اک بجلی — برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے
زیست کا لطف گیا ساتھ دلِ زندہ کے — جل گیا نخل بھی اک پھول کے کمھلانے سے
چشمِ بینا کو نظر آتے ہیں اسرارِ نہاں — پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے
سرکشی نفس کی ہے، باعثِ بیتابیِ دل — لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے
تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفسِ زبوں — شعلے اٹھنے لگے آخر ترے بھڑکانے سے

داد لیتا ہوں میں اے نظم نواسنجی کی
ابر کے جھومنے سے۔ بحر کے لہرانے سے

کلامِ محروم

(از منشی تلوک چند محروم بی اے)

سُرورِ عاشقی بعدِ فنا بھی ہولشِ جاں ہے — کہ صحرا کے بگولوں میں غبارِ قیس رقصاں ہے
یہ حیرت خانۂ دنیا طلسمِ حُسنِ پنہاں ہے — وہی کچھ مطمئن اس میں نظر آیا جو حیراں ہے
چراغِ زندگی روشن سرِ راہِ بیاباں ہے — ہوائے دہر کا ہر ایک جھونکا دشمنِ جاں ہے
چمن اندر چمن حُسنِ جہاں افروز ہے تیرا — مگر وائے! مری منزل بیاباں در بیاباں ہے

مری افتادگی پر رحم کر اے حُسنِ بے پروا
عروج آموز ذرّے کو شعاعِ مہرِ تاباں ہے!

رُباعیات

انجامِ حیات اب نظر آتا ہے — معلوم نہیں بُرا ہے یا اچھا ہے
کی عمر تمام شاعری میں ہم نے — باتوں باتوں میں یہ سفر کاٹا ہے

شوقِ رسوا، نہ ہے جوانی باقی — کم تر ہے نشاطِ زندگانی باقی
یہ قصہ بھی اب تمام ہونیکو ہے — تھوڑی سی ہے اور عمرِ فانی باقی

لطفِ سخن

حال میں حیدرآباد دکن میں ایک عظیم الشان مشاعرہ عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم ریاست کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں نامور مقامی شعرا موجود تھے۔ دل بنا۔ قابل بنا۔ طرح تھی۔ مگر محمل، قابل ساحل یہ تین قافیئے خاص طور پر معرکۃ الآرا ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک مہربان نے ناظرین زمانہ کی ضیافت طبع کے لئے اس مشاعرہ کا انتخاب ارسال فرمایا ہے جو درج ذیل ہے۔

(عالی جناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد)

مختلف جلووں کا مرکز عشق میں یہ دل بنا ۔۔۔ یہ کبھی مجنوں، کبھی لیلے۔ کبھی محمل بنا
کس قدر ذوقِ فنا ہے مد و جزر عشق میں ۔۔۔ جب بڑھا دریا بنا جب گھٹ گیا ساحل بنا
پوچھتے کیا ہو حقیقت مجھ سے دردِ عشق کی ۔۔۔ میرا ہی دل تھا جو اس کے رہنے کے قابل بنا

(نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز)

ناخدا کی کیا ضرورت جب محافظ ہے خدا ۔۔۔ جس جگہ ڈوبی مری کشتی وہیں ساحل بنا
دیکھنی ہو گر لیاقت مانی وبہزاد کی ۔۔۔ پہلے اپنے آپ کو تصویر کے قابل بنا
کچھ ہجوم یاس اپنا مانعِ دیدار تھا ۔۔۔ کچھ غبارِ راہ اُڑ کر پردۂ محمل بنا

(نواب اصغر یار جنگ بہادر اصغر)

خون کی ندی بہی دل سے تو دریا دل بنا ۔۔۔ ہر لبِ زخم جگر اپنا لبِ ساحل بنا
یہ تکلف ہے کسی پردہ نشیں کے واسطے ۔۔۔ اپنا اِک اِک پردۂ دل پردۂ محمل بنا

(جناب آزاد انصاری)

جب اُبھارا ہے تو ملنے قرب کی حد تک اُبھارا ۔۔۔ جب بنایا ہے تو اپنے لطف کے قابل بنا

(نواب اکرم الدین خاں بہادر اکرم)

کثرتِ اشکِ ندامت سے بھی ہے تر دامنی ۔۔۔ میرے آنسو پونچھنے سے دامنِ ساحل بنا

(جناب امید شاہ نظامی)

ہوتے ہوتے ہوگئی لفظ و معانی کی تمیز میں کہیں قطرہ کہیں دریا، کہیں ساحل بنا

(جناب آلم حیدرآبادی)

سیر گر عمرِ رواں کی دیکھنی منظور ہے جا کسی دریا پہ گھر اپنا لبِ ساحل بنا
ایک مدت کی ریاضت، سالہا کی بندگی جب کہیں بندہ ترے الطاف کے قابل بنا

(جناب اجلال حیدرآبادی)

ڈوبنے والا تھا میں، دریا چڑھا میرے لئے جس کی ہمت پست تھی اس کے لئے ساحل بنا

(سید امین احسن صاحب تبسل)

اعترافِ جرم میں پنہاں ہیں خطا روایاں میں کہاں قابل ہوا، یہ کہنے میں قابل بنا

(جناب تاغ صاحب)

چاہیئے کچھ تو پتہ اے بحرِ الفت کے غریق نام کا اپنے نشاں ملکر سرِ ساحل بنا
عصمتِ لیلےٰ کی تھی خاکِ قیس بھی ہی پاسباں جو غبار اُٹھتا گیا وہ پردۂ محمل بنا

(جناب باقی ایم۔اے۔ (عثمانیہ)

خود نکل آئے گا دریا سے کنارِ عافیت اپنی ہر موجِ نظر کو تشنۂ ساحل بنا
چشمِ مجنوں درحقیقت جب ہوئی لیلےٰ پرست ذرہ ذرہ خاک کا اک پردۂ محمل بنا

(جناب شہرت صاحب)

بیخودیِ عشق میں صحرائے حسرت دل بنا مدعا مجنوں بنا، لیلےٰ بنا، محمل بنا

(جناب فرحت دہلوی)

وائے ناکامی کہ لیلیٰ پہلے ہی محمل میں تھی گرد رہ سے گردِ مجنوں اوڑ اک محمل بنا
بے وفائی اس کی ہے یک بحرِ ناپیدا کنار تو وفا سے دوسرا دریائے بے ساحل بنا

(جناب فدائی صاحب حیدرآبادی)

ٹھوکریں کھا کھا کے سر سے خودسری جاتی رہی اب کہیں دل آستانِ یار کے قابل بنا

(جناب تمہید حیدرآبادی)

قیس کو کچھ بھی نظر آیا نہ لیلےٰ کے سوا یعنی ہر ذرہ نگاہِ شوق میں محمل بنا
بحرِ الفت میں چلی بادِ مخالف اس طرح بادبانِ کشتیِ دل لوٹ کر ساحل بنا

(نواب نجیب الدین خاں بہادر نجیب)

ماننا ہوں تجھ کو اللہ نے بنایا ہے حسیں جیسی صورت ہے تری سیرت بھی اس قابل بنا

(نواب تراب یار جنگ بہادر سعید)

لاکھ ہو افسردگی، ہے رقصِ بسمل بھی ضرور دل کو پہلو میں نگاہِ ناز کے قابل بنا

نوائے راز

(از جناب ابو الفاضل راز چاندپوری)

حدِ امکاں تک تو بیشک کام ہے تدبیر کا
اس سے آگے جو مقدر ہو مری تقدیر کا

اُف! یہ نازِ بے نیازی حُسنِ عالمگیر کا
واہ کیا کہنا جنابِ عشق کی تقدیر کا

الاماں یہ جوش، ملے آہ رسا بس جسم کر
معترف ہوں روزِ اول سے تری تاثیر کا

کہہ چکا ہوں، عظمتِ منزل کی کچھ پروا نہیں
راہبر! تجھکو تو گویا خبط ہے تقریر کا

کون ہے یہ سر بسجدہ آستانِ غیر پر
غالباً کوئی مسافر منزلِ تدبیر کا

تیرے صدقے، تیرے قرباں ساقیِ میکش نواز
دیکھ تو کیا وقت ہے، یہ وقت ہے تاخیر کا؟

بندۂ تسلیم ہوں، جائے ادب ہے، کیا کہوں
جائزہ لیتے ہیں اب وہ دفترِ تقصیر کا

رازؔ یہ دشتِ جبل پور اور مَیں، اب کیا کہوں
اِک کرشمہ ہے نگاہِ شاہدِ تقدیر کا

(از پروفیسر ڈپٹی لال صاحب انجم ایم اے)

خلق جلوہ سے شاد کام ہوئی
یار کی بزم بزمِ عام ہوئی

منتظر ہوں کہ کب وہ آتے ہیں
دن ہوا ختم اور شام ہوئی

صبح سے اہتمامِ آمد ہے
شام بھی نذرِ انتظام ہوئی

روز اُمیدِ وصل میں رہنا
عمر یونہی غرض تمام ہوئی

علمی خبریں اور نوٹ

آجکل ترکوں کو ترکی زبان سکھائی جا رہی ہے چنانچہ حال ہی میں مصطفےٰ کمال پاشا نے یہ فرمان جاری کیا ہے کہ ترکی زبان میں جو غیر ترکی الفاظ شامل ہو گئے ہیں اُن کو خارج کر کے اُن کے بجائے ٹھیٹ ترکی الفاظ استعمال کئے جائیں۔ لیکن چونکہ ترکی زبان میں فارسی اور عربی الفاظ بکثرت شامل ہو گئے ہیں اس لئے اب ان کے بجائے پُرانے اور متروک ترکی الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر رکھے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بعض حامیان اُردو اس کے برعکس اُردو زبان میں عربی فارسی کے ادق الفاظ اور نامانوس ترکیبیں داخل کر رہے ہیں جس سے اُردو زبان کی ہر دلعزیزی میں فرق آرہا ہے!

انگلستان کے نامور مصنف جان گالزوردی اپنے نوبل پرائز کی رقم کو جسکی تعداد نو ہزار چھ سو پاؤنڈ ہے بذریعہ وصیت ایک ادبی انجمن کو دے گئے ہیں جسکے صدر خود گالزوردی تھے اور جسکی دُنیا میں پچاس شاخیں موجود ہیں۔ اس انجمن کے بند ہو جانے پر یہ رقم رائل لٹریری فنڈ کو دیدی جائیگی۔ گالزوردی کا ۳۱ جنوری گذشتہ کو انتقال ہو گیا ہے اور زمانہ میں کسی دوسری جگہ ان کے متعلق ایک ایڈیٹوریل مضمون بھی زیب رسالہ ہے۔

اعلیحضرت نظام دکن نے مولوی آرشد تھانوی صاحب وکیل بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کی قدر دانی میں دُو سو روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔

آجکل تمام دنیا کے ملک اپنی اپنی ملکی زبانوں کو ترقی دینے کی فکر میں منہمک ہیں، چنانچہ پچھلے دنوں شاہ عراق نے بھی ایک فرمان کے ذریعہ اپنے ملک کے سرکاری محکموں کو ہدایت کی ہے کہ وہ آیندہ سے دفاتر میں صرف عربی زبان استعمال کریں اور انگریزی کو بالکل ترک کر دیں۔

برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے سال [illegible] باوجود اس سوسائٹی نے ہندوستان میں سال گذشتہ کی بہ نسبت ایک لاکھ زیادہ بائبلیں فروخت و تقسیم کیں۔

معلوم ہوا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو صاحب آجکل جیل میں تمام دنیا کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں

مغربی ممالک کے اخبارات کی ترقی کی داستان ہندوستانیوں کیلئے خاص طور پر سبق آموز ہے۔ مثلاً ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں انگلستان کے مشہور اخبار ڈیلی میل کی سترہ لاکھ پینتیس ہزار چھ سو باون اور اخبار ڈیلی ایکسپریس کی سولہ لاکھ ۴۰ ہزار ایکسو چھپن کاپیاں فروخت ہوئیں۔ انگلستان کے بعض ہفتہ وار اخبارات ایسے ہیں جنکی اشاعت دس لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ مثلاً نیوز آف دی ورلڈ کی اشاعت تیس لاکھ کے قریب بتلائی جاتی ہے۔ اس پر ہفتہ وار اسقدر کاغذ خرچ ہوتا ہے کہ اگر اسکے کاغذ کے تختے زمین پر بچھا دیئے جائیں تو آٹھ ہزار پانچسو میل طولانی سڑک تیار ہو جائے۔ ان اعداد و شمار کے لحاظ سے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی حالت بہت کچھ اصلاح و توجہ کی محتاج ہے۔ مگر جبتک عوام ملک تعلیم یافتہ و خوشحال نہ ہونگے اُسوقت تک ملکی پریس کی یہی حالت رہیگی۔

افسوس کہ اُردو کے مشہور نثار و شاعر حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کا پچھلے ماہ بمقام دہلی انتقال ہو گیا آپ دو سال سے فالج میں مبتلا تھے اور نقل و حرکت سے عاری ہو گئے تھے۔ مگر کہتے ہیں کہ زندہ دلی اور دہلی کی آن آخر تک باقی رہی۔ انکے مضامین رسالہ مخزن لاہور اور بعض دیگر رسالوں میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپکی تحریروں میں دہلی کی صاف و شستہ روزمرہ کی شان پائی جاتی تھی اور طرز بیان صاف و سلیس تھا جیل خانہ دہلی کے سامنے نئے قبرستان میں آپ مدفون ہوئے۔ آپکی وفات سے اُردو کا ایک دیرینہ خادم اُٹھ گیا۔

پنڈت مہابیر پرشاد صاحب دویدی سابق ایڈیٹر سرسوتی الہ آباد اپنی بیش بہا زندگی کے پچیس سال نہایت ایثار و بے لوثی سے ہندی کی خدمت میں بسر کر چکے ہیں۔ آپنے جدید ہندی لٹریچر کی تعمیر میں نہایت گرانقدر اور قابل یادگار خدمات انجام دی ہیں مگر مسلسل جانفشانی و دماغ سوزی سے خستہ ہوکر اب آپ گوشہ نشین ہو گئے ہیں سنہ ۳۳ء مئی میں آپکی سترھویں سالگرہ ہونیوالی ہے چنانچہ اسکے اعزاز میں ناگری پرچارنی سبھا بنارس کیطرف سے ایک شاندار یادگاری کتاب شائع کیجائیگی جو اعلیٰ درجہ کی ادبی خوبیوں کا خزانہ ہوگی۔ اس موقع پر ہندی کی ایک ادبی نمائش منعقد کرنیکی بھی کوشش ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن
آپ اور آپ کے بچے استعمال کریں
(REGD.)
(REGD.)

ترکی جمہوریہ
یعنی ترکی کی نشاۃ ثانیہ کا تجزیہ ترکوں پر مغربیت کا اثر کیونکر ہوا۔ ترکی کا اولین زمانہ، جنگ عظیم میں شرکت، خلافت اور سلطانیت کا تجزیہ۔ اور جمہوریت کا قیام۔ سیاست۔ یہ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں پڑھیں۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ
مولانا مرحوم کی زندگی کے تمام و کمال لکھے گئے ہیں۔
طباعت و کتابت نہایت عمدہ۔
دیوان غالب (جرمنی)
تمام کتابوں میں سب سے زیادہ خوبصورت کتاب
اور قیمت میں انتہائی تخفیف
یعنی
تلاش حق (دو حصے)
نفسیات شباب
کیمیاگر
مختصر افسانوں کا یہ ایک اچھا مجموعہ ہے پڑھنے والا ان افسانوں میں اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نظر آئے گا۔ اپنے اخلاقی اور ادبی محاسن کی بنا پر اردو میں یہ ایک نئی چیز ہے۔
قیمت ایک روپیہ
صید زبوں
ایک اچھا ڈرامہ ہے جس میں عورتوں کی حالت دکھائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ "خلع" ایک اہم مسئلہ ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی اس قانون کا باقاعدہ اجرا ہونا چاہیے۔
قیمت
مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم بی اے

جلد ۶۰	مارچ سنہ ۱۹۳۳ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

تصویر:- اکبر اعظم کا دربار

نامی پریس کانپور سے شائع ہوا

اکبر اعظم کا دربار

زمانہ

جلد ۶۰ | مارچ سنہ ۱۹۳۳ء | نمبر ۳
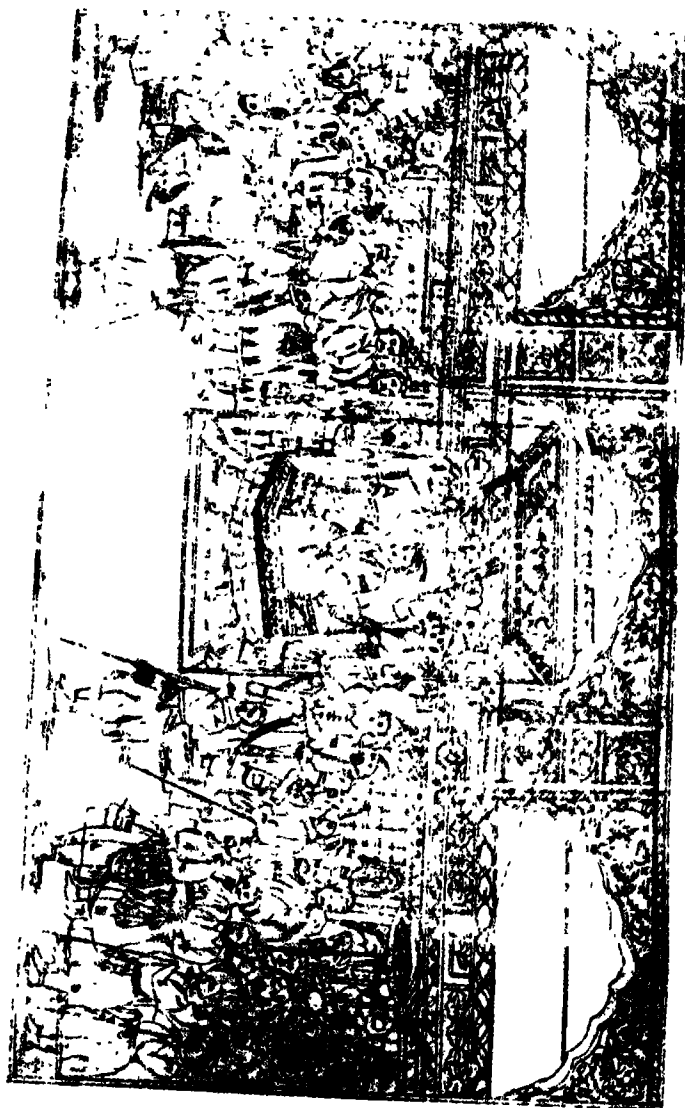
مرزا رسوا مرحوم

(از مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

مرزا صاحب کی شاعری

مرزا صاحب کو شاعری کا شوق بچپنے سے تھا، مثنوی امید و بیم میں کہتے ہیں ؎

چار دن سے نہیں یہ شوقِ سخن — بچپنے سے ہے مجھے ذوقِ سخن
قدر دانوں میں ہے عزت میری — نکتہ سنجوں میں ہے شہرت میری
مجکو پہچانتے ہیں اہلِ ہنر — جوہری جانتے ہیں قدرِ گہر
لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں مجھے — آرزوؤں سے بلاتے ہیں مجھے
رونقِ بزمِ سخن ہے مجھ سے — زینتِ صحنِ چمن ہے مجھ سے

ابتدائے عمر میں ایک بزرگ مرزا دبیر صاحب مرحوم کی خدمت میں لے گئے، اُنھوں نے بلحاظ مناسبت عمر مرزا محمد جعفر صاحب اَوج سے تعارف کرا دیا صرف دو تین غزلیں دکھائیں اسکے بعد مشورہ رہا۔ مرزا کی زبان موجودہ شعرا میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی جس قدر محاورات پر اُن کو عبور تھا ایسی کوئی ہستی آج شعرا میں نظر نہیں آتی۔ اسکا سبب اُنکے فطری ذوق کے علاوہ اُنکی ہمہ دانی اور مختلف صحبتیں تھیں۔ ایک طرف اہلِ علم کے ساتھ علمی معاشرت، دوسری طرف لکھنؤ کے مختلف طبقات سے تعلقات، مرزا اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے، قصائد بھی کہے، مثنویاں بھی کہیں، غزل بھی کہی، نظم و نثر دونوں پر ایک طرح قادر تھے

مگر نظم سے زیادہ نثر لکھی اور ایسی لکھی کہ آج اُن کی کتابیں زبان اُردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔

مرزا کا کلام اگر جمع کیا جاتا تو ایک ضخیم کلیات ہوتا مگر انکی بے اعتنائی اور بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ غزل کہی اور پھینک دی یا کسی نے مانگی تو وہی مسودہ اوسکو دیدیا۔ کلام جو کسی نے لیکر چھاپ دیا وہ تو چھپ گیا ورنہ خود او خواہ انہوں نے نہ کبھی چھپوایا نہ جمع کیا۔ خدا بخشے حکیم علی حسن خاں آبر مرحوم کو جن کی سعی و کوشش سے آج مرزا کی چند غزلیں بھی دستیاب ہوسکیں۔ آبر مرحوم جس زمانے میں معیار نکالتے تھے تو مرزا صاحب کی خدمت میں برابر جایا کرتے تھے اور معیار کی ہر طرح میں اون سے کسی نہ کسی طرح غزل کہلوانے کی کوشش کرتے چنانچہ اس مضمون میں اکثر غزلیں معیار کے مختلف نمبروں سے لیگئی ہیں۔

غزلیات کے علاوہ "مراسلہ مرزا" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون فلسفہ شعر کے متعلق معیار میں شائع ہوا کرتا تھا۔ مرزا صاحب کی بے پروائی کا عالم دیکھکر مرزا اوج صاحب مرحوم نے آپ کا کلام جمع کرنا شروع کیا۔ مسودات مرزا صاحب سے لے لیتے تھے اور اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے مگر افسوس بقول اُن کے صاحبزادے مرزا محمد طاہر صاحب رفیع کے وہ سب ذخیرہ ضائع ہوگیا۔

شاعری مرزا صاحب کا خاص مشغلہ نہ تھا بلکہ تفنن طبع اور مشاغل تفریح میں داخل تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ:-

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

میرے نزدیک لکھنؤ میں اونکی ذات بحیثیت ایک مجدد فن کی تھی اُنکی شاعری کا آغاز اُس وقت ہوا جب لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے ترانے گونج رہے تھے اور محفلوں پر وہی رنگ چھایا ہوا تھا اس وقت سب سے پہلے جس شخص نے ترمیم کی وہ مرزا کی ذات تھی اور یہ سہرا اونھیں کے سر رہا۔ اونکی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے اس رنگ کو اختیار کیا۔ مگر غالب کے رنگ میں جس قدر کامیابی مرزا کو حاصل ہوئی کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مرزا نے زبان میں تقلید نہیں کی بلکہ خیالات و طرز ادا میں غالب کا تتبع کیا دوسروں نے فقط زبان اور فارسی ترکیبوں میں تقلید کی۔ مرزا نے ابتدا میں مدتوں غالب کا کلام سامنے رکھکر فکر سخن کی جس طرح کوئی خوشنویس استاد کی وصلی رکھکر مشق کرتا ہے۔

مرزا زبان کی خرابیاں دیکھکر بہت متاثر ہوتے تھے، ایک زمانہ میں الواعظ مدرسۃ الواعظین کا رسالہ میری ادارت میں نکلتا تھا اوسکو برابر دیکھا کرتے تھے۔ کسی صاحب کے مضمون میں لوٹ کر بمعنی پلٹ کر لکھا ہوا تھا اُن کے دماغ میں محفوظ رہا۔ لکھنؤ آئے تو مجھ سے ملتے ہی شکایت کی۔

"کیوں صاحب جو رسالہ آپکی ادارت میں نکلتا ہو اوسمیں لوٹ کر لکھا جائے"

شعر میں بھی سب سے پہلے زبان کو دیکھتے تھے اوسکے بعد خیالات۔ اُن کے شعر میں کبھی اغلاق لفظی و معنوی ہوا ہی نہیں، مضامین بلند ہوتے تھے مگر نہایت صاف اور شستہ زبان میں ادا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بحد صاف کہنے لگے تھے، ایک دن زمانۂ حال کی ایک غزل سنائی میں نے کہا مرزا صاحب کہاں وہ کلام کہاں یہ، کہنے لگے،

"بھائی اب یاروں نے بہت بلند پروازیاں شروع کر دی ہیں شعر کے معنی بھی مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں مذاق بگڑ چلا میرا مسلک عام روش سے جدا ہے" اب مجھے یہی رنگ پسند ہے"۔
اکثر متروکات کے سختی سے پابند تھے۔ ایک دن میں نے ایک غزل سنائی جسکا مطلع تھا۔

کوئی مریضِ غم کا دم واپسیں نہیں ۔۔۔ اک جان ہے سو وہ بھی کہیں ہے کہیں نہیں

کہنے لگے سو کیوں کہا، دیر تک اس لفظ پر گفتگو رہی مگر ایک نہ سنی،

مرزا ندرتِ تخیل اور بلند پروازی سے خوش ہوتے تھے مگر جہاں مسلم اصولِ اساتذہ کے خلاف یا زبان و محاورات میں کوئی تغیر دیکھتے تھے تو غصہ آ جاتا تھا، اونکو شاعری میں موجودہ دور کی بے راہ روی سے سخت نفرت تھی۔ آجکل انگریزی کے تتبع میں بعض لوگ جو ترکیبیں تراشا کرتے ہیں اونکو بحد ناپسند تھیں۔ زمانہ کے ساتھ جو تغیرات پابندی اصولِ فن کے ساتھ ہوتے ہیں اوسکا اعتراف کرتے تھے مگر ایجاد بندہ سے سخت متنفر تھے۔ اس مقام پر اونکی ایک تحریر کا مختصر حصہ نقل کرتا ہوں جو میرے دیوان پہ لکھی تھی، اس سے مقصود خودستائی نہیں بلکہ اونکے خیالات کا اظہار ہے۔

"زمانہ جو رنگ بدل رہا ہے اور ہمیشہ بدلتا رہیگا اُس سے شاعری مستثنیٰ نہیں رہ سکتی۔ جناب عزیز نے شاعری کی اوس حالت کو واضح کر دیا جو زمانے کا اقتضا تھا جس طرح صاف آئینہ پر ہر چیز کا عکس خوب دکھائی دیتا ہے اسی طرح طبع سلیم ترقی کو من وعن ظاہر کر دیتی ہے۔ آپ نے رنگ بدلنے کا خود قصد نہیں کیا اور خوب کیا جن لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا اور اپنے نزدیک جدت پسندی کو دُور تک کشاں کشاں لئے گئے، اونھوں نے شاعری کو ایجاد بندہ بنا کے ایسی شے پیدا کر دی جسکو نہ مشرقی کہہ سکتے ہیں نہ مغربی۔ الخ"

ہرزہ مشتاب و پےِ جادہ شناساں بردار ۔۔۔ ایکہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

جادہ شناسوں کے رستے پر چلنا ہی اس عہد میں دشوار ہو گیا ہے۔ ان باتوں سے مرزا بہت

سلہ مرزا صاحب کو خیال نہیں رہا مثنوی نوبہار میں اس لفظ کو خود بھی نظم کیا ہے۔
بیکسی تھی اور میں تھا کوئی پہلو میں نہ تھا ۔۔۔ میرا دل تھا میرے پہلو میں سو قابو میں نہ تھا

متاثر ہوتے تھے۔

مرزا صاحب کے کلام کے خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کوثر سے دھوئی ہوئی زبان شستہ صاف سلیس

(۲) انداز میں بانکپن

(۳) فصحا کے محاورے

(۴) خیالات بلند فلسفیانہ مگر اوسی حد تک جہاں تک غزل متحمل ہو سکے۔

(۵) عاشقانہ رنگ غالب مگر ہر تخیل ابتذال سے پاک وصاف۔

زبان کے اس قدر دلدادہ تھے کہ جس شعر میں کوئی محاورہ کی خوبی ہوتی تھی اوسکو پڑھتے وقت خود بھی محظوظ ہوتے تھے۔ پڑھنے کا انداز بالکل سادہ تھا نہ لحن نہ ترنم جس طرح باتیں کرتے ہیں مگر اکثر زبان کے ٹکڑوں کو خاص طور پر ادا کرتے تھے۔

مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے مگر جب کبھی اصرار ہوتا تھا تو ضرور جاتے تھے۔ غزلگوئی میں اپنا زیادہ وقت صرف نہیں کرتے تھے۔ مشاعرہ کے دو ایک گھنٹہ پیشتر غزل کہنا شروع کرتے تھے وقت تک کافی تعداد اشعار کی ہو جاتی تھی۔

ایک زمانے میں بالالتزام میرے مکان پر ماہوار مشاعرہ ہوا کرتا تھا مرزا اکثر اون صحبتوں میں شریک ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میر تقی میر کی فاتحہ صد سالہ کے نام سے ہوا تھا جسمیں میر صاحب نے میر کی شاعری پر ایک پرمغز تقریر کی تھی اور ذیل کی غزل طرح میں پڑھی تھی جسکے اکثر شعر لکھنؤ میں زباں زد ہو گئے ہیں، اس طرح میں میر و غالب کی معرکہ آرا غزلیں ہیں۔

(۱)

حسن شاہد ہے مری رنگینیِ تحریر کا ‏ ‏ ‏ اک ادائے شوخ ہے جو رنگ ہے تصویر کا

فطرت انسان کی کمزوری دکھلاتے ہیں،۔

ضعف میں شکوہ عبث ہے گردشِ تقدیر کا ‏ ‏ ‏ بن پڑا وہ ہم سے کب جو کام تھا تدبیر کا

شعر کا انداز دیکھئے،۔

دیکھ میرا حال، اگر تو جھوٹ سمجھے عشق کو ‏ ‏ ‏ سُن مری فریاد، اگر قائل نہ ہو تاثیر کا

شعر نہیں ایک عبرت کا دفتر ہے۔

یاد کر لینا کہ اکثر بستیاں ویراں ہوئیں ‏ ‏ ‏ اس خرابے میں خیال آئے اگر تعمیر کا

شعر کی گہرائی دیکھئے :-

تھم گئے آنسو نمایش جب ہوئی مدِ نظر رُک گیا نالہ جو اندیشہ کیا تاثیر کا

زبان اور انداز بیان دیکھئے، اس رنگ کے شعر مرزا کی خاص پسند کے تھے، مشاعروں میں اونھوں نے ایک خاص انداز سے اسکو پڑھا ہے۔

الحذر یہ کام دنیا میں تمہیں سے ہو سکا چاہنے والے پر اپنے کھینچنا شمشیر کا

عاشقانہ شعر ہے مگر وہی ندرت بیان اور خوبی زبان کا پہلو لئے ہوئے۔

طبع نازک پر گراں ہے کیوں مرا سر پھوڑنا ہم نہ کہتے تھے نہ چھیڑو تذکرہ تقدیر کا

یہ شعر بیت الغزل ہے اسکا زور دیکھئے۔

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

غرض شاعرہ ملحوظ رکھتے ہوئے مقطع کہا ہے :-

اس غزلگوئی میں وہ تاثیر ہے مرزا کہ آج سو برس کے بعد عالم نوحہ خواں ہے میر کا

مرزا کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف اپنے جذبات وخیالات نظم کرتے تھے جو ایک فطری شاعر میں ہونا چاہیئے، غالب کی زمینوں میں اونھوں نے خوب خوب گل کھلائے ہیں، افسوس کہ وہ سب کلام دستیاب نہیں ہو سکا مگر جس قدر ملا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

(۲)

جسے ہو حسن ظن تم سے کسی سے بدگماں کیوں ہو تمہارے عہد میں بدنام دورِ آسماں کیوں ہو

کسی پر جان جاتی ہو تو ضبطِ شوق مشکل ہے نہ قابو اگر دل پر تو کہنے میں زباں کیوں ہو

اِس شعر میں جو ٹکڑے ہیں یہ مرزا صاحب کی خاص پسند کے ہیں۔

جو دل مطلوب ہے اچھا یہ تمہید وفا کیسی ستم مقصود ہے بہتر، فریب امتحاں کیوں ہو

مری بے تابیوں کا حال غیروں سے نہ کہنا تھا تم ایسے ہو تو پھر کوئی کسی کا رازداں کیوں ہو

دل آزاری کو جس کی دلربائی ہم سمجھتے ہوں توقع اوس سے کیسی، پھر وہ ہم پر مہرباں کیوں ہو

یہ دونوں شعر دیکھئے :-

حقیقت میں مخاطب ہو تمہیں شکر و شکایت کے تمہیں تم جسکے ہو وہ شکوہ سنج آسماں کیوں ہو

فرشتو! جب کسی سے ہو وقوع سعی لاحاصل مرے اعمال میں لکھدو وہ محنت رائگاں کیوں ہو

کہیں گے حالِ دل مرزا کبھی رمز و کنایت میں ملالِ خاطرِ احباب اندازِ بیاں کیوں ہو

مرزا غالب کی مشہور غزل پر مرزا کی طبع آزمائی دیکھئے:۔

(۲)

راحتیں طولِ مرض کی صرفِ درماں ہوگئیں — زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہوگئیں
صورتیں امید کی خوابِ پریشاں ہوگئیں — سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہوگئیں
اون سے کیا لطفِ تعلق اون سے کیا دلبستگی — غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہوگئیں
ناخنِ وحشت نے سینے پر جو کیں گلکاریاں — فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہوگئیں
سیکڑوں رخنے کیئے پیدا درو دیوار میں — شوق کی نظریں رقیبِ چشمِ درباں ہوگئیں
بے مروت سی جو قبریں کوچۂ وحشت میں تھیں — وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہوگئیں
کھل گئے چینِ جبیں سے اونکی بدخوئی کے بھید — جن اداؤں کو چھپاتے تھے نمایاں ہوگئیں
دل میں اب کیا رہ گیا ہے نا امیدی کے سوا — آرزوئیں خون ہوکر نذرِ مژگاں ہوگئیں

مقطع ملاحظہ ہو:۔

چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل — اب سنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہوگئیں

(۳)

نگاہِ مہر ہے عالم کے اجزاے پریشاں پر — ہر اک ذرے کا حق ثابت ہے خورشیدِ درخشاں پر
فنا کے بعد بھی چھوٹا نہیں قیدِ تعلق سے — مری تصویر کھچوائی گئی دیوارِ زنداں پر
بہل ہی جائیگا دل شہر کی گلیوں میں اے ناصح — نہیں آوارگی موقوف کچھ سیرِ بیاباں پر
کبھی تو اس طرف بھی کوئی بھولے سے نکل آئے — کہاں تک بیکسی رویا کرے گورِ غریباں پر
دکھاتے جوشِ وحشت کے مزے تجھکو بھی اے ناصح — مگر کیا کیجئے قابو نہیں تیرے گریباں پر
مجھے ذوقِ جنوں نے دیکے رخصت ذوقِ خواری کی — کیئے ہیں بارہا احسان اطفالِ دبستاں پر
سمجھتے کافر ان عشق کی دشواریاں یہ بھی — اگر طاعت بتوں کی فرض ہوتی اہلِ ایماں پر
کہیں اب کچھ ہم ایسے شعر مرزا جن میں جدت ہو — کہاں تک حاشیے لکھا کریں غالب کے دیواں پر

غالب کی مشہور غزل "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" اس پر مرزا کی لاجواب غزل ہے مگر پتہ نہیں میں نے خود اُن کے زبان سے سُنی تھی ایک شعر یاد رہ گیا۔

عشق اور عشق سے منظور کہ ہو چارۂ کار — درد کا بھی کہیں ممکن ہے دوا ہو جانا

چھوٹی بحروں میں مرزا کی روانی طبیعت کا اندازہ کیجئے۔

ابر جب جھوم جھوم کر آئے — دل جو اُمڈے ہوئے تھے بھر آئے
دل میں طوفاں اُٹھاتے تھے نالے — لب تک آئے تو بے اثر آئے

ذیل کے شعر میں کوٹھے کا استعمال اور مصرع کی بلندی دیکھیے۔

کہیے کیا آسمان سے ٹھہری — آپ کوٹھے سے کیوں اُتر آئے

یہ شعر بھی داد طلب ہے۔

جس کو برسوں ہنسی نہ آتی ہو — اوس کو ناصح کی بات پر آئے

چند شعر ایک طرح میں اور سنیئے۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی — اُسی کافر کی ادا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے — موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ — خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

ردیف وہی قافیہ و بحر مختلف۔

روشِ وحش و طیر یاد آئی — دشتِ وحشت کی سیر یاد آئی
زاہدو آج ہم کو پھر وہ شے — جس سے ہے تکلو بیر یاد آئی
دیکھکر شاہدِ ادا ان کو — لالہ و گل کی سیر یاد آئی

اب چند غزلیں سن لیجئے اس لئے نقل کئے دیتا ہوں کہ اُردو کے یہ جواہر پارے محفوظ رہیں اب خوش نوا نغمے آپ نہ سنیں گے۔ ممکن ہے کہ اس دَور کے جدت پسند شعرا پسند نہ کریں کیونکہ ان اشعار میں وہی پُرانے محاورے ہیں اور پُرانی زبان، نہ ترکیبوں میں ندرت نہ الفاظ میں جدت نہ تخیل میں اتنی پرواز جس کی تلاش میں طائرِ عقل بھی گم ہو جائے۔

اُٹھ کے جاتے ہو تو اک تیغ لگاتے جاؤ — ہاتھ اُٹھاتے ہو تو یوں ہاتھ اُٹھاتے جاؤ
حالِ دل سچ بھی کہوں میں تو مجھے جھٹلا دو — بھید کھلتے ہوں تو کچھ بات بناتے جاؤ
وعدۂ شام کر و صبح کو جاتے ہو اگر — کوئی بے وقت جو سوتے تو جگاتے جاؤ
کہیں بدنام نہ ہو جاؤ، پشیماں کیوں ہو — ہاتھ ملتے ہو تو مہندی بھی لگاتے جاؤ
یوں چلو راہِ وفا میں کہ نہ پائے کوئی — جو نشاں راہ میں ہیں ان کو مٹاتے جاؤ
میر کا نام تو روشن ہے مگر اے مرزا — اِک چراغ اور سرِ راہ جلاتے جاؤ

چارہ گر مشورۂ ترکِ وفا دیتے ہیں زہر دیتے ہیں یہ ظالم کہ دوا دیتے ہیں
مجھکو یہ خوف کہ تم بھی کہیں اُنمیں سے نہو چاہنے والوں کو جو لوگ دعا دیتے ہیں
کان تک اُسکے نہ پہونچے تو نہ پہونچے فریاد سننے والوں کا کلیجا تو پکا دیتے ہیں
الحذر شیخ بُرے ہوتے ہیں پینے والے اچھے اچھوں کو یہ دھوکے سے پلا دیتے ہیں
تنگی عیش میں ممکن نہیں ترکِ لذت سوکھے ٹکڑے بھی تو فاقو نمیں مزا دیتے ہیں
یادِ ایامِ جوانی ہے بہت درد انگیز وہی اچھے جو یہ افسانے بھلا دیتے ہیں
جب غزل کوئی نئی کہتے ہیں مرزا صاحب کسی حیلے سے اونھیں جا کے سنا دیتے ہیں

بُرے یا بھلے ہوں لہو رونیوالے یہی لوگ ہیں سُرخرو ہونے والے
تہِ چرخ برپا ہوئے حشر کیا کیا مزاروں میں سویا کیئے سونیوالے
زہے خوش نصیبی شہیدانِ غم کی مزاروں سے ہنستے اُٹھے رونیوالے
شبِ وعدہ جاگیں گے ہم بھی سحر تک ذرا سُن رکھو شام سے سونیوالے
کہانتک تو برسے گا اے ابر کھُل جا ابھی دیر تک روئیں گے رونے والے

تمہیں کیا کام میرے امتحاں سے نپٹ لینے دو مجھکو آسماں سے
تمنا ہے کہ اے ذوقِ اسیری قفس میں اُڑ کے پہنچوں آشیاں سے
نگاہیں میری نظروں کی طرف ہیں کسی نے کہہ دیا کچھ پاسباں سے
کہیں گے اضطرابِ شوق کا حال سُنیں گے آج کچھ اُن کی زباں سے
اِسی پر منحصر تھی زندگی کیا گھُٹا جاتا ہے دم ضبطِ فغاں سے
مرے دل میں ترا کیا کام اے شوق نکل کمبخت اس اُجڑے مکاں سے
کہاں مرزا کہاں اے آسماں تو یہ کس بل اس ضعیف و ناتواں سے

بن جائے جو بگڑ کے وہ تقدیر چاہیئے خانہ خرابیوں میں بھی تاثیر چاہیئے
میں مر گیا تو گہاں کا طلبگار ہجر میں اور اقتضائے شوق کہ تاخیر چاہیئے
ممکن تو ہے کہ ضعف میں آنکھیں لگی رہیں پیشِ نگاہ آپ کی تصویر چاہیئے

خانہ خرابیوں کی تلافی ضرور ہے زنداں بقدرِ وسعتِ تعمیر چاہیے

شکووں کا بھی انداز تھو حسنِ طلب کا ہاں اے دلِ بیتاب رہے پاس ادب کا
عاقل کبھی اندیشۂ فردا نہیں کرتے موقوف ہے اُس وقت پہ جو کام ہے جب کا
لو اُن سے اشارے دل ہی میں ہوتی رہیں باتیں محفل میں یہ مضمون ہے سمجھا ہوا سب کا
اربابِ تما وجد میں ہیں گرم ہے محفل ہے شمع کا ڈھلتا ہوا جوبن بھی غضب کا
کہتے تو ہیں احباب کہ ہم بھی کبھی خوش تھے کچھ یاد نہیں اب کہ یہ مذکور ہے کب کا
مرزا کبھی کچھ اپنی زباں سے نہ کہے گا ہر چند کہ حسرت زدہ ہے بوسۂ لب کا

جو حیاتِ چند روزہ کا ہم اعتبار کرتے ہمیں اور کام کیا تھا ترا انتظار کرتے
شبِ ہجر کی سیاہی نے چھپا دیے ستارے کچھ انھیں سے دن بہلتا جو انھیں شمار کرتے
وہ کلام جس پہ مرزا کو بجا ہے خود ہے نازش کسی نکتہ چیں کی باتوں پہ اُسے نثار کرتے

سن لے شوقِ شہادت یہ نشانِ کوئے قاتل ہے در و دیوار پر نقش و نگارِ خونِ بسمل ہے
غلط ہے آدمی کو ہو اگر دعوائے ہشیاری قیود و وضع سے دیوانہ پابندِ سلاسل ہے
خوشا تقدیر اون کی مر گئے جو راہ میں تیری خوشا حال اُن شہیدوں کا وفا خود جن کی قاتل ہے
ضعیف العقل ہے انساں کہ ہر جویائے آزادی یہ حسرت ہی حقیقت میں دلیلِ ضعفِ کامل ہے
نہیں مطبوع اون کو اختلاطِ شمع و پروانہ یہ گستاخی سرِ محفل خلافِ دابِ محفل ہے
میری معجز بیانی مجھ سے عاجز ہو کے کہتی ہے بیاں ہونا تیری دشواریوں کا سخت مشکل ہے
نہ رکھ مرزا کو اے شوقِ زیارت دور مشہد سے اُسی در پر اُسے پہونچا دے یہ جس در کا سائل ہے

ہم اگر شیخ و برہمن سے اٹک جائیں گے کفر و ایماں کے دوراہے پہ بھٹک جائیں گے
ساقیا قدح ہمارا ہے ہمیں کو دینا ابھی اتنی نہیں پی ہے کہ بہک جائیں گے
خلد کو حشر سے نکل چلنے دے اے راہنما آگے بڑھ کر کہیں ٹھہریں گے جو تھک جائیں گے
جوہرِ دل کو مرے کھلنے دو سیہ بختی میں شبِ تاریک میں تارے سے چمک جائیں گے

گفتگو پر ہیں اظہارِ تمنا موقوف — مرے چپ بیٹھنے پر بھی وہ کھٹک جائیں گے
ہم جو دیں اگلے مضامیں کو طراوت مرزا — پھر یہ کمھلائے ہوئے پھول مہک جائیں گے

فکرِ نام و ننگ میں کیا کوئی دیوانہ رہے — جب نہوں میں خلق میں کیوں میرا افسانہ رہے
وضع رندانہ ہو لیکن ٹھیک ہوں تیرے اصول — ہے وہی فرزانہ جو ظاہر میں دیوانہ رہے
ہم کو اے مرزا نہیں دنیا و مافیہا سے کام — ہم جہاں کے پینے والے ہیں وہ میخانہ رہے

اب یہ صورت ہے کہ ہیں سر تا قدم تصویرِ غم — اِک وہ عالم تھا کہ تھے ہم منکرِ تاثیرِ غم
خاک میں سب حسرتیں تیری ملا دوں تو سہی — اے دلِ ناشاد میں دو نگا تجھے تعزیرِ غم
سمجھے رونے پر وہ ہنستے ہیں نہ ہے رونا مرا — میری غمگینی سے وہ خوش ہیں خوشا تقدیرِ غم
بسکہ اندازِ بیاں دشوار و معنی خیز ہے — ساکت و صامت ہے وہ جس نے سنی تقریرِ غم
اس طرح گزرے خوش و ناخوش یہ دو دن زیست کے — منہ پر آثارِ تبسم دل میں زخمِ تیرِ غم
جنبشِ ابرو سے ہم کو سہل انکارِ وفا — اوس سے پوچھو جس کے دل پر چل گئی شمشیرِ غم
ماتمِ اہلِ وفا میں صرفِ آرائش ہیں وہ — یہ توقع کس کو تھی مرزا یہ ہے توقیرِ غم

سامنے اس کے تڑپنے کی جو حسرت دل میں ہے — اِک رمق جاں تنو بہانے سے دلِ بسمل میں ہے
ہجر میں جینا اگر مشکل ہے اچھا یوں سہی — جان دیدیجیے یہ آسانی تو اس مشکل میں ہے
بے حجابی آپ کی بے امتیازی غیر کی — مجھ سے سنیئے جو تکلف آپ کی محفل میں ہے
دشت نجد و ساربان و ناقہ و بانگِ جرس — ہیں یہ سب سامان تو لیلےٰ پردۂ محمل میں ہے
اوس سے اب قطع نظر کرنے لگے اہلِ کمال — وہ جو نکتہ امتیازِ ناقص و کامل میں ہے
گوشۂ مرقد ہے مرزا تیرہ و تاریک و تنگ — یہ تو سب کچھ ہے مگر آرام اسی منزل میں ہے

جب ہم نہ تھے تو لوز کا تیرے ظہور تھا — پھر ہم سے یہ حجاب تجھے کیا ضرور تھا
آخر ہجومِ یاس میں کھو یا گیا غریب — اب تک تو میرے پاس دلِ ناصبور تھا
برباد کرکے مجھکو نہ ہوں منفعل حضور — میں آپ معترف ہوں کہ میرا قصور تھا

گر اپنے سر کو ہم پس دیوار مر گئے | وہ کہتے ہیں دماغ میں اس کے فتور تھا
نازک ہوا اس قدر کہ نہ اٹھا کسی پہ ہاتھ | تلوار باندھنا تمہیں پھر کیا ضرور تھا
رکھ لی میرے خدا نے گناہوں کی میرے شرم | زاہد کو اپنے زہد پہ کتنا غرور تھا
دل دیکھے ان بتوں سے امید وصال آہ | مرزا یہ کیا سمجھ تھی یہ کیسا شعور تھا

اون کے اخلاص کی یہ حد ہے کہ خود ہم نہ رہے | روح و قالب میں ضدیں پڑ گئیں یا ہم نہ رہے
اضطراب دل شوریدہ سے کہتا ہے یہ ضبط | سلسلہ شوق کا تجھ سے کہیں برہم نہ رہے
کاش بیکار ہوں اسباب ستم میرے بعد | تیغ و خنجر میں ترے آب نہ ہو دم نہ رہے
حشر برپا ہو اگر حضرت زاہد پی لیں | یہ سماں خاک میں مل جائے یہ عالم نہ رہے
وہ جواں ہو کے خدا جانے کریں گے کیا قہر | کم سنی میں فلک پیر سے جو کم نہ رہے
اٹھے جاتے ہیں مری جان کو رو کر احباب | دو گھڑی آپ شریک صف ماتم نہ رہے
بسکہ آمادۂ عبرت ہے نگاہ انساں | نور بینش ہو فنا چشم اگر نم نہ رہے

رکھتے ہیں حسن ظن یہ بتوں کی وفا سے ہم | جیسے کہ مانگتے ہیں دعائیں خدا سے ہم
اے ذوق بادہ توبہ کو اذن شکست دے | بے چین ہیں تغیر آب و ہوا سے ہم
وہ تو یہ جانتا ہے کہ ہم کب کے مر چکے | جیتے رہے فراق میں اوس کی بلا سے ہم
ہر چند قول ناصح مشفق غلط نہیں | کچھ ہو مگر ملیں گے اسی بیوفا سے ہم

شروع موسم گل میں اسیر دام ہونا تھا | ہمارے شوق بیجا کا یہی انجام ہونا تھا
پیام موت کیوں آیا ابھی سے مرنے والوں کو | کوئی دن اور اون سے نامہ و پیغام ہونا تھا
جگہ دی تھی اسی سے سر پہ دستار فضیلت کو | اسے اک روز رہن بادۂ گلفام ہونا تھا

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم | ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے
دیکھو اسطرح بھی دل دیتے ہیں ملنے والے | شمع کا بس نہ چلا بزم میں پروانے سے
جیتے جی اسکے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں | لذت غم نہ رہی غیر کے مر جانے سے

غیرِ دل کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ چھوڑینگے یہ نہ عشق کو رُسوا کیے بغیر
زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر
ہر چند اسمیں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر
رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم چھوڑے گا اب نہ وہ تمہیں رُسوا کیے بغیر

آج اِس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے دیکھئے دیکھئے اِک آن میں کیا ہوتا ہے
نالہ رُکتا ہے تو سرگرمِ جفا ہوتا ہے درد تھمتا ہے تو بیدرد خفا ہوتا ہے
عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا دم نکلنے ہی میں کمبخت مزا ہوتا ہے
تا لبِ گور پہونچ جاتے ہیں مرنیوالے وہ بھی اُسوقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے
آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرربار کہوں ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے
کس قدر معتقدِ حسنِ مکافات ہوں میں دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
شوقِ اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ اِسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

اُمراؤ جان کا تخلص اَدا تھا، اس ناول میں اکثر غزلیں اُسکے نام سے کہی ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
شورِ فریاد تا فلک پہونچا مگر اوسکو خبر نہیں ہوتی
جان دینا کسی پہ لازم تھا زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
اب کس امید پر نظر پیری شکوہ سنجِ اثر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی
اے اداؔ ہم کبھی نہ مانیں گے دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

اپنے صورت گر سے پوچھوں میں اگر مقدور ہو کیا بنایا تھا مجھے تو نے مٹانے کے لئے
ہجر کی شب کے بنانے میں بھی تھی اِک مصلحت طول آخر چاہیئے تھا کچھ زمانے کے لئے

اب سُنا ہے کہ جلسے بھی پشیماں ہیں وہ اور پھر آہ کی تاثیر سے کیا ہوتا ہے
گوشِ مشتاقِ سخن، دلِ متمنیِ وصال تو ہی کہدے تری تصویر سے کیا ہوتا ہے

مرقع لیلیٰ و مجنوں میں ایک غزل مادہ پرستوں کی تردید میں کہی ہے:۔

کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے
وہم ہے یا کہ حقیقت ہے یہ دنیا کیا ہے

تو یہ کہتا ہے ہیولیٰ کے یہ سب دھوکے ہیں
پھر ہیولیٰ بھی تو دھوکا ہی یہ دھوکا کیا ہے

پھر کہا تو نے کہ دیکھا نہیں خالق کو کبھی
اِک ذرا غور تو کر جی میں یہ کہتا کیا ہے

تو نے دیکھا ہے ازجی و ہیولے کو کبھی
پھر جو قائل ہے تو اسکا تجھے سودا کیا ہے

بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی
تجھ یہ مجھکو بتا دے کہ بتاتا کیا ہے

مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا
پھر قیاس اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے

اُسکا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن
پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے

خواجہ وزیر کی مشہور غزل

"پیلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہوکر"

پھر مرزا صاحب کا وہ غزلہ سن لیجئے اور اس باب کو ختم کیجئے، یہ دونوں غزلیں طولانی تھیں میں نے اشعار انتخاب کر لئے ہیں۔ طرح کا فیض تھا کہ مرزا صاحب اوسی رنگ کی طرف جھک گئے اون کے مذاق سے الگ جو شعر تھے وہ زیادہ تر خارج کر دیئے ہیں۔

اداے شرم پر نازاں ہو نظروں سے نہاں ہوکر
ستم کرتے ہو در پردہ سِتمِ یکِ آسماں ہوکر

رگ و پے میں سمایا عشق ربطِ جسم و جاں ہوکر
رہی یہ آگ میرے تن میں مغزِ استخواں ہوکر

ہوئی ترکِ وفا لیکن یہ ہے پاسِ وفا ابتک
فلک کا شکوہ کرتا ہوں کسی سے بدگماں ہوکر

زلیخا کاش تیرا جذبۂ دل بے اثر ہوتا
نہ بکتے حضرتِ یوسف اسیرِ کارواں ہوکر

نہ پوچھو حسرتِ سختی کشانِ عشق و رسوائی
درِ بت خانہ پر رہتے ہیں سنگِ آستاں ہوکر

محیطِ آسماں نے ہم کو آخر گھیر کر مارا
لگائے ہر طرف سے تیر ظالم نے کماں ہوکر

ادائے شرم کے سر خون ہوتا ہے ہزاروں کا
ستم کرتے ہیں تیر اُن کی نگاہوں کے کماں ہوکر

غزل اس رنگ میں اک اور بھی کہنی پڑی مرزا
نہیں رکتی طبیعت اہلِ معنی کی رواں ہوکر

مقامِ عشق پر فائز ہوئے ہم بے نشاں ہوکر
کسی پردہ نشیں کے گھر میں بیٹھے لامکاں ہوکر

لگائے تیر دل پر تیرے ابرو نے کماں ہوکر
کلیجے پر پڑیں نیچی نگاہیں برچھیاں ہوکر

خموشی کی ادائیں حسنِ صورت سے یہ کہتی ہیں
ہے تصویر کے پردے میں اِک شوخی نہاں ہوکر

گر وہ بے حجابانہ نکل آتا تو کیا ہوتا
کیا ہنگامہ برپا جس نے پردے میں نہاں ہوکر

ہم اوس منزل میں پہونچے لیکے اک دل مثل آئینہ — کدورت رہ گئی پیچھے غبارِ کارواں ہوکر
غم جاوید یعنی درد فرقت میرا حصہ ہے — عدو نے بات ہی کھوئی شریک امتحاں ہوکر
حیا کی شوخیوں سے اُٹھتے اُٹھتے جھک گئی نظریں — میری قسمت سے اُن کے تیر بھی آئے کماں ہوکر
ترے ہر فقرہ پر شوخی سے اُس نے نکتہ چینی کی — غزل کیسی کہی تھی تو نے مرزا نکتہ داں ہوکر

قصائد

مرزا صاحب نے اس صنفِ سخن میں بھی کمال دکھایا ہے خوب خوب قصیدے کہے ہیں میں نے اون کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مجموعہ قصائد اون کے پاس دیکھا تھا۔ مدت کے بعد ایک دن پوچھا کہ وہ مجموعہ کہاں ہے۔ مرزا نے کہا پتہ نہیں کوئی صاحب لیگئے ہونگے۔ لکھنؤ میں انجمن امامیہ کے نام سے ایک جماعت عرصہ تک قائم رہی جسکے مقاصد میں یہ بھی تھا کہ آئمہ کی ولادت کی تاریخوں میں نواب اکرام اللہ خاں مرحوم کے امام باڑہ میں قصیدہ خوانی کی صحبتیں منعقد ہوا کرتی تھیں جس میں بیشتر اساتذۂ سخن شریک ہوتے تھے اوس کے پہلے دور میں مرزا صاحب نے بھی اکثر صحبتوں میں اراکینِ انجمن کے اصرار سے قصائد پڑھے ہیں اور داد سخن لی ہے۔

مدت ہوئی کہ جامِ جم ایک رسالہ غالباً نواب مرزا مح کی ادارت میں نکلتا تھا اُس کے اکثر نمبروں میں مرزا صاحب کا کلام ہوتا تھا باوجود کوشش کے وہ رسائل دستیاب نہیں ہوئے تین چار ورق پھٹے ہوئے ایک دوست سے مل گئے جسمیں مرزا صاحب کے دو قصیدونکی تشبیبیں تھیں وہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

در فخر خود و مرثیہ بعض احباب و موعظت

لکھ مری مدح و ثنا اے قلم زود رقم — کہ نہیں مجھ سا زمانے میں کوئی معجز دم
تاکہ ہوں طبعِ خداداد کے پیدا جوہر — کیف و کم سے مرے آگاہ ہوں اہلِ عالم
کون ہوں میں مجھے کیا سمجھے ہیں یہ مُردہ پرست — ملکِ انشا میں مسلّم ہے مجھے مسندِ جم
میں ہوں وہ نقطہ کہ ہے منشاء دورِ پرکار — میں ہوں وہ خط کہ جو ہے نورِ آماش عدم
درو دیوار شکستہ کے مٹے نقش و نگار — مجھ سے پیدا ہوئے آثار صنادیدِ عجم
کون ہوں میں وہ گلِ سر سبد گلشنِ دہر — جس سے تکمیلِ نموت ہوئی خود قوتِ نم
فائدہ ہرزہ سرائی سے نہیں اے مرزا — یادِ احباب سے محفل میں بپا ہے ماتم
خونچکاں صفحۂ قرطاس ہوا سر تا سر — بسکہ شدت سے لہو روئی ہے چشمِ پرنم
دل پہ اک داغِ محبت ہے نشانِ روشن — بھول جاؤں تمھیں کس طرح سے اے اہلِ کرم

اے فلک تجھکو میری ہمتِ عالی کی قسم
تجھ سے رتبے میں سوا ہیں کہ نہیں اہلِ ہمم

کس نظر سے تو ہوا دشمنِ اربابِ کمال — کیا تری شان بڑھیگی جو یہ ہوجائینگے کم
اس سے کیا نفع کہ ہنستوں کو رلاتا ہے تو — اس سے کیا نفع کہ ہر گھر میں بپا ہے ماتم
ہائے کیا لوگ تھے جن سے ہوئی دنیا خالی — جنکے ماتم میں سیہ خانہ ہے سارا عالم
اسکا کیا غم کہ چلے جاتے ہیں جانے والے — ہاں یہ حسرت ہے کہ افسوس سے جاتے ہیں ہم
قبل احباب کے اے کاش ہمیں موت آتی — کون روئیگا ہمیں جب نہ رہیں گے ہمدم
قدرداں جب نہ رہے ہیچ ہے اپنا جینا — کیا سمجھتا ہے ہمیں کوئی کہ کیا چیز ہیں ہم
بے حقیقت ہے یہ نیرنگِ جہانِ فانی — اعتباری ہیں یہ مفہوم وجود اور عدم
بند کر آنکھ اگر ذوقِ تماشا ہے تجھے — غور سے دیکھ کہ اک دم میں نہ شادی ہے نہ غم
دیکھ تو اب نہ ستارے ہیں نہ اُن کی وہ جھلک — دیکھ تو اب نہ فلک ہے نہ فلک کا وہ خم
نیّریں اب کہیں طالع ہیں نہ وہ انکا نور — ظلمتِ بخت ہے اصغر ہے نہ اب وہ اعظم
نہ عناصر نہ موالیدِ ثلاثہ کا ظہور — جنس عالی ہے نہ سافل ہے نہ وہ کیف نہ کم
نہ زمیں ہے نہ بیابان نہ وہ دشت و جبل — نہ مکیں ہیں نہ مکاں ہیں نہ حشم ہیں نہ خدم
نہ وہ سبزے کی طراوت نہ وہ موجِ صرصر — نہ گلوں کی وہ نزاکت نہ وہ لطفِ شبنم
نہ وہ نرگس کہ جسے کہتے تھے چشمِ محبوب — نہ وہ سنبل کہ جسے کہتے تھے زلفِ پُر خم
نہ وہ بادل کا گرجنا نہ وہ بجلی کی چمک — نہ وہ پانی کا برسنا نہ ہوا ہے پُر نم
نہ وہ دریا کا تلاطم نہ حبابوں کی نمود — عالمِ آب ہے نایاب نہ قطرہ ہے نہ یم
نہ وہ بلبل کے ترانے نہ وہ صوتِ قمری — نہ وہ موسیقیِ گلشن ہے نہ وہ زیر نہ بم
سبز شاخوں کی نہ وہ باغ میں موزوں حرکت — آس وہ موج ہوا کی ہے نہ وہ تال نہ سم
از زمیں تا بفلک ہوگئی ہر شے پابند — از ثریٰ تا بہ ثریا ہوئی ہر چیز عدم
ماسوا اللہ ہر اک چیز ہے فانی غافل — ایک باقی ہے فقط ذاتِ خدائے عالم
ذاتِ واجب کے سوا جس سے ہے منسوب جدا — نسبتِ خاص سے ہے عام پہ اطلاق اتم
یہ بھی اک نسبتِ اضافی ہے کہ ہم ہیں موجود — مرتفع ہو یہ اضافت تو پھر تم ہو نہ ہم
جو ہر اپنا کہ ہے مرہونِ قناعی النقیضین — ہے وہ اک ہستیِ موہوم میانِ دو عدم

شہد ہے زہر سمجھتے ہیں جیسے ہم تریاق / لذتِ عیش کہ وہ ہے متغیر بہ الم

اپنی دولت پہ عبث غرّہ ہے تجھکو منعم / تو سمجھتا ہی نہیں جو ہے ارباب ہمم

خاطر نہ ہو لذاتِ جہاں سے ہرگز / فی الحقیقت ہی یہ لذت اثرِ نقشِ درم

جو کہ ہے خارج قسمت نہ ملے گا ہرگز / سود در سود آکل ہے عملِ جہدِ اہم

دیکھ حاصل : خطائیں کا ہو تو زنہار / نفع ہیں جُمل و ربا دونوں بنصِ محکم

نفع منظور ہو تو بانٹ دے تو راس المال / جو کہ تقسیم سے حاصل ہو وہ ہے اصل رقم

جمع و تفریق میں اموال کی کیا ہی مصروف / صفر ہے صفر بیک ضرب قضائے مبرم

طرح کر بس کو مساکین پہ اے اہلِ ہوس / دیکھنا ہو جو تجھے حیلۂ اکسیرِ کرم

دیکھ مالوف نہ ہو موسیقیِ عیش سے تو / ہے یہ وہ راگ کہ جس راگ میں ہے تال نہ سم

چند روزہ ہے حیات اس میں نہ کر فکرِ کمال / پانچ دنیں تو کبھی صاف نہ ہوگی سرگم

تجھ سے ممکن ہو تو ہو موجبِ تالیفِ قلوب / سانس اکھڑ جائیگی دم بھر میں غنیمت ہے یہ دم

تان کیا لیتا ہے ناداں یہ ہے اصلِ اصول / فرصتِ عمر کے آگے ہے بہت بعد نغم

تجھ میں جوہر نہیں تو ہیچ ہے عالی نسبی / تجکو کیا نفع اگر شاہ ہوں تیرے اب و ام

نوعِ انساں میں ہے ہر فرد پیمبر زادہ / سب کی ماں حضرتِ حوا ہیں پدر ہیں آدم

جاہ و ثروت سے جو حاصل ہو تو یہ حاصل ہو / تیرے تابوت کے ہمراہ چلیں طبل و علم

وضعِ دنیا سے اسے بھی تو سمجھ مستبعد / کوئی عہد اس زنِ قحبہ کا نہیں مستحکم

جاہ و ثروت کو زمانے میں نہیں استقلال / چادرِ گور بھی آخر نہ ہوئی مسندِ جم

دور کر کعبۂ دل سے ہوسِ مال و منال / اختراعات سے ہیں وہم کے تیرے یہ صنم

کس لئے تجکو بنایا تھا کیا کیا تو نے / دیکھ تو نفس پہ کیا کیا نہ کئے تو نے ستم

درسِ توحید سے پیدا ہوا گر ذوقِ صحیح / چاشنی موت کی ہو تیرے لیئے طعمِ بنعم

غور کر غور کہ دنیا ہے طلسمِ باطل / قصرِ ہستی کی بنا سخت ہے نامستحکم

برزخ و حشر کا ساماں مہیا کر تو / فکر کر فکر کہ ہیں پیش مہماتِ اہم

عشق پیدا ہوا گر دلمیں تو حاصل ہو کمال / عشق وہ عشق کہ جس عشق میں لذت ہے الم

موت اس راہ میں سرمایۂ خوابِ آرام / خواب وہ خواب کہ جس خواب کی تعبیر ارم

شکایتِ زمانہ و حالِ خود

کوئی فلک سے یہ پوچھے کہ او ستم ایجاد
ہم ایسے خاک نشینوں کو کیوں کیا برباد

ہمیں بنا کے بگاڑا تو کیسا ملا تجھکو
مگر اسی پہ ہے موقوف طرح کون وفساد؟

بُرے ہیں ہم مگر ایسے بُرے بھی کم ہوں گے
کسی زمانے کے اچھے ہمیں کریں گے یاد

نہ ہم خراب خرابات ہی سہی لیکن
ہمارے دم سے ہے آباد یہ خراب آباد

جو دیکھنا ہو تو اہلِ جہاں ہیں دیکھو
کہ ہیں زمین کے پردے پہ ہم سے آدم زاد

ہماری حالتِ افسردگی ہے قابلِ دید
مثالِ غنچۂ تصویر ہے دلِ ناشاد

بگاڑ پر بھی کروروں بناؤ پیدا ہیں
مٹے ہوئے ہیں مگر پھر بھی ہم ہیں نقشِ مراد

جو ہمکو جانو تو جانو مشیّتِ تقدیر
جو ہم کو سمجھو تو سمجھو حقیقتِ ایجاد

نہ ہوگا ہم سا بھی دنیا میں کوئی بے پروا
کہ باوجودِ علائق ہیں بندۂ آزاد

دل آئینہ ہے بظاہر ہیں گو غبار آلود
کہیں جہاں میں نہ دیکھو گے ہم سے پاک نہاد

جنوں کا جوش ہے کہتا ہوں کیا خدا جانے
کوئی یہ فخر کا موقع ہے اے دلِ ناشاد

پیامِ مرگ سناتی ہے دل کی مایوسی
نویدِ امن ہے اے آرزو مبارک باد

اسیرِ غم ہوں رہائی محال ہے میری
اجل بھی آئے تو پوری نہ ہو مری میعاد

ہجومِ یاس میں شیون سے جی بہلتا تھا
مگر وہ دل نہ رہا اب نہ طاقتِ فریاد

کبھی کبھی یہ اسیری میں یاد آتا ہے
کسی زمانے میں رکھتے تھے اِک دلِ آزاد

جنوں میں اپنی خودی سے بھی ہم ہوئے باہر
وہاں ہیں اب کہ جہاں آدمی نہ آدم زاد

سوائے یاس کوئی میرے آس پاس نہیں
سناؤں کس کو کہ سنتا نہیں کوئی فریاد

وہ آہ سینۂ سوزاں میں ہے اگر نکلے
ابھی خراب ہو بنیادِ چرخِ کج بنیاد

دلِ نشاط پریشاں کریں مرے نالے
دماغِ عیش معطّل کرے مری فریاد

میں کیا کروں مری کوشش میں کچھ اثر ہی نہیں
بگڑ کے مجھ سے مقدر ہے مائلِ بیداد

فلک ہے میری امیدوں کے قتل پر مامور
کہ جیسے شرع میں ہو کافروں پہ حکم جہاد

اسیرِ یاس کے ہاتھوں میں یوں ہے حسرتِ دل
اجل گرفتہ کو لے جائے جس طرح جلّاد

ہر ایک دَور سے مقصود ہے مری گردش
مرے مٹانے کو پھرتا ہے چرخِ کج بنیاد

جو کچھ بھی ملنے کی امید بخت سے ہوتی
تو مانگتا نفسِ چند مہلتِ فریاد

جہان ایک طرف اہلِ جہاں بھی دشمن ہیں　　بلا نصیب ہوں لیکن ہیں سیکڑوں حسّاد

اثر یہ کرتی ہے نیکی مری بدی ہو کر　　کہ جس کا دوست بنوں میں اسے ہو مجھ سے عناد

جہاں عدو ہے مرا دوستی کے پردے میں　　وہ کیا کرے کہ طبیعت میں مرتکز ہے فساد

جنوں سہی مگر اتنا تو ہوش ہے مجھکو　　لگا رہا ہے رگِ جاں پہ نیشتر فصّاد

گھرا ہوا ہوں بلاؤں میں چار سمت سے میں　　مگر یہ کہتی ہے ہمت کہ ہر چہ بادا باد

اگر ہے ہمتِ عالی تو قصدِ محکم رکھ　　کہ جیسے کوہ پہ قائم ہو قلعۂ فولاد

جہاں قضا و طبیعی ہو میل کیا ہوگا　　ملے مگر نہ ملے خاک و آب و آتش و باد

ہو اعتدالِ مزاجِ بشر میں کیا ممکن　　کہ اصل مبدءِ فطرت سے جمع ہیں اضداد

وہی ہیں ہم کہ بنائے گئے ہیں مٹنے کو　　وہی ہیں ہم کہ ودیعت ہے ہم میں طرحِ فساد

وجود اور عدم، دونوں ساتھ ہیں اپنے　　یہ چند روزہ ہے اور وہ ہے تا بہ یومِ تناد

بگاڑ کر ہمیں اک دن بنائیں گے پھر بھی　　یقین جان کہ مہمل نہیں ہے لفظِ معاد

سمجھ لے تو کہ یہ اک دن ضرور ہونا ہے　　یقین جان کہ باطل ہے مذہبِ شمراد

اُٹھیں گے خوابِ گرانِ عدم سے محشر میں　　وہ دن ہے اپنے لئے یا کہ ہے شبِ میلاد

اُٹھے گی حسرتِ مردہ بھی اپنے ساتھ ہی ساتھ　　کہ جس طرح سے کسی شخص کا کوئی ہمزاد

اس آسمان کے اس دن اُڑائیں گے پرزے　　دلِ ستم زدہ آخر ملے گی تیری مراد

وہی ہم اور وہی وضعِ جوششِ گریہ　　وہی ہم اور وہی طرح شورشِ فریاد

اٹھیں گے خاک سے ہم اس کی جستجو کرتے　　یہ مشتِ خاک ہوئی جس کی راہ میں برباد

عمر اور جسم

علمائے حیوانات و نباتات کی تحقیق ہے کہ جانور اور نباتات کا جتنا بڑا جسم ہوگا اس کی اتنی ہی عمر زیادہ ہوگی۔ مثلاً ہاتھی کی عمر تمام جانوروں سے زیادہ ہے اور اپنی جسامت کے لحاظ سے بھی وہ سب سے بڑا ہے مچھلیوں میں بھی اس کا تجربہ کیا گیا ہے اور بڑی مچھلیوں کی عمر زیادہ پائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نوعِ انسان کی حیات بھی اسی اصول کے ماتحت پائی جاتی ہے۔

نستعلیق ٹائپ

(از مسٹر سلیم جعفر)

گزشتہ صدی میں بارہا کوششیں کی گئیں کہ نسخ کے ٹائپ کی طرح نستعلیق کا ٹائپ بھی ڈھال لیا جائے۔ ان کوششوں کی غرض و غایت کبھی اشاعت مذہب کا سامان بہم پہنچانا تھا تو کبھی تجارتی مفاد۔ لیکن ان سے کبھی ایسا نتیجہ مرتب نہوا جسے سعیِ مشکور سے تعبیر کیا جا سکے۔ اس صدی کے جتنے ٹائپ ہیں وہ اپنے طرز کے لحاظ سے نستعلیق کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ درحقیقت نستعلیق کے اوصاف ان میں نام کو نہیں پائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک میں رائج نہ ہو سکے اور ٹیڑ پریس کی سہولتیں لیتھو کی خوبیوں نیز دقتوں پر غالب نہ آسکیں۔ میدان ہمیشہ لیتھو ہی کے ہاتھ رہا۔

موجودہ صدی کی کشاکش نے مسئلہ اشاعت اُردو کو اہمیت بخش دی حکمائے ملت نے لیتھو کی دقتوں کو سنگ راہ ترقی تصور کیا۔ اور مفکرین اس کے حل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے نزدیک اس کا ایک ہی حل قرار پایا اور وہ یہ کہ لیتھو ترک کرکے طباعت کا کام ٹائپ سے لیا جائے۔ اب یہ سوال خودبخود پیدا ہو گیا کہ نسخ کا ٹائپ کام میں لانا چاہیئے یا نستعلیق کا۔ خطِ نسخ گوناگوں خوبیوں سے معمور ہے لیکن اس کے خلاف دو باتیں ہیں۔ ایک تو عرصہ سے ملک نستعلیق سے مانوس ہے اور اس کے نزدیک عربی رسم الخط عربی ہی کے لئے موزوں و مناسب ہے۔ اردو اور فارسی کی میراث میں نستعلیق آیا ہے، یہ دونوں زبانیں اگر نسخ میں چھاپی جائیں تو اس کے نزدیک ایک حسینہ کو ایسے زیور و لباس میں آراستہ کرنا ہے جو اس کا حُسن خاک میں ملا دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے نسخ پڑھنے کی عادت نہیں اس لئے اس کی طرف مائل نہ ہوگا اس صورت میں کوششوں کا مرکز ثقل نستعلیق رہ گیا اور اب جولانیِ طبع کا یہی میدان ہے۔

پچھلے تین قرنوں میں تین کوششیں بہت زور و شور سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں جن کی تقسیم حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) حیدرآبادی (جو مسٹر مرزا رفیق بیگ، مولوی سید عبدالکریم حسینی اور عثمانیہ ٹائپ فاؤنڈری کی مسلسل

(شفقت کوششوں کا نتیجہ ہیں)

(۲) قریشی (جس کے موجد مسٹر ایس۔ایچ۔قریشی ہیں)

(۳) صدیقی (جس کے مخترع ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ہیں)

ان کے نمونے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حیدرآبادی:۔

(الف) مسٹر رفیق بیگ کا ٹائپ،

یہ محض احکام قضا شیم خداوندی کی قوت ارادی کے اثرات تھے

(ب) سید عبدالکریم صاحب کا ٹائپ:۔

یہ محض احکام قضا شیم خداوندی کی قوت ارادی کے اثرات تھے

(ج) عثمانیہ ٹائپ فاؤنڈری کا ٹائپ:۔

یہ محض احکام قضا شیم خداوندی کی قوت ارادی کے اثرات تھے

(۲) قریشی۔

پینہمٹ کینچی سنگین

(۳) صدیقی

(الف) پبلک ٹھیک ملک ابتک

پبلک ٹھیک ملک ابتک

(ب) کھینچکر چنبولی مجمع مجھے پنجشنبہ

کھینچکر چنچولی مجمع مجھے پنجشنبہ

پہنچی مچ

پہنچی مچ

نسخ کے ٹائپ کے عدم ترویج کا باعث عادت جمہور ہے اور نستعلیق کے جو ٹائپ ایجاد ہوئے وہ خوبصورت نہ تھے

اس لئے رائج نہ ہو سکے۔ لیکن محض بدصورتی ہی مانع رواج نہ ہوئی تجارتی پہلو بھی ان کی ترویج کا معاون نہ تھا۔ لیتھو کا چھپا ہوا مالی نقطۂ نظر سے بھی قابل لحاظ ہے۔ جگہ کم گھیرتا ہے اسلئے کاغذ اور چھپائی پر لاگت کم آتی ہے اسپر خوبصورتی مستزاد۔ پھر ٹائپ کیونکر لیتھو کے مقابلہ میں ٹھہر سکتا تھا۔

ہمارے نزدیک مذکورہ تینوں ٹائپوں کی نسبت کامیاب یا کامل ہونے کا فتویٰ دینے سے پہلے یہ دیکھ لینا نہایت ضروری ہے کہ وہ (۱) خوبصورت ہیں یا نہیں (۲) خوبصورت ہیں تو لیتھو کی اور ان کی طباعت میں بہ لحاظ مصارف کیا تناسب ہے۔

مذکورہ بالا تینوں ٹائپوں پر تین پہلوؤں سے نظر ڈالئے۔ پہلے یہ دیکھئے کہ اجزائے الفاظ بہ حیثیت انفرادی اچھے معلوم ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے خاصے ہیں لیکن تینوں میں کوئی اہم فرق نہیں۔ مسٹر قریشی کا ٹائپ نسبتاً اچھا ہے۔ مفردات کی خوبصورتی خطاط اور سانچہ بنانے والے کی مرہون منت ہے جیسے یہ دونوں ہوں گے خط بھی ویسا ہی ہوگا۔ مفردات دونوں کے کمالوں کا آئینہ ہیں۔ ممکن ہے کہ سانچہ بنانے والے کا عیب خطاط کا کمال خاک میں ملا دے لیکن وہ اپنے فن میں کامل ہے تو خطاط کا عیب بہت ہی نمایاں ہو جائیگا۔ اس لئے مفردات کی خوبصورتی کا تعلق موجد سے نہیں بلکہ خطاط اور سانچہ بنانیوالے سے ہے۔

مفردات جب لفظوں میں ترکیب پاکر ایک تصویر آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں تو وہ دل میں سما جاتی ہے یا نہیں؟ یہ دوسرا پہلو ہے جس سے ان ٹائپوں پر نظر ڈالنی چاہئیے۔ الفاظ بہ حیثیت انفرادی بھی وحشت انگیز نہیں، اور ان کی خوبصورتی میں وہی مدارج تفاوت ہیں جو مفردات میں پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تینوں میں سے کوئی ناکامیاب ہے۔ اب سے خوبصورتی یا بدصورتی کا بار دوش مخترع یا موجد پر ہے۔

لیکن عام طور سے یہ دونوں باتیں معیار خوبصورتی نہیں مانی جاتیں۔ الفاظ اور مفردات کی خوبصورتی کا بہت کم لحاظ کیا جاتا ہے، اگر یہی ہوتا تو ادنیٰ درجہ کے کاپی نویسوں کو اپنا پیٹ پالنا دشوار ہو جاتا۔ اور اعلیٰ درجہ کے کاتب اس قدر اجرت لیتے کہ ہمارے بہت سے اخبار و رسالے نکل ہی نہ سکتے یا نکلتے تو ان کا چندہ اتنا ہوتا کہ چند صاحب ذوق ہی ان کے خریدار ہوتے۔ ہاتھ کا لکھا اچھا ہو یا برا اس میں لفظوں کے پاس پاس ہونے سے ایک حسن ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور اسے دیکھکر دل نہیں گھبراتا۔ حیدرآبادی کے لفظوں میں اتنا فصل ہے کہ ان کی ساری خوبصورتی پر پانی پھر گیا، اور صفحہ پر نظر پڑتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ بلکہ اکثر اجزائے لفظ بھی سطح کاغذ پر بکھرے پڑے ہیں۔ اس کمی کو اجزائے الفاظ اور الفاظ دونوں کی خوبصورتی پورا نہیں کر سکتی۔ بعض موقع پر تو ایسا بے ڈھنگا فصل واقع ہوتا ہے کہ پناہ بخدا۔ لفظ ایک ہی ہے لیکن دو لفظ معلوم ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

دور دہان تنگ تو • عارض صبر-من خطت

قریشی صاحب کے ٹائپ کا جو نمونہ پیش نظر ہے اس کی ایک سطر بھی وہ پیش کرنے سے پہلے پبلک کے سامنے لانا خلاف مصلحت تصور فرماتے ہیں اور اسکی نسبت رائے دینا قبل از وقت ہے۔ اپنے نزدیک وہ اپنی ایجاد کو بہمہ وجوہ مکمل سمجھتے ہیں اور کسی کو حق نہیں کہ اس دعوے کی تردید کرے۔ کبھی نہ کبھی وہ پبلک سے ضرور روشناس ہوگا۔ اس وقت رائج ہوگیا تو کامل اور پبلک نے اسے قبول نہ کیا تو ناقص ہے اور یہی فیصلہ ناطق اور اٹل ہوگا۔

صدیقی صاحب کا ایجاد مولوی عبد اللہ صاحب رضوی ہیڈ مولوی نارمل اسکول آگرہ کے "مطابع کے لئے حروف جدیدہ" سے برائے نام بہتر ہے۔ رضوی صاحب کا پمفلٹ اس وقت سامنے نہیں ہے جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے ان کے حروف اس قسم کے تھے اور ان پر اعراب بھی تھے۔ ا۔ ب۔ ج۔ د بوقت ترکیب یہ حرف صورت نہیں بدلتے مثلاً لفظ "بند" ان کے ایجاد یا اختراع کے مطابق اس طرح چھاپا جائیگا۔ بَ نْ دْ۔ جو کچھ "قریشی" کے لئے کہا گیا ہے۔ ذرا سے رد و بدل کے ساتھ "صدیقی" پر بھی صادق آتا ہے۔

الفاظ اور اجزائے الفاظ کے درمیان فاصلہ نے صرف حسن خطاطی کو برباد و تباہ نہیں کر دیا بلکہ ٹائپ کی ترویج عام میں بھی بہت مانع ہوا۔ ناشر کتاب کی نظر اس امر پر قطرتاً رہتی ہے کہ خوبیٔ نفس مضمون کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت بھی ایسی ہونی چاہئیے کہ معمولی درجے کا آدمی بھی اسے خرید لے۔ وہ اس کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیمت کی زیادتی شوق کا گلا گھونٹ دے اور اشاعت ایک خاص طبقہ اور حیثیت والے تک محدود رہے۔

ٹائپ گردشِ قلم کا ہم عناں نہیں ہوسکتا۔ قلم اجزائے الفاظ حتیٰ کہ الفاظ کے درمیان بھی بے وجہ فاصلہ نہیں چھوڑتا اور ضرورت ہو یا کاتب کے شعورِ حسن کا تقاضا تو وہ حرف پر حرف اور لفظ پر لفظ رکھ دیتا ہے ٹائپ کو یہ بات کہاں نصیب۔ اس لئے ٹائپ سے چھاپی ہوئی کتاب زیادہ کاغذ چاہتی ہے، پریس مین کو زیادہ چھپائی کرنی پڑتی ہے اور اس سے کتاب کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مگر یہی دو باتیں قیمت کو نہیں بڑھاتیں۔ لیتھو پریس کا مالک ڈسٹری بیوٹر (وہ شخص جو کسی چیز کے چھپ جانے کے بعد ٹائپوں کو اپنے اپنے خانوں میں رکھتا ہے) کی اجرت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جہاں تک میرا علم ہے ٹائپ کا ایک صفحہ اگر ہاتھ سے لکھا جائے تو ایک صفحہ سے کم جگہ لیتا ہے اس لئے کاتب کی اجرت اس سے یقیناً کم ہوگی جو کمپوزیٹر اور ڈسٹری بیوٹر کو دینی پڑتی ہے۔ اسی حساب سے کاغذ اور چھپائی کے دام بھی کم ہونگے۔ قریشی صاحب

کا دعویٰ ہے کہ اُن کا ٹائپ ہاتھ کی لکھائی سے کم جگہ گھیرتا ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح ہو مگر جب تک وہ دو چار سطریں بھی دکھانے سے پرہیز فرماتے رہیں گے اس کی صحت میں شک و شبہ کی گنجائش باقی رہیگی۔

ٹائپ میں اجزائے الفاظ یا الفاظ میں فاصلہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹائپ میں اجزائے لفظ کے بعض حصوں کے لئے اِدھر اُدھر کچھ جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے الفاظ "عارض عنبریں" پر غور کیجئے۔ عارض تین سیسے کے ٹکڑوں پر ڈھلا ہوا ہے۔ جو بالترتیب عا۔ ر۔ ض۔ ہیں۔ عنبریں کے پانچ ٹکڑے یہ ہیں۔ ع۔ نـ۔ بـ۔ ر۔ یں۔ ان میں پہلے تین کے ملنے سے جو شکل بنتی ہے (عنبر) وہ کم سے کم جگہ لیتی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح کیجئے کہ ایک عمودی خط ع۔ اور دوسرا ر۔ کے آخری سرے سے ملا ہوا کھینچئے۔ لیکن اس جزو لفظ اور دوسرے (یں) کے درمیان کے فاصلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ر کے بائیں جانب حاشیہ چھوڑا گیا ہے اور شاید تمی کے لفظوں کے لئے بھی ایک ٹائپ ہے۔ اس فصل کا ہونا اس کی خوبصورتی کو ستیاناس کر رہا ہے اور بظاہر اس سے ایک حد تک مضر بھی نہیں۔ ہاں اگر ریں ایک ہی ٹکڑے پر ڈھالا جاتا تو ممکن تھا کہ فصل کچھ کم ہو جاتا۔

ٹائپ میں جو حاشیہ حرفوں کے ارد گرد ضرورتاً چھوڑنا پڑتا ہے وہ تو پڑتا ہی ہے لیکن چند حرفوں کی ساخت بھی ایسی ہے جو مد فصل ہوتی ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ نمایاں ک اور گ ہیں۔ حیدرآبادی کے کسی چھپے ہوئے صفحہ پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہو گا کہ دو سطروں کے درمیان کہیں نہ کہیں اونٹ کی طرح گردن اُٹھائے کھڑے ہیں۔ اگر ان کی وضع میں قطع و برید کر دی جائے تو ممکن ہے کہ صفحے میں زیادہ سطریں آسکیں۔ صدیقی صاحب کو اس کا خیال آیا اور ممدوح نے اُن کی گردنوں کو مروڑ کر منہ گدی کی طرف کر دیا اور مرکز کو بجائے مرتفع رہنے دینے کے مستوی کر دیا۔ یہ اصول عام کے خلاف ہے لیکن ایجاد بُرا نہیں۔ مسٹر رفیق بیگ کو بھی یہ بات کھٹکی تھی اور موصوف نے صرف مرکز کی دم کتر دینے پر قناعت کی۔ اگر قدامت پرستی سے دامن نہیں چھڑایا جا سکتا تو یہ بہتر ہو گا کہ عربی کی تقلید کی جائے اور یہ حرف اس طرح لکھے جائیں۔ ك ۔ گ۔ قریشی صاحب کے ٹائپ میں اس وقت کو محسوس نہیں کیا گیا اس لئے جو کچھ حیدرآبادی کے بارہ میں کہا گیا ہے، وہی اس پر صادق آتا ہے۔

حرفوں کا جوڑنا بھی قیمت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جس ٹائپ میں حرفوں کی تعداد کم ہوگی وہی جوڑنے میں کم محنت اور وقت لے گا۔ حیدرآبادی چھ سو ٹکڑوں پر مشتمل ہے لیکن بقول مسٹر قریشی یہ تعداد ان کے حرفوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ یہ بات ہے تو قریشی صاحب کے ٹائپ میں دو اسباب

قیمت جمع ہیں، اور اسے حیدرآبادی کے مقابلہ میں ترویج کا زیادہ موقع ہے۔ صدیقی صاحب کا ٹائپ کل ۲۲۳ ٹکڑوں کا ہے، اس کو "قریشی" سے بھی زیادہ موقع تھا لیکن وہ اس قدر ندرت لئے ہوئے ہے کہ شاید پبلک اسے اس قدر آسانی سے بھی قبول نہ کرے جس قدر آسانی سے وہ نسخ کو قبول کرلے گی۔

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ غرض نہیں کہ نستعلیق کے ٹائپ کے ایجاد کی کوشش ہی بے سود ہے اور یہ بیل کبھی پروان نہ چڑھے گی بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ اس سے پہلے کہ پبلک لیتھو چھوڑ کر ٹائپ کی طرف مائل ہو ترقی کے کتنے مدارج طے کرنے باقی ہیں۔

۱۹۳۲ء میں دُمدار ستارے

دیگر نقطہائے نظر سے ۱۹۳۲ء کی نسبت خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن ایک بات میں اس برس نے سالہائے گذشتہ کو مات کردیا۔ اور وہ یہ ہے کہ جتنے دُمدار ستارے ۱۹۳۲ء میں آسمان پر نمودار ہوئے اتنے کبھی نہ ہوئے تھے۔ یعنی مشاہدہ کاروں نے سال گذشتہ میں آسمان پر چھ دُمدار ستارے ایسے دیکھے جو بالکل نئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام "فائز کامٹ" ہے اس ستارہ کو سب سے پہلے ماہ نومبر ۱۸۴۳ء میں موسیو فائیز نے پیرس کی رصدگاہ سے دیکھا تھا۔ اسکی گردش باقاعدہ ہے اور یہ اس وقت سے ابتک نو مرتبہ نظر آچکا ہے۔

دوسرا دمدار ستارہ بوریلی صاحب کا ستارہ تھا، اس دمدار ستارہ کو سب سے پہلے ۱۹۰۴ء میں بوریلی صاحب نے مارسیلز میں دیکھا تھا اور یہ پانچ ماہ تک نمودار رہا تھا۔ تیسرا دمدار ستارہ کاف صاحب والا اور چوتھا گرگ کا تھا۔ کاف صاحب نے ایساہی ایک ستارہ ۱۹۰۶ء میں اور دوسرا ۱۹۱۰ء میں دیکھا تھا۔ بقیہ دو ستارے ۱۹۳۲ء میں دو انگریزوں، ایک اسپینی اور دو امریکنوں نے دیکھے۔ انکے نام آرنٹ۔ گڈسیں۔ گارورینا۔ بتومین پیلٹر اور جیل ہیں اور یہ دونوں دمدار ستارے کیپ آف گڈ ہوپ، ملبورن، میڈرڈ، لاویل رصدگاہ واقع ریاست آریزونہ، دلنوش واقع ریاست اوہیو، اور ہارورڈ یونیورسٹی میں دیکھے گئے۔ ماہرانہ کا ایک ماہر فلکیات مسٹر اشفورڈ بھی دعویدار ہے کہ اس نے ساتواں دمدار ستارہ دریافت کیا لیکن اس کی دیگر مشاہدات سے تصدیق نہیں ہوئی۔

ہجری و عیسوی تاریخوں کی مطابقت

(از پروفیسر مہیش پرشاد مولوی فاضل، ہندو یونیورسٹی بنارس)

اگرچہ آجکل سن عیسوی کا عام رواج ہے مگر جب اہلِ اسلام کا دَور دَورہ تھا تو سنِ ہجری ہی کا زیادہ چلن تھا۔ اُس دَور کی ہجری تاریخ یا سَن کا کما حقہٗ معلوم کرنا بعض اوقات جس قدر دقت طلب مسئلہ ہوتا ہے وہ اُن علم دوست اصحاب کو بخوبی معلوم ہے جنھیں کبھی اس قسم کا کام پڑا ہے۔

سنِ ہجری تقریباً ۳۵۵ دنوں کا ہوتا ہے اور سن عیسوی ۳۶۵ یا ۳۶۶ دنوں کا۔ اس کمی بیشی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سنِ ہجری کی پہلی تاریخ ہر سال عیسوی ماہ کی کسی خاص تاریخ کو نہیں پڑتی اور سنِ ہجری کے ۳۳ سال ہمیشہ سنِ عیسوی کے تقریباً ۳۲ سال کے برابر ہوا کرتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر بتیس ۳۲ یا تینتیس ۳۳ سال کے بعد دو سنین ہجری کی ابتدائی تاریخیں ایک ہی سنِ عیسوی کے اندر پڑ جاتی ہیں مثلاً سن ۱۹ و ۲۰ ہجری کی ابتدائی تاریخیں علی الترتیب ۲ جنوری و ۲۱ دسمبر ۶۴۰ء ہیں اور اس کے بعد سن ۵۲ و ۵۳ ہجری کی ابتدا علی الترتیب ۸ جنوری و ۲۷ دسمبر ۶۷۲ء ہے۔

کسی ہجری سن کے مطابق عیسوی سَن معلوم کرنے کیلئے چند قاعدے ذیل میں دیے جاتے ہیں مگر ان کے متعلق دو۲ امور کا خیال ہر حال میں ضروری ہے۔ اول یہ کہ سنِ ہجری کی ابتدا جولائی ۶۲۲ء سے ہے۔ دوم یہ کہ سن ہجری و سن عیسوی میں تقریباً تین فیصدی کا فرق پڑتا ہے کیونکہ سن ہجری کے تینتیس سال ہمیشہ سنِ عیسوی کے تقریباً بتیس ۳۲ سال کے برابر ہوا کرتے ہیں چنانچہ انھیں دو۲ امور کی بنا پر درحقیقت تمام قواعد مختلف قالبوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

(۱)[1] جس سن ہجری کے مطابق سنِ عیسوی معلوم کرنا مقصود ہو اُس سنِ ہجری کو پہلے ۹۷۰۲۲۵، سے ضرب دیا جائے پھر اس میں ۶۲۱٫۵۴ جوڑ دیا جائے تو مجموعہ (عدد صحیح) سنِ عیسوی ہوگا یعنی سن

ہجری × ۹۷۰۲۲۵، + ۶۲۱٫۵۴ = سن عیسوی۔

---

[1] ہایر پرشین گرامر (Higher Persian Grammar) مصنفہ لفٹنٹ کرنل ڈی سی فلاٹ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۲۴۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس قاعدہ سے سن عیسوی کی وہ تاریخ بھی معلوم ہو سکتی ہے جو اس سن ہجری کی آخری تاریخ کو پڑتی ہے مثلاً ۱۳۵۱ھ ہجری کا ۳۰ ذی الحجہ ۱۹۳۳ء عیسوی میں ۲۶۔اپریل کو پڑتا ہے۔

(۲) اولاً سن ہجری میں سے اس کا تینتیسواں ($\frac{1}{33}$) حصہ گھٹایا جائے بعدہٗ اس میں ۶۲۲ جوڑا جائے حاصل جمع (عدد صحیح) سن عیسوی ہوگا یعنی سن ہجری - $\frac{\text{سن ہجری}}{۳۳}$ + ۶۲۲ = سن عیسوی

(۳) سن ہجری کو تین سے ضرب دیکر اس کا سوواں ($\frac{1}{100}$) حصہ پورے سن ہجری سے اولاً گھٹایا جائے پھر باقی میں ۶۲۲ جوڑ دیا جائے مجموعہ (عدد صحیح) سن عیسوی ہوگا۔ یعنی

سن ہجری - $\frac{\text{سن ہجری} \times ۳}{۱۰۰}$ + ۶۲۲ = سن عیسوی

مذکورہ بالا قاعدے چند دیگر کتب میں بھی مختلف پیرائے میں ہیں۔ ان قاعدوں کو اگر حسب ذیل طریقے پر مرتب کر دیا جائے تو کسی عیسوی سن کے مقابل والا ہجری سن (بعض حالات میں مع تاریخ) معلوم ہو سکتا ہے۔

---

(۱) عیسوی سن میں سے پہلے ۶۲۱،۵۴ گھٹا دیا جائے پھر باقی کو ۰،۹۷۰۲۲۵ سے تقسیم کر دیا جائے، خارج قسمت (عدد صحیح) سن ہجری ہوگا یعنی

(سن عیسوی - ۶۲۱،۵۴) ÷ ۰،۹۷۰۲۲۵ = سن عیسوی

(۲) سن عیسوی - ۶۲۲ + $\frac{\text{سن عیسوی}}{۳۲}$ = سن ہجری

(۳) سنِ عیسوی + $\frac{\text{سن عیسوی} \times ۳}{۱۰۰}$ - ۶۲۲ = سن ہجری

ہجری اور عیسوی سنوں و تاریخوں کی باہمی مطابقت کے بارہ میں کئی جدول بھی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:۔

۵۱ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا (Chamber's Encyclopaedia) نیا اڈیشن مطبوعہ اڈنبرگ ۱۹۰۸ء جلد پنجم صفحہ ۶۲۲ کالم اول

۵۲ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (Encyclopaedia of Religion & Ethics) مرتبہ جیمس ہیسٹنگس ایم۔ اے۔ ڈی۔ ڈی۔ مطبوعہ اڈنبرگ ۱۹۱۰ء جلد سوم صفحہ ۱۲۰ کالم دوم۔

۵۳ مثلاً (۱) اے ڈکشنری آف اسلام (A Dictionary of Islam) مصنفہ ٹامس پیٹرک ہیوگس بی۔ ڈی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ دوسرا اڈیشن مطبوعہ لنڈن ۱۸۹۶ء صفحہ ۱۰۴ کالم دوم۔

(۲) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (Encyclopaedia Britannica) چودھواں اڈیشن جلد پنجم صفحہ ۶۶۳ کالم اول

۵۴ ماریہ پرشلین گرامر صفحہ ۲۰۳

(۱) یہ تاریخ علم[1] نامی ایک اردو کتاب کے اخیر میں شامل ہے۔ اس میں سنہ ۱۳۳۳ھ ہجری تک کے مقابل والے عیسوی سنین درج ہیں۔ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ ہر بتیس ۳۲ یا تینتیس ۳۳ سال کے بعد دو ہجری سنوں کی ابتدائی تاریخیں ایک ہی سن عیسوی کے اندر پڑ جاتی ہیں لہٰذا یہ جدول بہر کیف جامع و مانع نہیں۔

(۲) یہ جدول اورینٹل ایراز[2] (Oriental Eras) نامی ایک انگریزی کتاب میں ہے جس میں سن ۱ تا ۱۳۱۸ ہجری یعنی سنہ ۱۹۰۰ عیسوی تک کی مطابقت مندرج ہے مگر اس میں نہایت عمدہ بات یہ ہے کہ ہجری اور عیسوی سنوں اور تاریخوں کی مطابقت کے علاوہ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کئی دیگر سنین مع تاریخ اور اہم واقعات مندرج ہیں۔

(۳) فرہنگ انگلیسی[3] بفارسی کے اخیر میں شامل ہے۔ اس میں ۱۴۲۱ھ ہجری یعنی سنہ ۲۰۰۰ء عیسوی تک کی مطابقت ہے۔ اس میں چند غلطیاں ضرور ہیں تاہم بلحاظ مطلب بہت اہم ہے کیونکہ یہ جدول صرف سال حال تک کیلئے نہیں بلکہ بہت سے آئندہ برسوں کیلئے بھی کافی ہے۔ اور اسکے ساتھ سن ہجری و سن عیسوی دونوں کی مکمل تاریخوں کے علٰحدہ علٰحدہ جدول ہیں جن کی مدد سے کوئی عیسوی یا ہجری تاریخ بآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔

(۴) این انڈین ایفیمریز (An Indian Ephemeris) مصنفہ ایل۔ ڈی۔ سوامی کنو پلے دیوان بہادر جو زیر نگرانی مدراس گورنمنٹ سنہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی ہے، یہ چھ ضخیم جلدوں میں ہے اسمیں ہجری و عیسوی تاریخوں کے سوا کئی دیگر سنین مندرج ہیں مگر صرف سنہ ۱۷۹۹ عیسوی تک۔

دو باتوں کو خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھنا چاہیئے:۔

(۱) ہر ہجری مہینہ رویت ہلال سے شروع ہوتا ہے اور جو مقامات ایک دوسرے سے بہت زیادہ فاصلہ پر واقع ہیں انہیں غروب آفتاب کے اوقات میں گھنٹوں کا تفاوت ہوا کرتا ہے اس تفاوت کے باعث ایسے دو مقاموں کی رویت ہلال میں بھی کبھی کبھی ایک یوم کا فرق پڑ جایا کرتا ہے۔

(۲) پوپ گریگری سیزدہم[13] نے سنہ ۱۵۸۲ء میں سے دس دن کم کر دیئے تھے چنانچہ اس سن میں ۵ اکتوبر کو ۱۵۔ اکتوبر تسلیم کیا گیا تھا اس وجہ سے سنہ ۹۹۱ ہجری کی ابتدا ۲۵ جنوری سنہ ۱۵۸۳ء سے ہے ورنہ ۱۵ جنوری سے ہوتی کیونکہ ہر اگلے سال میں عموماً دس یا گیارہ دنوں کا فرق ہوتا ہے۔

---

[1] مطبوعہ کرزن ہیلتھ پریس دہلی طبع دوم۔ [2] مصنفہ طامس میکیڈن (Thomas Mccudden) مطبوعہ ہیگن بوتھم پریس بمبئی سنہ ۱۸۸۷ء [3] مصنفہ حسین زاہدی شانفروش مطبوعہ طہران سنہ ۱۳۲۶ء صفحہ ۲۹۸ تا ۳۱۵

معاہدہ اوٹاوہ اور ہندوستان

برطانوی قوم کی دولت وحشمت اور سلطنت برطانیہ کی طاقت ووسعت کا دارومدار انگلستان کی صنعت وحرفت اور تجارت پر ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کا اصلی راز بھی تجارتی رقابت ہی تھا۔ جنگ کے بعد دنیا کی حالت اس قدر دگرگوں اور اقوام وممالک کی اقتصادی کیفیت اس قدر پست وزبوں اور دنیا کی تجارت وحرفت اس قدر متزلزل ہوگئی کہ ہر ملک کو اپنی حفاظت، تجارت کی ترقی اور قدرتی وسائل وذرائع کے نشوونما کی فکر دامنگیر ہوگئی جس کا عام نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ملک نے باہر سے آنے والے مال پر گرانبار محصولات عاید کرکے ترجیحی پالیسی اختیار کی اور اپنے گھر میں سستا مال تیار کرنے لگا۔ ہندوستان میں سوتی کپڑوں کے متعلق فرانس، اطالیہ، جاپان، روس اور انگلستان کا مقابلہ ہونے لگا جس سے لنکا شائر کی تجارت کو سخت صدمہ پہونچا۔ ادھر کانگریسی بائیکاٹ نے لنکا شائر کو نقصان پہونچایا۔ اسی اثنا میں جاپانی سکہ کی قیمت گھٹ گئی، اور جاپانی مال اس قدر ارزاں ہوگیا کہ لنکا شائر درکنار اس کے مقابلہ میں خود ہندوستان کے کارخانے بھی چلانے لگے۔ الغرض ہر طرف برطانوی تجارت کی کساد بازاری ہونے لگی۔

چونکہ ہندوستان ایک محکوم ملک ہے اس لئے انگریزی مال کی جس قدر درآمد یہاں ہوتی ہے دیگر ممالک میں نہیں ہوتی۔ لیکن آزاد تجارت کی بدولت دنیا کے بھی ممالک اپنا اپنا مال بھیجتے رہتے ہیں۔ اس لئے وزرائے برطانیہ نے حریفوں کی دست برد سے ہندوستان کی منڈیاں محفوظ رکھنے اور سلطنت برطانیہ کے دیگر حصص کی تجارت وحرفت کو ممالک غیر پر ترجیح دیکر اپنی اقتصادی حالت درست کرنے کی غرض سے اوٹاوہ دارالحکومت کناڈا میں برطانیہ عظمی، انگریزی مقبوضات اور مستعمرات اور ہندوستان کے نمایندوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں بحث ومباحثہ، غور وخوض اور ردوقدح کے بعد ایک معاہدۂ باہمی مرتب ہوا جس کا نام سیاسی دنیا میں معاہدۂ اوٹاوہ ہے۔ یہ معاہدہ دنیائے اقتصادیات میں ایک زبردست اور مہتم بالشان واقعہ ہے۔ بادی النظر میں تو یہ صرف سلطنت برطانیہ کے معدودے چند ممالک کا معاہدہ ہے لیکن درحقیقت اس کی وجہ سے دنیا کی بین الاقوامی تجارت پر زبردست اثر پڑیگا اور دنیا کی سبھی سلطنتوں کے

م تجارت، شرح محصولات میں سخت تغیر و تبدل پیدا ہو جائیگا۔ اس کی بدولت مختلف ممالک میں اقتصادی
یہ پیچیدہ پابندیاں ہونگی۔

ہندوستان کی لیجسلیٹیو اسمبلی نے بھی اس معاہدہ کو تین سال کے لئے منظور کیا ہے۔ اس لئے
رت ہے کہ اس پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔

ن الاقوامی | اقتصادی حیثیت سے سلطنت برطانیہ دنیا کا ایک جزو غالب ہے، اس لئے اس کی
تی پالیسی کے اساسی تغیرات کا دنیا کی تجارت پر ہمیشہ زبردست اثر پڑتا ہے، اس وقت کیا بلحاظ مقدار
یا بلحاظ قیمت دنیا کی تجارت میں زبردست کمی آگئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس حالت کی اصلاح و درستی
معاہدہ اوٹاوہ سے کہاں تک مدد ملے گی؟ اضافہ محصولات درآمد اور ترجیحی پالیسی کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ
لنت برطانیہ کے ماتحت ممالک کی تجارت میں کسی قدر ترقی ہو جائے۔ لیکن عالمگیر تجارت پر اس کا اثر
رس ہوگا، مثلاً اگر سلطنت برطانیہ کے مختلف حصص دیگر ممالک کا مال خریدنا ترک کر دیں گے تو وہ بھی
تناسب سے سلطنت برطانیہ کا مال کم خریدیں گے، اور اس طرح جو منافع سلطنت کے اندر ہوگا اس
زیادہ خسارہ سلطنت سے باہر ہو جائیگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاہدۂ اوٹاوہ سے دنیا کی تجارت
کوئی ترقی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے برعکس اس کی وجہ سے دنیا کی اقتصادی ترقی میں رکاوٹیں پیدا
ہو جائینگی۔ دنیا کی موجودہ کساد بازاری کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ مختلف ممالک نے اپنے یہاں چنگی کی
دیواریں کھڑی کر کے بین الاقوامی مصنوعات کی راہ میں سد سکندری تعمیر کر دی ہے۔ اوٹاوہ کانفرنس
ان دیواروں کو اور زیادہ بلند کر کے سر بفلک کر دیا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے محصولات میں جو اضافہ
ہے اس سے دنیا بھر کے محصولات بڑھ گئے ہیں۔ دیگر ممالک اس سے متاثر ہو کر انتقامی تدابیر اختیار
یں گے اور اضافہ چنگی کے علاوہ بھی مال کی درآمد و برآمد میں بیسیوں طریقہ سے رکاوٹیں پیدا کیجا سکتی ہیں

حامیان معاہدہ اوٹاوہ نے یہ بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ فی زمانہ دنیا میں مال کی برآمد (Supply)
بہت سے مگر مانگ (Demand) یا ڈیمانڈ اردو میں "نکاسی" کم ہے جس کا سبب برآمد مال میں مختلف
لک کا تبادلہ کن مقابلہ ہے۔ سلطنت برطانیہ کی امپیریل ترجیح کے ذریعے ممکن ہے کہ ممالک غیر کے مال کی
انوی منڈیوں میں کھپت نہ ہو اور اس کے بجائے سلطنت کے مال کی گنجائش نکل آئے لیکن جب
لک غیر کے ہاتھوں سے سلطنت برطانیہ کی منڈیاں نکل جائیں گی تو وہ بھی دنیا کی دوسری منڈیوں
اپنی توجہ زیادہ سرگرمی سے مبذول کریں گے، اور ان میں حتی المقدور سلطنت برطانیہ کے مال کی کھپت
گنجائش باقی نہ رکھیں گے۔ مثال کے لئے السی کو لے لیجئے جو ارجنٹائن (جنوبی امریکہ) اور ہندوستان

میں زیادہ پیدا ہوتی ہے. ممکن ہے کہ ترجیحی ٹیکسوں کی بدولت برطانوی منڈیوں میں ارجنٹائن کی السی نہ جانے پائے اور وہاں صرف ہندوستان ہی کی السی فروخت ہو سکے لیکن اس کے عوض ارجنٹائن بھی دیگر ممالک غیر میں اپنی السی زیادہ سرگرمی کے ساتھ فروخت کرنے کی کوشش کریگا جس کی وجہ سے ہندوستان کی السی کو ہر لحاظ سے نقصان پہونچے گا. اس کے علاوہ امریکہ اور مغربی یورپ میں ارجنٹائن کا مال کفایت سے جا سکے گا. اس طرح جو فائدہ ہندوستان کو ترجیح سے پہونچنا ممکن ہے وہ نہ صرف برابر ہو جائیگا بلکہ شاید الٹا خسارہ رہے۔

معاہدہ اوٹاوہ کی ترجیحی پالیسی کے باعث جب سلطنت برطانیہ کی منڈیاں مصنوعات و پیداوار ممالک غیر سے خالی ہو جائیں گی تو ہندوستان جیسے ممالک کو جس کی برآورد (Produce) کا دو تہائی حصہ ممالک غیر میں فروخت ہوتا ہے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا. یا تو ممالک غیر سے اس کی تجارت گھٹ جائیگی یا اس کی قیمت گر جائے گی۔

غرض نئی جنگی کی وجہ سے ہمارے تجارتی نظام میں فرق آجائیگا، اور ہم حسب ضرورت دیگر ممالک سے خاطر خواہ تجارتی معاہدات بھی نہ کر سکیں گے. یعنی اگر کوئی غیر ملک ہمارے ساتھ ترجیحی برتاؤ بھی کرنے کے لئے تیار ہو تو ہم اس کو معاہدۂ اوٹاوہ کی خلاف ورزی کئے بغیر قبول نہیں کر سکتے. بالفاظ دیگر خرید و فروخت کی جو آزادی ہم کو معاہدہ سے قبل حاصل تھی وہ اس کے بعد باقی نہیں رہی چنانچہ اب ہم جاپان، امریکہ، بلجیم، جرمنی وغیرہ سے کوئی جدید تجارتی معاہدہ نہیں کر سکتے۔

ہندوستان کی تجارت کے اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ ہماری تجارت برطانیہ اور اس کے ماتحت ممالک کے ساتھ گھٹتی اور ممالک غیر سے بڑھتی جاتی ہے. نقشہ ذیل سے اس قول کی صداقت بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی۔

قیمت مال تجارت (برآمد) بحساب کرور روپیہ

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء
سلطنت متحدہ برطانیہ	۵۶٫۳	۷۳٫۰۴	۷۲٫۴	۹۹٫۶	۵۴٫۲	۴۵٫۳
سلطنت برطانیہ	۹۲٫۱	۱۲۵٫۱	۱۱۹٫۹	۱۱۴٫۶	۸۹٫۵	۷۱٫۵
ممالک غیر	۱۳۲٫۰	۱۷۶٫۹	۲۱۸٫۰	۲۰۳٫۳	۱۳۶٫۲	۸۹٫۱
میزان کل	۲۲۴٫۱	۳۰۲٫۰	۳۳۷٫۹	۳۱۷٫۹	۲۲۵٫۷	۱۹۰٫۵

قیمت مال تجارت (درآمد) بحساب کرور روپیہ

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء
سلطنت متحدہ	۹۱٫۶	۱۳۹٫۴	۱۱۳٫۲	۱۰۳٫۱	۹۱٫۴	۴۴٫۸
سلطنت برطانیہ	۱۰۱٫۵	۱۹۵٫۵	۱۳۹٫۹	۱۲۴٫۵	۷۹٫۰	۹۹٫۷
ممالک غیر	۴۴٫۳	۸۰٫۵	۱۱۹٫۷	۱۱۹٫۳	۸۸٫۸	۶۹٫۷
میزان کل	۱۴۵٫۸	۲۵۴٫۰	۲۵۳٫۳	۲۴۰٫۸	۱۶۴٫۸	۱۲۹٫۴

ہندوستان کی تجارت کے فیصدی حصہ وار

(برآمد)

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء
سلطنت متحدہ	۲۵٫۱	۲۴٫۲	۲۱٫۴	۲۱٫۰	۲۴٫۰	۲۸٫۲
سلطنت برطانیہ	۴۱٫۱	۴۱٫۴	۳۵٫۵	۳۶٫۰	۳۹٫۶	۴۳٫۵
ممالک غیر	۵۸٫۹	۵۸٫۶	۶۴٫۵	۶۴٫۰	۶۰٫۴	۵۵٫۵
میزان کل	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰

(درآمد)

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء
سلطنت متحدہ	۶۲٫۸	۵۷٫۹	۴۴٫۷	۴۲٫۸	۳۷٫۲	۳۵٫۵
سلطنت برطانیہ	۶۹٫۷	۶۵٫۲	۵۴٫۱	۵۱٫۷	۴۶٫۱	۴۴٫۸
ممالک غیر	۳۰٫۳	۳۴٫۸	۴۵٫۹	۴۸٫۳	۵۳٫۹	۵۵٫۲
میزان کل	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

ان نقشہ جات سے ناظرین زمانہ پر بخوبی روشن ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان کی تجارت درآمد و برآمد دونوں سلطنت متحدہ و سلطنت برطانیہ کی بہ نسبت ممالک غیر سے روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور جنگ کے بعد سلطنت متحدہ سے ہندوستان کی تجارت برآمد روز افزوں کم ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء میں سلطنت متحدہ میں ہندوستان کا مال صرف ۲۴ فیصدی فروخت ہوا اور ۶۰٫۴ فیصدی ہندوستانی مال کی کھپت ممالک غیر میں ہوئی اور اس کی بیشی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے لئے برطانوی منڈیوں کے مقابلے میں غیر ممالک کی منڈیاں زیادہ قابل قدر ہیں۔ معاہدہ اوٹاوہ کی رو سے چنگی کی جو جدید شرح عاید کی جائیگی اس کے معنی یہی ہونگے کہ ہم ان ممالک کے خلاف کام کر رہے ہیں جو ہم سے نہ صرف زیادہ مال خریدتے ہیں بلکہ جن کی درآمد ہمارے ملک میں ہمیشہ ہماری برآمد سے کم رہی ہے

بالفاظ دیگر ہم ایک ایسے ملک کی رعایت کریں جس نے سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں ہندوستان سے اتنا مال نہیں خریدا جتنا کہ اس کے ہاتھ فروخت کیا ہم اُن خریداروں کے خلاف قدم اٹھائیں گے جو ہمارا مال زیادہ مقدار میں خریدتے اور اپنا مال کم مقدار میں فروخت کرتے ہیں

مختلف ممالک سے ہندوستان کی تجارت کی کیفیت یہ ہے

نام ملک	درآمد		برآمد		نفع و نقصان	
	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء
سلطنت متحدہ	۶۱٫۲۹	۳۴٫۰۱	۵۴٫۲۳	۴۵٫۳۲	−۶٫۰۶	+۰٫۵۰
جرمنی	۱۲٫۳۸	۱۰٫۲۰	۱۴٫۲۳	۱۰٫۰۹	+۱٫۸۵	−٫۱۱
جاپان	۱۴٫۵۱	۱۳٫۳۴	۲۳٫۰۷	۱۴٫۰۳	+۹٫۳۶	+٫۶۹
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۵٫۱۲	۱۲٫۸۴	۲۱٫۱۴	۱۴٫۲۹	+۶٫۰۱	+۱٫۴۵
اطالیہ	۴٫۵۱	۳٫۵۹	۷٫۹۳	۵٫۵۰	+۳٫۴۲	+۱٫۹۱
بلجیم	۴٫۶۷	۳٫۰۲	۷٫۵۰	۴٫۴۷	+۲٫۹۰	+۱٫۴۵
فرانس	۲٫۸۹	۲٫۱۷	۱۱٫۱۷	۷٫۶۲	+۸٫۲۸	+۵٫۵۵

اس نقشہ سے بھی صاف ظاہر ہے کہ جملہ ممالک میں صرف سلطنت متحدہ ہی ایسا ملک ہے جس نے ہندوستان کا مال تو کم خریدا لیکن اپنا مال اس کے ہاتھوں زیادہ فروخت کیا۔ صرف سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں یہ پہلا موقعہ پیش آیا کہ اس نے ہندوستان سے زیادہ مال خریدا۔ اور یہ محض تحریک بائیکاٹ کا نتیجہ تھا اور اگر بائیکاٹ نہ رہے تو حالت پھر دگرگوں ہو جائے۔ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں بھی فرانس، بلجیم، اطالیہ، اور جاپان نے ہندوستان کا زیادہ مال خریدا۔ لہٰذا جو لوگ ہم سے زیادہ مال خریدتے ہیں اُن کے سامنے محصولات امتیازی کی سدسکندری کھڑی کرنا کسی طرح دانشمندی نہیں ہو سکتا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ہندوستان کے ہاتھ سے تمام غیر ملکی منڈیاں نکل جائیں گی کیونکہ جب ہم تجارتی امتیازات میں پھنس کر باہر والوں کا مال کم خریدیں گے تو وہ بھی ہمارے مال کو ٹھکرا دیں گے۔ ہر حال ہم کو خوف ہے کہ محصولات میں جدید تغیرات ہماری تجارت کا گلا گھونٹ دیں گے

اس مسئلہ پر ایک اور نقطۂ خیال سے بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ گیہوں ہندوستان کے علاوہ آسٹریلیا کناڈا۔ اور روس سے بھی برآمد ہوتا ہے۔ پس اگر برطانیہ ہم سے گیہوں خریدے گا تو عام بازاری نرخ پر خریدیگا

جس سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ چائے ہندوستان۔ لنکا اور جاوا کے علاوہ اور کسی ملک میں کثرت سے پیدا نہیں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی پیداوار تیسرے درجہ پر ہے اور لنکا میں اول درجہ پر۔ اگر امتیازی ٹیرف کی مدد سے جاوا کی چائے برطانوی منڈیوں میں نہ آنے پائی تو اس سے ہندوستان کو نہیں بلکہ لنکا کو اصلی فائدہ ہوگا۔ سن۔ لاکھ اور تجز۔ بہیڑہ۔ آنولہ وغیرہ ہندوستان کے سوائے کہیں پیدا نہیں ہوتے۔ لہذا تمام ممالک غیر کو یہ چیزیں مجبوراً ہمیں سے خریدنا پڑیں گی۔ اب فقط روئی کا قصہ باقی رہجاتا ہے انگلستان گراں نرخ پر روئی نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ دوسروں کے مقابلہ میں سستا کپڑا نہیں تیار کرا سکتا۔ اور جب انگلستان اپنا کپڑا ہندوستان میں فروخت کریگا تو اُسے ہماری روئی بھی چنگی بڑھائے بغیر خریدنا پڑے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ معاہدہ اوٹاوہ کے ذریعہ سے ہندوستان کی تجارت برطانیہ اور سلطنت برطانیہ تک محدود ہوجائے گی اور تمام گاہک ٹوٹ جانے پر ہندوستانی تجارت صرف برطانیہ کے رحم وکرم کی محتاج ہوجائے گی جو ہمارے لئے کسی طرح مفید نہ ہوگا۔

زندگی کی خام خیالیاں

۱۔ صحیح اور غلط کا معیار خود قائم کرکے دوسروں سے توقع رکھنا کہ وہ اس پر عمل کریں۔
۲۔ دنیا میں کسی امر پر اتفاق رائے کی امید رکھنا۔
۳۔ نوجوانوں سے تجربہ کاری کی توقع رکھنا۔
۴۔ ہر شخص پر حکومت کرنیکا خیال باطل رکھنا
۵۔ دوسروں کے جذبات کا اندازہ اپنے نقطۂ نظر سے کرنا۔
۶۔ خود کو نیک اور غلطیوں سے معصوم سمجھنا۔
۷۔ ذاتی مصارف میں تخفیف پیدا نہ کرنا۔
۸۔ جس غلطی کی تلافی نہ ہو سکے اس پر بک بک کرنا۔
۹۔ جو کام خود سے نہ ہو سکے اُسے ناممکن خیال کر لینا۔
۱۰۔ جو بات سمجھ میں نہ آسکے اسے بعید از عقل قرار دینا۔

ضعیف الاعتقادی

(از شریمتی شوکماری دیوی)

وہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے باعث لوگوں کو اکثر خطرناک واقعات پیش آجایا کرتے ہیں جو واقعہ میں بیان کرنے والی ہوں میرا چشم دید ہے۔

میں کانپور میں مقیم تھی۔ میری ایک پڑوسن بھوت پریتوں میں جادو ٹونے میں، اچھے برے شگون میں بہت اعتقاد رکھتی تھیں۔ اور اکثر جوتشیوں، پنڈتوں وغیرہ کو اپنے شوہر اور بچوں کے زائچے دکھا کر آئندہ کے نیک و بد حالات دریافت کیا کرتی تھیں۔ اگر کسی کی گرہ خراب ہوتی تو اس کی تدابیر معلوم کر کے اس پر عمل بھی کرتی تھیں۔ ان کے بچوں میں بھی قدرتی طور سے یہی خیالات سرایت کر گئے تھے امسال ایک پنڈت جی نے جو پڑوسن کا زائچہ دیکھا تو فرمانے لگے، تمہاری گرہ اب کی بہت کڑی ہیں، پچیسویں سال میں الپ (یعنی خطرۂ مرگ) ہے اور سانپ کے ڈس لینے کا اندیشہ ہے۔ اب پڑوسن بیچاری ہر وقت فکر میں مبتلا رہتیں اور اکثر کہا کرتیں کہ ہمارا تو اب کی ایشور ہی مالک ہے۔

سوءِ اتفاق سے ایک روز ایک کالا سانپ بھی ان کے گھر میں نکلا اور ایک کوٹھری میں گھس کر کہیں غائب ہو گیا۔ پھر کیا تھا؟ گویا فرشتۂ موت نے ان کے گھر میں ڈیرا ڈال دیا۔

ایک روز رات کے وقت ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے بستروں پر پڑے تھے کہ دفعتاً پاس کے گھر سے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم لوگ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور پڑوسن کے گھر پہونچ گئے۔ وہاں دیکھا کہ پڑوسن ایک چارپائی پر بیہوش پڑی ہیں، شوہر پریشان سرتھامے بیٹھے ہیں، لڑکے لڑکیاں چیخ چیخ کر رو رہے ہیں "ہائے میری میّا کو کیا ہوا، ہائے میری میّا کو ہائے میری میّا کو کیا ہوا، ہائے میری میّا کو سانپ ڈس گیا"

محلہ والے: "ارے کیا ہوا کیا ہوا؟ کوئی بات تو بتاؤ"

پڑوسن کے شوہر: کیا بتائیں ابھی زینہ پر آ رہی تھیں کہ ایک دم سانپ سانپ کر کے چلائیں۔

اور گر کر بیہوش ہوگئیں۔ سانپ تو کہیں تھا نہیں، ایک بڑا سا ٹڈا ابیٹنگ پاؤں میں لپٹا ہوا تھا۔"

ایک محلہ والا" ارے پنکھا جھلو، ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دو۔"

دوسرا: "ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔ ترس و بابو کو بلالو۔"

تیسرا (بڑی لڑکی سے جس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا) "بیٹی چپ رہو رونے کی کیا بات ہے بیہوشی ہے سو ابھی دور ہوئی جاتی ہے، رونے چلانے سے تو بیمار اور گھبرا جائیگا۔"

اسی طرح سب محلہ والوں نے لڑکے لڑکیوں کو سمجھایا مگر کسی نے رونا چلانا بند نہیں کیا۔ ذرا دیر میں ترس و بابو آئے۔ شور کم ہوا، دوا دی گئی، پنکھا جھلا گیا، پانی کے چھینٹے دیئے گئے۔ مریضہ نے آنکھیں کھولیں اور کچھ کہنا چاہا۔ اتنے میں ایک محلہ والے نے پوچھا "کیا حال ہے؟"

مریضہ: "ارے ظالمو! میں زینہ پر آرہی تھی کہ ایک سانپ اوپر سے گرا اور میرے پاؤں میں لپٹ گیا۔ میں گھبرا کر بھاگی اور گر پڑی۔"

شوہر: "سانپ واپ کہاں تھا ایک ٹڈا تھا بڑا سا۔"

مگر مریضہ نے کچھ نہ سنا وہ پھر بیہوش ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں ان کو پھر ہوش آیا اور طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ آخر سب محلہ والے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

صبح کو پڑوسن نے میری ماں سے کہا "بی بی، اب میں جینے کی نہیں، رات میں نے سپنا دیکھا ہے کہ سامنے والے کمرے میں دو آدمی کھڑے ہیں، لال کپڑے پہنے ہیں جم دوت کے سے سینگ ہیں، مجھے بلا رہے ہیں، باہر ایک پالکی کھڑی ہے۔ یہ سپنا دیکھکر مجھے بڑا ڈر لگا اور میں نے اماں (اپنی ساس) سے کہا کہ کمرے کے کواڑ بند کردو۔"

اماں: "ہاں کہا تو تھا۔"

صبح کو پھر مریضہ کو دورہ ہوا۔ ایک دوسرے انگریزی ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ ان کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر مریضہ کو زنانہ شفاخانہ بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ پانچ سات روز رہیں اور صحتیاب ہو کر اپنے گھر واپس آگئیں۔

ظاہر ہے کہ بی ہمسائی کو یہ ساری پریشانی اور تکلیف اپنے وہم کی بدولت اٹھانا پڑی۔ میں جوتش یا علم نجوم کو برا نہیں کہتی ہوں، لیکن اس کے نتائج پر بھروسہ کرنا خلاف عقل ہی نہیں بلکہ اکثر صورتوں میں جیسا کہ متذکرہ بالا واقعہ سے ثابت ہے بہت ضرر رساں ہے۔ علم نجوم کی صحت کا سارا دارومدار ستاروں کی گردش پر ہے، اور زمین والوں کے لئے آسمان کی باتیں دریافت کرنا ناممکن نہیں

تو محال ضرور ہے۔ ایسی صورت میں نجومیوں کا معتقد ہونا یا اُن کی پیشین گوئیوں پر اعتقاد رکھنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر یہ مانا جاتا ہے کہ قسمت کا لکھا پیش آتا ہے اور ہونی اَمِیٹ ہے تو بھی مستقبل کے حالات جاننے کی فکر کرنا کوئی دانشمندی نہیں کیونکہ اگر کوئی خوشی ہونی والی ہے تو پیشتر ہی اُسے جان لینے سے کچھ فائدہ نہیں بلکہ اُس کا لطف مٹ جاتا ہے، اور اگر رنج نصیب میں ہے تو قبل از مرگ واویلا سے کیا حاصل ؎

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

تقدیر آدم

(چینی شاعر کانگ ۔ وسے)

(۱۵۵ تا ۲۰۸ ق۔م۔)

خزاں کی خنکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے،

برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بہار کے پھول سج جاتے ہیں۔

سورج جب صبح سو کر اٹھتا ہے تو سُرخ رو۔

جب شام کو سونے جاتا ہے تو سُرخ رو۔

چھوٹے چھوٹے چشمے سمندر سے جا ملتے ہیں۔

زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے۔

ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے، ہر آن دریا کا پانی بدلتا ہے۔

مگر آدمی! اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔

یہ مڑکر دیکھتا ہے نہ لوٹ کر آتا ہے۔

اس کی ہستی ایک حباب ہے۔ ٹوٹا اور ختم ہو گیا۔

اس کی زندگانی کا حاصل؟ لاچار و بے بس مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اُگتی ہے۔

(دین دنیا)

سب رس

(از جناب سید احمد اللہ قادری، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن)

نثر اردو کی سب سے پہلی کتاب ابتک فضلی کی "کربل کتھا" سمجھی جاتی تھی، لیکن تحقیقات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ فضلی سے مدت پہلے نثر اردو کے بڑے بڑے مصنف گزرے ہیں اور انھوں نے بہت سی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں حسن و دل کا فسانہ (جو سب رس کے نام سے مشہور ہے) عین القضاۃ کی تمہیدات کا ترجمہ میران یعقوب کی شمایل الاتقیا ممتاز حیثیت رکھتی ہیں، اور یہ سب کتابیں دکن میں لکھی گئی ہیں۔

سب رس کا مصنف ملا وجہی گولکنڈہ کا مشہور شاعر اور زبردست مصنف ہے، اسکی عمر کا بہترین زمانہ سلطان محمد قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ کے دربار میں گزرا ہے اور اس نے فارسی کے علاوہ دکنی نظم و نثر میں تین کتابیں لکھی ہیں:۔

(۱) مثنوی قطب مشتری (۲) تاج الحقایق (۳) سب رس۔

مثنوی قطب مشتری ۱۰۱۸ھ میں لکھی گئی ہے، اس میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حسن و عشق کی داستان ہے۔

تاج الحقایق اخلاق و تصوف کا رسالہ ہے اور مثنوی قطب مشتری کے بعد تصنیف ہوا ہے

سب رس ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے اور وجہی کی اخیر کتاب ہونے کے لحاظ سے اسکے بہترین شاہکاروں میں شامل ہوتی ہے اور ادبی حیثیت سے اسے حیات دوام حاصل ہے۔

سب رس کا قصہ بڑا عجیب و غریب قصہ ہے۔ اس کا انداز بیان بھی سب سے نرالا اور الگ ہی ہے۔ اس میں عشق و محبت کی عجیب کشمکش ہے اور حق تو یہ ہے کہ وجہی نے قصہ نگاری میں اپنا پورا زور اور کمال دکھایا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب رس کس کتاب کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی۔ کیونکہ اسکا ماخذ وجہی نے کہیں بھی نہیں بتایا ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ وجہی کی دماغی کاوش کا رہین منت ہے۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ بے مثل داستان یحیی ابن سیبک فتاحی نیشاپور کے دماغ کی اُپج ہے، یہ بزرگ شاہرخ مرزا کے عہد میں گزرے ہیں، انکا انتقال ۸۵۲ھ میں ہوا۔

فتاحی کی مثنوی دستور عشاق بہت مشہور مثنوی ہے جس کے پانچ ہزار اشعار ہیں، اسکا خلاصہ خود فتاحی نے بعد میں شبستانِ خیال اور حسن و دل کے دو علٰحدہ علٰحدہ ناموں سے کیا تھا۔

حسن و دل مسجع و مقفیٰ نثر میں ہے یہ مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوئی اور یورپ میں اسکے تین ایڈیشن ترجموں کے ساتھ چھپے، سب رس کا ماخذ بھی یہی ہے۔

حسن و دل چونکہ دستور عشاق کا خلاصہ ہے اسلیے یہ دستور عشاق کی طرح واضح نہیں ہے۔

ہندوستان کے شعرا میں داؤد دایلچی نے اس فسانے کو ۱۰۵۵ھ میں فارسی میں نظم کیا۔ یہ نظم بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

خواجہ محمد بیدل نے جو عہدِ عالمگیر کے مشاہیر میں گزرے ہیں ۱۰۹۵ھ میں انھوں نے اِسے فارسی نثر میں لکھا ہے۔

ترکی زبان کے شہرہ آفاق شاعر لامعی نے بھی اسے اپنی زبان میں تحریر کیا، اسکے سوا اور تین ترکی شعرانے (جنکے نام آہی۔ والی۔ صدقی ہیں) اسے نظم و نثر میں لکھا۔ ان میں سے لامعی اور آہی کی تصنیفات نثر میں ہیں اور باقی دو کی نظم میں۔ اہل دکن نے بھی اس قصہ کو فراموش نہیں کیا بلکہ اُن تمام سے زیادہ اسکی قدر افزائی کی، چنانچہ دکن کے ایک شاعر شاہ حسین ذوقی نامی نے اس قصہ کو ۱۱۰۹ھ میں نظم کیا ہے اور اسکی کتاب کا نام "وصال العاشقین" ہے۔

دوسرے بزرگ جعفری ہیں جنھوں نے اسکو مثنوی گلشن حسن و دل کے نام سے ۱۱۰۶ھ میں منظوم کیا۔

مختصر یہ کہ ان تمام مصنفین نے مولانا فتاحی سے سب کچھ اخذ کیا ہے اور انھیں سے خوشہ چینی کی۔ وجہی نے قصہ کو بامزہ اور پُر لطف بنانے کے لئے ایک خاص خوبی یہ پیدا کی ہے کہ افراد اور مقامات کے نام بڑے ہی دلکش انتخاب کئے ہیں۔

سب رس اب سے کچھ سال پہلے بڑی نایاب سمجھی جاتی تھی اور اسکی حقیقت سے بہت کم اصحاب واقف تھے ابتدا میں مولوی عبدالحق صاحب نے جو ہندوستان کے مشہور مقدمہ نویس ہیں اس پر ایک عالمانہ مضمون لکھکر رسالہ اُردو میں طبع کرایا اور جب انھیں اسکے متعدد نسخے ملے تو اُن کی مدد سے ایک

صحیح نسخہ تیار کیا اور اسے اپنے ایک مبسوط و محققانہ مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع کرایا۔ اصل کتاب کے تین سو صفحے ہیں، آخر میں سولہ صفحہ کا فرہنگ بھی شامل ہے جسمیں قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بتلائے گئے ہیں۔ اُنھوں نے اس کتاب کو اس انداز میں ایڈٹ فرمایا ہے جس طرح کہ مستشرقین یورپ اہل مشرق کی کتابیں ایڈٹ کیا کرتے ہیں۔ باوجود اس قدر ضخامت اور خوبیوں کے کتاب کی قیمت نہایت ہی کم مقرر کی ہے (مجلد چار روپیہ بے جلد تین روپیہ آٹھ آنہ) اور ہر صاحب ذوق اسے خرید کر مستفید ہو سکتا ہے۔

ہم انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) اور اسکے معزز معتمد کی خدمت میں مبارکباد عرض کرتے ہیں کہ انھوں نے سبرس جیسی بے مثل کتاب کو انجمن کے لئے انتخاب کیا۔ حقیقت میں ایسی کتابوں کی اشاعت کی ہماری زبان کو شدید ضرورت ہے تاکہ زبان اُردو کے ادب سے واقفیت حاصل ہو اور علم الالسان کے دقیقے ان سے بآسانی حل ہوں۔ اور یہ ایسی بے لوث خدمات ہیں کہ ان کا اعتراف کرنا ہم ایسے تہی دستوں سے ناممکن ہے۔

دیگر مطبوعات

پھل بوٹ

مصنفۂ جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل جودھپور۔ کتابت و طباعت نفیس تقطیع ۲۰+۳۰ ضخامت ۱۷۶ صفحات قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: دفتر کتابت عظیم بیگ چغتائی جودھپور

یہ ناول نما کتاب تین حصوں اور تیئیس ۲۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک بے اصول اور دل پھینک کا قصۂ عشق و محبت درج ہے جو ملازم ہوکر ایک قصبہ میں جاتا ہے، وہاں شفاخانہ کی ایک ڈاکٹرنی مس سنگھ سے شناسائی اور پھر عشق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہیرو رخصت لیکر گھر جاتا ہے اور وہیں بیٹھے بیٹھے بذریعہ خط و کتابت دونوں کی شادی طے ہو جاتی ہے۔ اسی دوران میں ایک دوسری لڑکی ہیرو کے سر منڈھ دی جاتی ہے اور آپ باوجود مس سنگھ کے عاشق اور اسکے منگیتر ہونیکے اس لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ مس سنگھ کو جب یہ حال معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

قصہ کی تحریر کسی قدر مزاحیانہ شوخی لئے ہوئے ہے۔ طرز ادا وہی ہے جو چغتائی صاحب کی ہمیشہ ہوتی ہے۔ اس ناول میں کوئی ترقی نہیں کی گئی ہے۔ بعض بعض جگہ قابل داد نادر ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں لیکن اکثر جگہ زبان کے نقائص رہ گئے ہیں ذیل میں دونوں کے نمونے نذر ناظرین ہیں۔

"کسی نا اہلی نے ایک گاڑی عورتیں اس طرف بھی اتار دی تھیں۔" اس میں "ایک گاڑی عورتیں" حسین جملہ ہے۔

"منّی بی اپنے ہونٹوں سے مختلف سائز کے جلدی جلدی صفر بناتی تھی۔" یہ پوپلے منہ کی حرکت سے "صفر بنانا" بہت خوب ہے۔

"بسا اوقات بے بس ہو کر جی چاہتا کہ اپنی گھڑی میں زیادہ بجا لوں۔" اس میں جذبات فطرت و بیقراری کی دلآویز تصویر ہے۔

"اس کی خوبصورت پلکوں میں موتی لٹک رہے تھے اور ہر قطرہ میں مجھے دجلہ دکھائی دیا۔" قطرہ میں دجلہ قابل تعریف ہے۔

چغتائی صاحب زبان لکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن زبان انھیں نہ کبھی آئی تھی نہ آئے گی۔ اب چند نمونے آپ کی ولندیزی اُردو کے بھی ملاحظہ ہوں :۔

صفحہ ۲۴ سطر ۹ پر "کون نہ علاج کرانے لگ جائیگا۔ صفحہ ۲۲ سطر ۲ میں مس سنگھ کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ "وہ میری پہلی لڑکی دوست تھی" غالباً یہ "She was my first girlfriend" کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ صفحہ ۳۰ سطر ۳ میں "میں نے شیر کے گولی دی ہے اور وہ زخمی ہو کر دھاڑتا ہے۔" مگر گولی ماری جاتی ہے یا گولی رسید کی جاتی ہے۔ گولی دینا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ صفحہ ۳۶ پر یہ فقرہ کہ "گھٹنے کے یہ زخم دراصل ایک کٹکھنے کتے نے مجھے دوڑا کر بدحواس کر دینے کے بعد گرا کر پہونچائے تھے۔" کس قدر الجھا ہوا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۴۱ سطر ۱۲ پر ٹھونکنے کے لئے" لکھا گیا ہے مگر قینچیں ہانکی جاتی ہیں جنہیں ماری جاتی ہیں لیکن "ٹھونکی" نہیں جاتی۔ اسیطرح اور بھی بعض مقامات میں نظرثانی کی ضرورت ہے جو امید ہے دوسرے ایڈیشن میں ہو جائیگی۔

شریر لڑکا

یہ چھوٹا سا ڈراما ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر فلسفہ و تعلیمات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا لکھا ہوا ہے اسکی کتابت وطباعت نفیس ہے چھوٹی تقطیع پر ٹائپ میں انگریزی وضع کے ٹائٹل کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ اس ڈرامے میں پانچ دلچسپ اور سبق آموز سین ہیں۔ اسکی زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس، خیالات شریفانہ اور پلاٹ سبق آموز ہے۔ غرض ہر حیثیت سے ڈراما اس قابل ہے کہ قوم کا ہر بچہ اسکا مطالعہ کرے۔ ہم فاضل مصنف کی اس ادبی خدمت کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شائقین جامعہ ملیہ دہلی سے طلب فرمائیں۔

مثنوی مقام محمود

مصنفہ آغا محمد صدیق حسن صاحب ضیا راولپنڈی۔ یہ رسالہ ہے تو چھوٹا سا مگر شروع سے آخر تک جواہر پاروں سے بھرا ہوا ہے۔ تخلیق آدم اور بعثت و معراج محمد عربی صلعم کے مضمون کو نہایت لطیف اور دلآویز پیرایہ میں نظم کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار ذیل میں درج کرتے ہیں جو ظہور نبوی پر ہیں:-

یکایک مبدّل ہوا سب نظام — کیا نازسے زندگی نے خرام
یکایک نگاہوں سے اٹھا حجاب — نئے رنگ میں آئی کہنہ شراب
یکایک برسنے لگا ابرِ نور — کیا ساقیِ زندگی نے ظہور
لئے بزمِ ہر دو جہاں کی کلید — زمیں کی کلید، آسماں کی کلید
نگاہوں میں جادو کا ساماں لئے — تنفس سے دنیا کو زندہ کئے
پیامِ اخوت سناتا ہوا — سمندر سے کف کو ملاتا ہوا
کہ ہر مہ کے دل کو سبنھالے ہوئے — گل و خار پر سایہ ڈالے ہوئے
رموزِ تمدن سکھاتا ہوا — ہر اک اجڑے گھر کو بساتا ہوا
مئے بیخودی یوں پلاتا ہوا — کہ دم میں خدا سے ملاتا ہوا
جفاؤں کو برباد کرتا ہوا — غلاموں کو آزاد کرتا ہوا
رموزِ کفالت سمجھتا ہوا — ہر اک دل کی حالت سمجھتا ہوا
پیامِ محبت سناتا ہوا — ہوا جلوہ گر مسکراتا ہوا

کتاب کے شروع میں پانچ صفحات کا ایک "تعارف" بھی مولوی عبد العزیز خاں صاحب صدر بزم ادب راولپنڈی کا لکھا ہوا ہے۔ اس مختصر تحریر میں دو لفظوں کے استعمال پر بعض شناسانِ ادب کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ پہلے ہی صفحہ کی آخری دو سطروں میں تحریر ہے "گذشتہ دو سالوں میں مجھے بزم ادب کے اکثر مظاہروں میں شمولیت کا فخر حاصل ہوا" اس عبارت کا مفہوم صرف "دو سال" سے [illegible] پورا ہو سکتا تھا۔ دوسرے "شمولیت" کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ یہاں شرکت چاہیئے۔ مثلاً کاغذ شاملِ مسل ہو سکتا ہے مگر شریکِ مسل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح "شریک" اور "شامل" کے استعمال میں فرق ہے۔ بہرحال کتاب بہت اچھی ہے۔ رموز شناسانِ تصوف بہرہ اندوز ہوں۔ اس کا حجم چھوٹی تقطیع کے چالیس صفحات لکھائی اور کاغذ عمدہ لیکن چھپائی خراب۔ قیمت درج نہیں، غالباً انجمن خدام اسلام راولپنڈی سے مفت مل سکتی ہے۔

تاجِ آفرینش

مترجمہ جناب عبدالحمید صاحب نعمانی کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی غنیمت تقطیع ۲۲×۱۸ صفحات علاوہ ٹائیٹل ۱۰۶۔ شروع میں مصنفہ کی عکسی تصویر۔ قیمت دس آنہ ملنے کا پتہ اجمل بکڈپو پرنسیس بلڈنگ بمبئی نمبر ۴

اصل کتاب عربی زبان میں تھی جس میں مصر کی ایک مشہور اہل قلم خاتون ملک خانم عرف "باحثۃ البادیۃ" (صحرا میں جھگڑ کر بحث کرنے والی) کے بیشبہا مقالات ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔ تمام مضامین عالم نسواں سے تعلق رکھتے ہیں اور اصلاحی ہیں۔ لائق مصنفہ نے زن و شوہر کے تعلقات پر قابل قدر ہدایات لکھی ہیں جن کا مطالعہ اہل ہند کے لئے بھی مفید ہوگا۔ فاضل مترجم نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے ہندوستانیوں پر احسان کیا ہے۔ شروع میں "باحثۃ البادیۃ" کی مختصر سوانحعمری بھی ہے۔

رامائن مسدس

جناب منشی رائجی مل صاحب سنبھلی المتخلص بہ رام کی تصنیف لطیف ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ اور دیدہ زیب۔ جلد نفیس و مطلا جس پر کتاب کا نام طلائی حروف میں درج ہے۔ موقع بموقع پنج رنگی سہ رنگی اور بلاک کی متعدد تصویریں بھی دیگئی ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی خوبیاں دوبالا ہوگئی ہیں انہیں ایک مطلا و مذہب پنج رنگی تصویر "شری رام پنچایتن" کی خاص طور پر خوبصورت و گرانبہا ہے

رامائن کے عقیدتمندوں کے لئے یہ نسخہ ذریعہ مغفرت ہے۔ نازک خیال شاعر کے جودت طبع نے اکثر مقامات پر اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔ (۱) دھنش یگیہ (۲) رانی کیکئی اور منتھرا کا مکالمہ (۳) بن باس کا بروان (۴) بھرت جی کی کوشلیا جی سے گفتگو (۵) چترکوٹ کے واقعات (۶) رامچندر جی کا بھرت سے مباحثہ (۷) انسویا جی کا اپدیش وغیرہ وغیرہ کا بیان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بڑی تقطیع کے تین سو صفحات پر یہ رامائن ختم ہوئی ہے۔ قیمت مجلد ۳ے/ شائقین زمانہ بک ڈپو کانپور سے طلب فرمائیں۔

آئینہ دہلی جناب سید ابن الحسن فکر ایم۔ اے کی زیر ادارت دہلی سے ایک ماہواری رسالہ اڑھائی جز پر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ تقطیع بڑی ہے طباعت و کتابت اور کاغذ سب عمدہ خصوصاً رنگین ٹائیٹل پیج نظر فریب ہے۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنہ ششماہی بارہ آنے فی پرچہ دو آنہ ۲/

اس رسالہ کی ترتیب و نوعیت مضامین دونوں قابل تعریف ہیں اور امید ہیں کہ اگر پبلک نے قدر کی تو یہ رسالہ ادبیات اُردو کی معقول خدمات انجام دیگا۔ فروری ۱۹۲۳ء نمبر میں بعض تاریخی اور علمی مضامین کافی شائع ہوئے ہیں۔

یادِ رفتگان

(۱) پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم

از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی

پارسال جب پنڈت پدم سنگھ شرما ہندوستانی اکیڈمی میں ۷ مارچ کو اپنی معرکۃ الآرا تقریر "ہندی اُردو اور ہندوستانی" کو ختم کرکے الٰہ آباد سے روانہ ہوئے تھے تو کسے معلوم تھا کہ فرشتۂ اجل انھیں کشاں کشاں اسی گانوں کو لئے جا رہا ہے جہاں وہ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور جہاں پہونچنے کے بعد پندرہ بیس دن کے اندر ہی اُنکی وفات ہو جائیگی۔ تقریر کا موضوع اُردو اور ہندی زبانوں سے ایک مشترکہ ہندوستانی زبان کا عالمِ وجود میں لانا تھا وہ اکیڈمی ہی کے فرمایش پر تیار کیگئی تھی، وہی مرحوم کی آخری ادبی یادگار ہے جس کے لئے انھیں اکیڈمی سے ایک ہزار روپیہ حق المحنت عطا ہوا تھا۔ اس معاملہ میں ارکان اکیڈمی کی نظر انتخاب کا قائل ہونا پڑتا ہے، اس تقریر کیلئے پنڈت جی سے موزوں تر شخص کا ملنا واقعی دشوار تھا۔

مرحوم کا وطن موضع نائک نگلا، چاندپور، ضلع بجنور تھا۔ اس وقت وہاں پلیگ پھیلا ہوا تھا، اور باشندگانِ موضع اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر جان بچانے کی فکر کر رہے تھے، مرحوم کو بھی گانوں چھوڑ کر چلے جانے کا مشورہ دیا گیا۔ مگر وہ نوشتہ تقدیر کے معترف اور عوام کی خدمت کے دلدادہ تھے۔ گانوں والوں کو مصیبت میں چھوڑ کر باہر کیسے جاتے۔ انھیں ویدک طریقۂ علاج میں خاص مہارت تھی۔ اس وقت انھوں نے غریبوں کی دوا علاج کرنا ہی اپنا فرض خیال کیا اور گھر ہی پر مقیم رہے۔ آخر وبا کے زور سے وہ خود بھی محفوظ نہ رہ سکے، اور دس گیارہ روز بیمار رہکر ۷ اپریل ۱۹۳۲ء کو جان بحق تسلیم ہوئے، علم و ادب کے سچے خادم تھے، مرتے مرتے اپنی جان عزیز کو قومی خدمت پر قربان کر دیا۔ ہندوستان اور خصوصاً ہمارے صوبہ کی ادبی انجمن میں ایک ممتاز جگہ ہمیشہ کے لئے خالی ہو گئی۔

پنڈت جی آریہ سماجی تھے، انھوں نے سب سے پہلے آریہ سماج کے اپدیشک کا کام کیا تھا۔ اوّل اوّل مضمون نگاری کے سلسلہ میں انھوں نے گورو کل کانگڑی کے ہفتہ وار اخبار ستیہ وادی میں مضامین بھی لکھے تھے، جس کے وہ ۱۹۰۴ء میں اڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ پھر ۱۹۰۸ء میں وہ ویدک پریس اجمیر کے پراپکاری نامی اخبار کے اڈیٹر ہوئے تھے، اور ۱۹۰۹ء و لغایت ۱۹۱۱ء انھوں نے مہاودیالیہ جوالاپور کے بھارت ودے اخبار کی

اڈیٹری کے فرائض انجام دے چکے تھے، آخر الذکر موقع پر وہ مہاودیالیہ کے سکریٹری اور پروفیسر بھی تھے یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی فرقہ وارانہ خدمات سے متاثر نہیں ہوئے۔

درحقیقت پنڈت جی فطرتاً ایک ادبی شخص واقع ہوئے تھے اور ان میں وہی فراخ دلی تھی جسے خالص ادبی زندگی کا جزو لاینفک سمجھنا چاہیے، وسیع مطالعہ نے ان کے خیالات کو اور بھی وسیع بنا دیا تھا، وہ صرف سنسکرت، ہندی، اور برج بھاشا ہی کے عالم نہ تھے، بلکہ فارسی اور اُردو زبانوں پر بھی انھیں پورا عبور تھا، وہ ہر زبان کی کتب کی خریداری میں سینکڑوں روپیہ خرچ کرتے تھے، ان کے کتبخانہ میں ہزارہا کتابیں ہیں مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ انھیں اسکی دُھن میں کھانے پینے، بیماری صحت، رات دن، کسی بات کا خیال نہ ہوتا تھا، پھر انکا مطالعہ بھی کوئی رواروی کا پڑھنا نہ تھا، بلکہ وہ ہر کتاب کو غائر نظر سے دیکھتے ہوئے نشان لگاتے جاتے اور حاشیہ پر نوٹ بھی لکھتے جاتے تھے، وہ جو کچھ پڑھتے تھے محض پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ کچھ سیکھنے کے لئے، بستر مرگ پر پڑے رہنے کی حالت میں بھی انکا یہ شوق کم نہ ہوا تھا۔ پڑھنے کی سکت باقی نہ رہنے پر وہ دوسروں سے پڑھوا کر سننے کے برابر متقاضی رہے۔

گیتا اور رامائن کے ساتھ ہی انھیں حافظ، خیام، سعدی، وغیرہ شہرۂ آفاق فارسی شعراء سے بھی گہری عقیدت تھی، اُردو میں آزاد، حالی، اور اکبر کے بہت بڑے معتقد تھے، خصوصاً اکبر کے کلام سے تو ان کو ایک طرح کا عشق تھا۔ شری جی خود بھی بہت زندہ دل، شوخ طبع اور ظرافت پسند واقع ہوئے تھے، بہر حال ان کی یہ عقیدت اکبر کی زندگی ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اب بھی جب کبھی وہ الہ آباد جاتے تو اکثر انکے مزار پر جاکر پھول چڑھاتے، اکبر مرحوم بھی ان کے بڑے مدّاح تھے، کہا کرتے تھے کہ اگر میری فطرت کو کسی نے سمجھا ہے تو پنڈت جی نے۔

انھیں ہر زبان کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنھیں وہ اکثر مزہ لے لیکر پڑھا کرتے اور رقّت سے آبدیدہ ہو جاتے، تحریر و تقریر میں بھی بکثرت استعمال کرتے تھے، خصوصاً اُردو اشعار کی تو بھرمار ہی رہتی تھی ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہوا کرتے تھے، رواں، چُست فقرات اور برجستہ اشعار سے مملو، جذبات سے معمور اور ہندوستانی زبان کا رنگ لئے ہوئے اکثر شاعرانہ مسائل کو بھی بڑی خوبی سے حل کیا کرتے تھے، جو ان کے علم عروض سے واقفیت کا ایک بیّن ثبوت تھا، وہ مضمون لکھنے میں بڑے کاہل تھے مگر خط لکھنے میں وہ سہل انگاری کو ذرا بھی دخل نہ دیتے۔ اور اپنا بہت سا وقت اسی کام کی نذر کرتے تھے، ڈاک کی راہ دیکھنا بھی ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔

ہندی مشاعروں میں تو وہ دباؤ میں پڑ کر ہی جاتے، مگر اُردو مشاعروں کی شرکت اور صدارت بخوشی

شوق سے کرتے، کہا کرتے کہ اُردو اور ہندی مشاعروں میں دن رات کا فرق ہے، وہ خود دونوں کے قدردان تھے، اور چاہتے تھے کہ ہندی شعرا زیادہ لگن سے کام کرتے ہوئے ہندی مشاعروں کو بھی کامیاب بنائیں۔

ان کا اخلاق بہت قابل ستایش تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے وہاں کے مشہور خادمان ادب سے ضرور ملتے پیش قدمی کے لحاظ سے انھیں چھوٹائی بڑائی کا بھی مطلق خیال نہ ہوتا تھا نومشق احباب کی وہ کھلے دل سے حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور جب انھیں کسی کی لکھی ہوئی کوئی چیز پسند آجاتی تھی تو فوراً بذریعہ تحریر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے تھے، اس کے برخلاف وہ ناپسندیدگی کی حالت میں عموماً قلم نہ اٹھاتے لیکن جب اٹھاتے تو کھری کھری کہہ ڈالنے میں انھیں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔

بے لوث تنقید نگاری ان کا خاص وصف تھا۔ وہ کسی کی رو رعایت کرنا نہ جانتے تھے، انکی شہرت کی ابتدا اسی فن کی بدولت ہوئی تھی، پنڈت جوالا پرشاد مصر مرادآبادی مرحوم نے "بہاری ست سئی" کی شرح لکھی تھی، آپ نے اس کی تنقید میں ایک سلسلہ مضامین سرسوتی میں چھپانا شروع کیا تھا، جو بعد کو "ست سئی سنگھار" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اس میں پنڈت جی نے مصر جی کی بُری طرح خبر لی تھی، آجکل کوئی اس طرز تحریر کو پسند کرے یا نہ کرے، مگر وہ اپنی صاف گوئی سے مجبور تھے، ساتھ ہی وہ اپنے لئے بھی کھری کھوٹی کہے جانے پر برا نہ مانتے تھے، دل میں کدورت رکھنا وہ کسی حالت میں بھی روا نہ رکھتے تھے۔

استغنا اور وضعداری کا یہ حال تھا کہ آپ جب مہاودیالیہ جوالاپور میں کام کرتے تھے اس وقت بابو شیام سندر داس نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے ایک سو روپیہ مشاہرہ پر بلایا تھا مگر آپ نہ گئے، اسیطرح مالوی جی نے بھی ہندو یونیورسٹی کی پروفیسری کے لئے طلب کیا تھا جہاں معقول ترقی کی امید تھی مگر پنڈت جی کو روپیہ کی طمع نہ تھی، مہاودیالیہ میں انکی تنخواہ پچاس روپیہ سے زیادہ نہ تھی، مگر وہ وہاں کیلئے اپنی خدمات کو زیادہ مفید و کارآمد سمجھتے تھے، گھر کے امیر نہ تھے مگر دل کے کہیں زیادہ امیر تھے، طلبا کو ہمیشہ بڑے شوق سے پڑھاتے اور کسی قسم کا معاوضہ لینا گوارا نہ کرتے تھے، بلکہ بسا اوقات وہ ان کی روپیہ پیسہ سے مدد بھی کرتے تھے،

جہاں پنڈت جی ہوتے ہر وقت ایک مجلس سی لگی رہتی، آنے جانے والوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا پنڈت جی ہر ایک کے ساتھ خلق وانکسار سے پیش آتے، وہ چائے پینے کے بہت عادی تھے، جسے انھوں نے مطالعہ کیلئے زیادہ سے زیادہ دیر تک جاگتے رہنے کی غرض سے پینا شروع کیا تھا، مگر نہ وہ تنہا پیتے تھے

اور نہ پہلے بلکہ "الیاں" مجلس کو امراء کے ساتھ بلاکر پھر خود پیتے تھے، مہمانوں کی تواتنی آؤ بھگت کرتے کہ ان کا پنڈت جی سے جلد نجات پاجانا مشکل تھا۔

پنڈت جی کی یادگار تصنیف انکی لکھی ہوئی "بہاری ست سئی" کی شرح ہے جسمیں ست سئی کے تقریباً سوا سو دوہوں کی تفسیر کیگئی ہے، کتاب کا نصف حصہ دیباچہ کی نذر ہوا ہے، جسمیں انھوں نے دوہوں کا سنسکرت، ہندی، اردو اشعار سے موازنہ کرتے ہوئے دوہوں کی فضیلت دکھلائی ہے، یہ کتاب نہایت دلکش پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ اور پنڈت جی کے علمی تبحر کا پتہ دیتی ہے افسوس کہ بار بار ارادہ کرتے ہوئے بھی وہ اسے مکمل نہ کر سکے حالانکہ انکو اس نامکمل شرح پر ۱۹۲۲ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کیطرف سے بارہ سو روپیہ کا منگلا پرشاد انعام ملا تھا اور ازاں بعد ۱۹۲۳ء میں وہ سمیلن مذکور کے صدر منتخب ہوئے تھے، اجلاس مظفر پور میں ہوا تھا۔ اس کے آٹھ برس پہلے وہ سمیلن کے صوبجاتی اجلاس کے صدر ہو چکے تھے جو مرادآباد میں منعقد ہوا تھا، انکی آخری مطبوعہ تصنیف پدم پراگ ہے جو انکے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اسکے دیباچہ میں آپ اپنے مضامین سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اسوقت دل ٹھکانے نہیں ہے، دل کے ٹکڑے۔ جگر کے پارے جدا ہو رہے ہیں! .... جو مدت سے چھپے ہوئے تھے وہ چھپکر باہر نکل رہے ہیں! .... کیا پڑی تھی جو یوں اُجالے میں ظاہر ہو کر نکل پڑے! .... میرے نغمے میرے پاس پڑے رہتے .... بڑی آرزوؤں سے بڑی منتوں سے بلایا تھا نہ جانے تمہارے دھیان میں کتنی راتوں کو دن اور کتنے دنوں کو رات کر کے تمہارے درشن نصیب ہوئے تھے، ... پوری نگرانی اور خبر داری سے پال پوس کر بڑا کیا تھا اب جدا ہو رہے ہو اتنے دنوں کا ساتھ چھوڑ رہے ہو، کس دل سے کہوں اور کیسے کہوں کہ جاؤ؟"

پنڈت جی کو نام و نمود سے بہت نفرت تھی جسکو انھوں نے سطور بالا میں عجیب شاعرانہ کنایہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔
وہ عموماً ہندی ہی میں لکھا کرتے تھے اسکا سبب انکا دیرینہ معمول ہی تھا نہ کہ ہندی اردو کے تعلق سے کسی قسم کا امتیازی خیال، سچ پوچھیئے تو انکی تحریریں اردو ہی کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے، بہرحال ان خصوصیات کے لحاظ سے ہم پنڈت جی کے طرز تحریر کو ہندوستانی ہی کہنا قرین انصاف سمجھتے ہیں۔

پنڈت جی کے مزاج میں کافی قدامت پسندی بھی تھی، اکثر گنگا اشنان کرتے متبرک مقامات میں پاکیزگی و عقیدت کیساتھ ہی جانا مناسب سمجھتے تھے اپنے گرو کی خدمت میں جاتے تو انکے قدموں پر سر رکھکر سجدہ کرتے اور کچھ نہ کچھ بھینٹ بھی دیتے، بزرگوں کی واجبی تعظیم اور ادبی مشاہیر کا کما حقہٗ احترام کرتے، یہی وجہ تھی کہ وہ آریہ سماجی ہوتے ہوئے بھی گورو کلوں کے جدید فضا سے بیزار رہتے اور ان کے مجمعوں سے حتی الامکان دور رہنا چاہتے تھے۔

بچپن میں آپکی صحت نہایت عمدہ تھی مگر کثرت مطالعہ اور چائے کے بیجا استعمال نے ان کی صحت میں گھن لگا دیا تھا۔ وہ لکھتے کم تھے مگر جب کبھی لکھتے تو رات کے سناٹے میں۔ اس مصروفیت میں وہ اکثر راتوں کی رات آنکھوں میں کاٹ دیتے۔ انھیں دیرینہ بے اعتدالیوں کے اثر سے وہ اسطرح اکثر بیمار رہا کرتے تھے، اور افسوس یہ بے لوث خادم ادب صرف پچپن سال کی عمر میں پیوند خاک ہو گیا۔ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(۲) آروگیہ سوامی مودیلیار مرحوم

افسوس کہ ۲۰ رجنوری ۱۹۳۳ء کو گورنمنٹ مدراس کے سابق وزیر دیوان بہادر آر۔این آروگیہ سوامی
مودیلیار کا ۶۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ آپ عیسائیوں کے رومن کیتھولک فرقہ کے ایک معزز ممبر اور
صوبۂ مدراس کے محکمۂ انجنیری کے ایک ممتاز رکن تھے۔ اپنے محکمہ میں آپ کو تمام صوبہ کے اندر قابل فخر شہرت
وعزت حاصل تھی۔ چنانچہ سپرنٹنڈنگ انجنیر کے مرتبہ تک پہونچنے کے بعد آپ ۱۹۲۵ء میں اس سے کنارہ کش ہوگئے تھے
سرکاری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوکر آپ خدمت قوم و وطن پر کمربستہ ہوئے اور سیاسی خدمت کی بدولت آپکو
قوم اور فرقہ میں اسقدر زبردست اثر حاصل ہوگیا کہ آپ مسٹر رتنا سوامی سابق پریسیڈنٹ مدراس کونسل جیسے ممتاز ذی اثر
لیڈر کے مقابلہ کامیاب ہوکر مدراس کونسل میں داخل ہوگئے ۱۹۲۶ء کے انتخابات کونسل میں جب "جسٹس پارٹی" کو شکست
ہوئی۔ اور سوراجیوں نے وزارت قبول کرنیسے انکار کردیا تو انڈیپنڈنٹ پارٹی کو جس سے مرحوم کا تعلق تھا کارگذاری
دکھانیکا موقع مل گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر سوبرایان وزیر اعظم مقرر ہوئے، اور انھوں نے آروگیہ سوامی مودیلیار کو علاوہ وزارت
سپرد کرکے اپنا رفیق کار بنالیا چونکہ مسٹر آروگیہ سوامی کو پبلک ورکس سے قدرتی لگاؤ تھا اور وہ اسمیں کارہائے نمایاں انجام
دے چکے تھے، اسلئے انھیں نشو و نما و ترقی امور عامہ کے محکمے سپرد کئے گئے جنسے انکے تمام اسباجوان محکموں سے
تعلق رکھتے تھے پورے نہ ہوئے، مرحوم نے اپنی دیانتداری، آزادی پسندی اور قوم پرورانہ خیالات کے باعث بہت جلد ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیا

ایکسال بعد جب سائمن کمیشن ہندوستان میں آیا اور ملک کیطرف سے اسکا بائیکاٹ کیا گیا۔ تو دونوں مودلیار
وزیر چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پھنس گئے۔ یعنی آئینی مسائل کے متعلق ایکطرف تو وزیر اعظم مدراس سے اور دوسری
طرف خود گورنر صوبہ سے آپ کا اختلاف رائے ہوگیا جسکی وجہ سے آپنے اپنے رفیق کار مسٹر رنگ ناتھ مودلیار کے
ساتھ جرأت اور حوصلہ مندی سے کام لیا اور دونوں اصحاب مارچ ۱۹۲۸ء میں اپنے عہدوں سے مستعفی ہوگئے،
اس جرأت و حوصلہ مندی سے ہر دو وزراء یعنی آروگیہ سوامی اور رنگ ناتھ مودلیار کی عزت و وقعت پبلک کی نظر
میں بیحد بڑھ گئی، اس واقعہ کے بعد سے مرحوم تادم مرگ نیشنلزم کے پرستار رہے اور ترقی پذیر اصلاحات کیلئے کام کرتے رہے،
انکی بقیہ عمر انسداد شراب نوشی، سودیشی پروپگنڈا، مخلوط انتخابات اور دیگر سرگرمیوں میں گذری آپنے کبھی دب کر کوئی بات
نہیں کی جب کبھی آپ کونسل میں تقریر کرتے تھے تو ہمیشہ متانت شان اور بیخوفی سے اپنے دلی مطالب کو بیان کردیا
کرتے تھے، آپ ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے آرزومند رہتے تھے، چنانچہ گذشتہ اتحاد کانفرنس الہ آباد میں آپنے شرکت فرمائی تھی،
رائے کے معاملہ میں آپ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، افسوس آپکی عمر عزیز نے وفا نہ کی۔ اور آپکی وفات سے صوبہ
مدراس کا ایک مشہور اور آزمودہ کار محب وطن، عیسائی فرقہ کا ایک معزز و متدین رکن اور ملک کا ایک سیاسی اور بے لوث بہی خواہ اٹھ گیا۔

عالمِ نسواں

امسال ۲۴ لغایت ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء آل انڈیا مسلم ومنس کانفرنس کا اجلاس آگرہ میں منعقد ہوا۔ اسکے ساتھ صنعت وحرفت کی ایک نمائش بھی کیگئی تھی جسکا سلسلہ ۲ مارچ تک جاری رہا۔ بیرونجات سے تقریبًا پانسو خواتین ڈیلیگیٹ آئی تھیں، بہت سی ہندو لیڈیاں بھی شریک تھیں جلسہ کی کارروائی بیگم رحمٰن کی صدارت میں شروع ہوئی جو آگرہ کے سول سرجن لفٹننٹ کرنل رحمٰن کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ بر جیس دلہن سکریٹری نے سالانہ رپورٹ پڑھکر سنائی جسمیں انجمن مذکور کی شاخ آگرہ کی مفصل کارگذاری بیان کی گئی تھی بیگم رحمٰن صاحبہ نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ ہندوستان کی عورتونکو اپنے وطن کا مستقبل تعمیر کرنے میں بہت کچھ حصہ لینا ہے اسلیئے اب لمبی چوڑی تقریروں کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عمل کا وقت آگیا ہے تعلیم نسواں کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اگرچہ اس سمت بہت کچھ ہوچکا ہے لیکن ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ جبتک ہندوستان کی عورتیں تعلیم یافتہ ہونگی وہ دیگر اقوام کی عورتوں کے برابر نہیں ہوسکتیں۔

ہندوستان کی بیواؤں کی حالت خاص طور پر قابل رحم ہے اور اُنکی تعداد بھی بہت زیادہ ہے چنانچہ پچھلی مردم شماری کی روسے اس وقت ملک میں ایک کروڑ ۶ لاکھ ۹ ہزار ۲۰ بیوہ عورتیں ہیں جنکی تفصیل صوبہ وار حسب ذیل ہے:-

پنجاب، دہلی اور صوبہ سرحدی	۸۰،۱۰۷	راجپوتانہ	۳۵۴۲۰۵
صوبجات متحدہ	۳۳۷۱۹۸۴	احاطہ بمبئی	۱۹۵۸۳۹
بہار و اڑیسہ	۳۰۴۳۸۹۰	صوبجات متوسط	۱۰۸۵۹۹۰
بنگال و آسام	۲۸۱۷۳۷۴	احاطہ مدراس	۳۹۴۳۹۷۱

جس ملک میں اتنی عورتیں رنڈاپے کے دُکھ جھیل رہی ہوں وہ ملک کیونکر ترقی کرسکتا ہے؟

مسز کملا بائی سیٹھی ایم۔ اے رائل جیاگرفیکل سوسائٹی کی ممبر منتخب ہوئی ہیں۔ آپ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جن کو یہ اعزاز نصیب ہوا ہے۔

ہز ہائینس بیگم صاحبہ رامپور نے رفاہِ عام کی خاطر قابلِ قدر ایثار سے کام لیکر اپنے محل کے مصارف میں ساڑھے چار لاکھ روپیہ سالانہ کی تخفیف منظور فرمائی ہے۔ آپ اس رقم کو ریاست میں توسیع تعلیم پر صرف کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کو شعر و سخن سے بھی ذوق ہے۔ چنانچہ ہز ہائینس نواب صاحب بہادر کی جشن سالگرہ کے موقع پر جو ہتم بالشان مشاعرہ ہوا اس کے لئے آپ نے ایک خاص غزل ارشاد فرمائی۔

چند روز ہوئے سیر بلدیہ بغداد نے ایک کمیٹی کی مدد سے ماڈ ہوٹل میں ایک بزم رقص و سرود کا انتظام کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی آمدنی سے انجمن ہلال احمر کی امداد و اعانت کی جائے۔ اس جلسہ میں تقریباً تین سو معززین نے شرکت کی جنمیں بہت سی عراقی خواتین بھی تھیں۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید عراق بھی قدامت پرستی کی زنجیریں توڑ کر مغربیت کا رنگ قبول کر رہا ہے۔ دس برس قبل اس قسم کی بزم رقص و سرود کا انتظام محالات سے تھا۔ یقیناً آئندہ دس سال کے اندر اس قسم کی صحبتیں معمول میں شمار ہونے لگیں گی۔

ہندوستان کے طبقۂ نسواں میں بھی اپنے حقوق کا احساس پیدا ہو رہا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے جو ڈسٹرکٹ بورڈ اوناؤ کی لیڈی ممبر ساجدہ بیگم صاحبہ کی تقریر سے درج کیا جاتا ہے آپ کو گورنمنٹ صوبہ نے حال ہی میں اوناؤ ضلع بورڈ کا ممبر نامزد کیا ہے اور آپ نے اس کے پہلے ہی جلسہ میں جو اظہار خیالات کیا اس میں بجا طور پر آپ نے مردوں پر عورتوں کے حقوق غصب کر لینے کا الزام عاید کیا ہے آپ نے فرمایا کہ "اب ہماری حیثیت ایک "لونڈی" کی نہیں ہے، ہمارے حقوق مردوں کے برابر ہیں۔ عام مردوں کا خیال ہے کہ عورت کا کام صرف شوہر کی وفاداری ہے اور اس کو دنیا کے معاملات سے بےخبر رہنا چاہیئے مگر جبتک عورت کو باعتبار قابلیت مرد کی سطح پر نہ لایا جائیگا وہ مزدوری اور صاف سے متصف نہ ہوسکیگی"۔

فرانس کے ایک زنانہ اخبار نے اپنے ناظرین سے یہ سوال کیا تھا کہ "کیا محبوبیت کے لئے عورت کا حسین و جمیل ہونا لازمی ہے؟" اس کے جواب وزرا حکومت، ممبران پارلیمنٹ، وکلا، فسانہ نگاروں، مصوروں، پوشاک سازوں اور ہزارہا دیگر حضرات نے دیئے جو نفی و اثبات دونوں میں تھے۔ سب جوابوں کا اوسط نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ عورت کیلئے پانچ خصوصیات لازمی ہیں۔ (۱) حسن و جمال (۲) ناز و ادا (۳) بذلہ سنجی (۴) ذکاوت (۵) فراخدلی۔

سرگزشتِ دل

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی۔اے ڈپٹی کلکٹر)

ارمان ہیں تیرے دلِ ناشاد نرالے
ایسا ہو کہ وہ شوخ تجھے پاس بُلالے

مجھ سے نہ بُرا ہو گا کوئی اب جو کہا کچھ
کیا خوب عجب تو نے تو اطوار نکالے

بس ہوش میں آ، دیکھ نتیجہ نہیں اچھا
نادان سنبھل، جان کے پڑ جائینگے لالے

سمجھایا بہت حیف مری بات نہ مانی
ہنگامہ بپا کرنے لگے ہجر میں نالے

وہ گریۂ جانسوز، کہ ہر اشک تھا چھالا
وہ آہ شرر ریز کہ جل اُٹھتے تھے چھالے

اس طرح تڑپتا تھا، لہو روتی تھیں آنکھیں
آنکھیں تھیں کہ لبریز لہو سے تھے پیالے

القصہ وہ عالم تھا کہ پھٹتا تھا کلیجا
دشمن پہ بھی اللہ بُرا وقت نہ ڈالے

ناچار لئے دل کو گیا تا درِ جاناں
آواز دی، اِک عاجز و بیکس کی دُعا لے

دھوکے میں گدا کے وہ ہوا لطف پہ مائل
کی عرض یہ میں نے کہ مری جان بچا لے

دل ہے مرے پہلو میں وہ سیماب کا ٹکڑا
تھمتا ہے جو تھامے، نہ سنبھلتا ہے سنبھالے

مشہور جہاں میں تری شیریں سخنی ہے
اس غمزدہ کو باتوں ہی باتوں میں لُبھالے

یا چشم فسوں ساز سے کر چشم نمائی
یا زلف کو لہرا کے پہ بیدار بنالے

یا اور جو تدبیر مناسب ہو وہ کرنا
دل تیرے سپرد اور خدا کے تو حوالے

فرمایا کہ منظور ہے خاطر تری مجھکو
پر خستۂ و دل ریش ہے دم ایک فرالے

اتنے ہی میں تلنے لگیں پلکوں کی سنانیں
اور ابرؤوں نے کھینچے تن تن کے سنبھالے

نرغے میں کرشموں نے دلِ زار کو گھیرا
اور ٹوٹ پڑے ساتھ ہی غمزوں کے رسالے

تھے وار پہ وار اور جراحت پہ جراحت
اللہ نہ ڈالے کسی بے درد کے پالے

جس عہد کا یہ ذکر ہے اب اُس کی نشانی
کچھ داغ ہیں، کچھ زخم ہیں، یہ نم ہیں، وہ آلے

کلام آرزو

(از جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

ذیل میں حضرت آرزو لکھنوی کی دو غزلیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ایک غزل حضرت موصوف کے خاص انداز بیان خالص اردو میں ہے دوسری غیر مقیدہ اردو میں ہے ناظرین دونوں کا لطف اٹھائیں اور حضرت آرزو کے کمالِ فن کی داد دیں۔ (ایڈیٹر)

(خالص اردو)

الگ ہو بیٹے جی سدا جو وہ رو رہے تھے لپٹ لپٹ کے
گھڑی گھڑی بھرتی تیلیوں نے سماں دکھایا پلٹ پلٹ کے

جو آنسو آنکھوں میں آ چکے ہیں کہاں وہ جائینگے اب پلٹ کے
یہ چڑھتے پانی کے ہیں تھپیڑے پڑینگے منہ پر الٹ الٹ کے

کٹا چھٹی ہوں لیے کھڑی تھی کہ بیر کرنے کو بیرے جی کی
لہو تھا جتنا بھی ٹپل بھر میں سب ایک جگہ آ گیا سمٹ کے

نہ اسکو پوچھو کہ کیسے تھا یہ روکے ہنسنا یہ ہنس کے رونا
اک ان کہی دکھ بھری کہانی دکھا دی ہمکو الٹ پلٹ کے

تھمے جو آنسو رکی یہ ہچکی بندھی ہوئی آس اور ٹوٹی
مہین سا سانس کا یہ ڈورا اور اسپہ ایسے کرارے جھٹکے

یہ ایک ہم ہیں کہ جیسے چھوٹے لگی ہے چپ چھیان میں تمہارے
وہ ایک تم ہو کہ جس نے اب تک نہ بات پوچھی کبھی پلٹ کے

ہے جی تو بیکل کہاں کا سونا پڑا ہے سمٹا ہوا بچھونا
جو ساتھ لیکر تمہیں نہ آئے وہ نیند آنکھوں میں کیوں کھٹکے

بھنور سے نکلی جو ناؤ بچکر تو پار اترنے میں کھائی ٹھوکر
بڑھا کے رکھا تھا پاؤں جسپر وہی کگارا گرا ہے پھٹ کے

جو مار رکھا ہے جی کو تم نے نہ آرزو اب ہمیں سے دینا
ہوئی جو مٹھی ذرا بھی ڈھیلی یہ سانپ کاٹیگا پھر پلٹ کے

غزل غیر مقید (اردو)

دیا وہ درد کہ جس میں سکون جاں دیکھا　　تری نظر ہی کو دل کا مزاجداں دیکھا

خود اضطراب کو وجہِ سکونِ جاں دیکھا　　اجل کو زیست کا اپنی مزاجداں دیکھا

ہزار اُلٹے حجاباتِ حُسن کے دفتر　　پھر ایک نہ ایک ورقِ سادہ درمیاں دیکھا

عدو نہ تھی مگر اندھی صرصر تھی بجلی　　کہ دیکھے پھول نہ غنچے نہ آشیاں دیکھا

ہوا سمیٹے رہی مشتِ خاک وحشی کی　　ہمیشہ ایک بگولا رواں دواں دیکھا

وہ تلخ زہر تھے جو نعمتوں کے بھیس میں تھے　　نشاطِ حرص کو خود کر کے رائگاں دیکھا

غضب تھا خاتمۂ سوزِ عشق کا منظر　　بھڑکتے شعلہ کو بنتے ہوئے دھواں دیکھا

تجھے اختیار بھی دے کر وہ جبر پر مجبور　　اسیر کر لیا جس کو رواں دواں دیکھا

کہاں ہے منہ پہ وہ خودداریوں کی اب رونق　　اِن آنسوؤں کا مٹایا ہوا نشاں دیکھا

جتا نہ مفت کا احسان دیکھ برقِ جمال　　جھپکتے آنکھ تو دیکھی تجھے کہاں دیکھا

مقدر و واسطہ ہے جذبِ عشق کی تکمیل　　وہ پہلے کشتہ ہوا جس کو درمیاں دیکھا

سکونِ دل اسی تصدیقِ اضطراب میں ہے　　نہ آنکھ کھول مگر کہہ تو دے کہ ہاں دیکھا

سزا بنی ہوسِ نارسا کی دیدِ جمال　　نظر نے اپنے ہی جلنے کا کچھ دھواں دیکھا

فقط تھی عجزِ طلب حسنِ بے نقاب کی آن　　جہاں نگاہ نہ پہونچی تجھے وہاں دیکھا

سرِ نیاز اب اسے آرزو ہے قابلِ ناز
کہ جس جگہ پہ جھکا اُس کا آستاں دیکھا

ماہتاب

از منشی کرسن لال صاحب آدیب لکھنوی، بی۔اے

ماہتابِ پُر ضیا کیا خوب سیّارا ہے تو　　عین ظلمت میں ہماری آنکھ کا تارا ہے تو
کیا تعجب ہے جو اہلِ خاک کو پیارا ہے تو　　جانتے ہیں سب ہمارا ہی جگر پارا ہے تو

ماہِ نو سے رفتہ رفتہ ماہِ کامل بنگیا
پارۂ دل تھا مگر اب سر بسرِ دل بنگیا

رونقِ بزمِ فلک ہے تجھ سے اے شب زندہ دار　　وسطِ گردوں میں ترا جلوہ ہے با عزّ و وقار
تیرے ہر جانب ستارے ہیں قطار اندر قطار　　جھلملاتے ہیں کہ ہیں تیری ضیا سے شرمسار

ہے رخِ پُر نور کے چاروں طرف ہالہ ترا
کیوں نہ عظمت کا مُقر ہو دیکھنے والا ترا

منحصر ہے تجھ پہ اکثر بزمِ ہستی کا نظام　　تو وزیرِ شاہ خاور ہے نہیں اسمیں کلام
اک اشارے کا نتیجہ ہے ترے ماہِ صیام　　رونمائی تیری ہی عید الفطر کا ہے پیام

خود شراب نور کا لبریز پیمانہ ہے تو
بادہ نوشوں کو کلیدِ بابِ میخانہ ہے تو

ہے مسلّم بزمِ ہستی میں ترا عز و وقار　　دیدنی بیشک ہے تیری بامِ گردوں پر بہار
حسن کی تشبیہ تک لیتے ہیں تجھ سے مستعار　　ہاں مگر یہ کیا ہے کیوں ہے تیرا سینہ داغدار

یاس کیوں ہے تجھ پہ طاری دل ترا کیوں سرد ہے
اس قدر خاموش کیوں ہے رنگِ رخ کیوں زرد ہے

دوریِ منزل کا شاید ہے ترے دل میں ملال — آگیا ہے یا تجھے اپنی حقیقت کا خیال
کر دیا ہے گردشِ گردوں نے تجھ کو پائمال — ہو گئی ہے تجھ کو دامنگیر یا فکرِ مآل
کیا سمجھتا ہے کہ تیرا رازداں کوئی نہیں
"ہم نفس کوئی نہیں اور مہرباں کوئی نہیں"

میں سمجھتا ہوں جو کچھ اے ماہ تیرے دل میں ہے — دل کہیں ہے اور تیرا گرچہ تو محفل میں ہے
گردشِ پیہم سے تیری جاں بڑی مشکل میں ہے — تیرہ بختی آہ مضمر تیرے آب و گل میں ہے
غم نہ ہو کیونکر کہ تو اپنے وطن سے دور ہے
رکن تھا جس کا کبھی اُس انجمن سے دور ہے

اب فقط تو میہماں ہے رات بھر کا ماہتاب — چند ساعت میں چڑھیگا تجھ پہ رنگِ انقلاب
چرخ پہ ہوگی رواں جب موجِ نورِ آفتاب — اس طرح مٹ جائیگا تو جیسے پانی کا حباب
صبح کو معدوم تو اے سیمتن ہو جائے گا
آہ دامانِ سحر تیرا کفن ہو جائے گا

رباعی

معذور ہوں ابتذالِ ہستی یہ ہے — مجبور ہوں، آدمی کی پستی یہ ہے
جو ذرہ ہے، مظہرِ حقیقت یہ ہے — محدودِ نظر ہو، بت پرستی یہ ہے

(بعد ہری جگت موہن لال) — (رواں)

رموز ونکات

(از حضرت ابو الفاضل راز چاندپوری)

بے کیف ہے کچھ آج طبیعت ساقی! بے رنگ ہے رنگِ بزمِ غربت ساقی
اِک جامِ نشاط خیز، تیرے قرباں دینی ہے دادِ حُسنِ فطرت ساقی

یہ عزمِ سفر، پیامِ راحت ہو جائے فکرِ منزل سے مجھکو فرصت ہو جائے
اے رہبرِ خوش خرام تیرے قرباں طے شام سے پہلے دشتِ غربت ہو جائے

کیا فکر اگر ہے راہِ مقصد دشوار کیا غم ہے، اگر نہیں ہے کوئی غمخوار
یہ ہمتِ سر بلند و عزمِ راسخ کافی ہے دلیلِ کامیابی، ہشیار

یہ لطف و کرم، یہ رہنمائی تیری ہمت افزا ہے خوشنوائی تیری
بیشک ہے یقینِ کامیابی مجھکو واللہ، یہ رمز آشنائی تیری!

یہ جامِ شرابِ ناب، کیا کہنا ہے یہ ماہ، یہ آفتاب، کیا کہنا ہے
اے ساقیِ ذی وقار و عالی ہمت میں اور ہوں کامیاب، کیا کہنا ہے

نوائے محوی

(از مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی (اُردو لکچرار مدراس یونیورسٹی)

ہو نہ کمی خدا کرے ہمتِ غم نواز میں ۔۔۔ ہے کچھ اسی سے روح سی شیوۂ ضبطِ راز میں

کچھ نہ سمجھ سکا کوئی اُن کی حریمِ ناز میں ۔۔۔ کہہ گیا اپنا دردِ دل کوئی نوائے ساز میں

قوتِ جذبِ دل سہی حُسنِ کرشمہ ساز میں ۔۔۔ کیف کہاں سے لائیے زندگیِ مجاز میں

جان دی اور اُف نہ کی کوششِ ضبطِ راز میں ۔۔۔ ایک یہی تو بات تھی عاشقِ پاک باز میں

ہوگئے کتنے دل تباہ مٹ گئے کتنے بے گناہ ۔۔۔ حُسن کی ترک تاز میں یعنی فریبِ ناز میں

خاک میں مل گئیں مگر اب بھی ہیں کتنی صورتیں ۔۔۔ اے دلِ عبرت آشنا دیدۂ امتیاز میں

تیری نہیں نے توڑدی ہمتِ زندگی مری ۔۔۔ جوششِ وفا کہاں رہا جانِ الم نواز میں

بھردی ہیں کتنی بجلیاں سوزِ غمِ فراق نے ۔۔۔ نالۂ غم طراز میں، آہِ جگر گداز میں

تیرا تبسم خفیف، ہو کہ نگاہِ عشوہ ریز ۔۔۔ پھونک دی ہے کسی نے روح پھر دلِ غم نواز میں

مجھکو دیا جنونِ عشق، تجھ کو فسونِ دلبری ۔۔۔ کس کو مجالِ دخل ہے حکمتِ کارساز میں

دردو اثر کی بجلیاں، سوزِ جگر کی گرمیاں

بھردی ہیں کس نے خامۂ محویِ غم طراز میں

علمی نوٹ اور خبریں

پچھلے ماہ لکھنؤ یونیورسٹی کے توسیع علوم کے سلسلے میں مدراس کے نامور ادیب و مصنف مسٹر کے
ایس۔ وینکٹ رمنی صاحب نے دو قابل ذکر لکچر دیئے جن کے عنوان "جمہوریت اور علم ادب" اور "علم ادب اور
زمانۂ حال" تھے۔ ان لکچروں کے دوران میں فاضل ادیب نے فرمایا کہ جمہوریت کا علم ادب سے خاص تعلق
ہے، کیونکہ جب جمہوریت کا دور ہوتا ہے تو انسان آزادی کی دھن میں ایسا اُجو بہ پسند ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عقل
پر زور دیکر ہر چیز پر اعتراضات کرنے لگتا ہے اور بات بات پر سوالات کرتا ہے جیسے کوئی سائنس کا محقق ادنیٰ
سے ادنیٰ واقعہ کے لئے بھی اسباب و علل کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتا ہے۔ اسی طرح زمانۂ جمہوریت کے
معمولی افراد بھی ہر بات کی وجہ دریافت کرتے اور ہر وجہ کی غایت کو جاننا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ادب
کی پوری ترقی نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے لئے اعلیٰ درجہ کے ذہنی تاثرات کی ضرورت ہوتی ہے جن کے
بغیر علم ادب اپنے اعلیٰ درجات تک پہونچ ہی نہیں سکتا ہے۔ چنانچہ جمہوریت کی زندگی میں خواص کے بجائے
عوام سے واسطہ رہتا ہے اور قابل مصنف یا نکتہ داں شاعر کے بجائے اخبار نویس پیدا ہونے لگتے ہیں
جو علم و فضل پہلے کتابیں لکھنے کی تحریک کرتا تھا۔ وہی جمہوریت کے زیر سایہ لوگوں کو اپنی عقل اور ذہن پر
زور دیکر ملکی معاملات پر غور کرنے حکومت اور پبلک کی غلطیوں پر نگاہ رکھنے اور ہر طبقے کے قصور وار کو اس طرح
ٹوکنے پر مائل و متوجہ کرتا ہے جیسے کوئی پہرہ دار سنتری ہر آنے جانے والے اجنبی کو روکتا ٹوکتا رہتا ہے بقول سعدی

سگ و دربان چو یافتند غریب   ایں گریباں گرفت و آں دامن

لیکن جب جمہوریت ابتدائی مراحل طے کر چکتی ہے اور اپنے اعلیٰ نصب العین کی طرف پہونچنے کی کوشش
کرتی ہے اور اس کا مقولہ "عوام الناس کی خدمت اور اہل ملک سے محبت" ہو جاتا ہے تو پھر علم ادب کی
ترقی کی باری آتی ہے۔ جیسے خزاں کے بعد موسم بہار میں جب درخت نئے پتھل سے لد جاتے ہیں تو پھول
کے نکلنے اور پھلوں کے لگنے کے دن آتے ہیں۔

دوسرے لکچر کا مضمون "علم ادب اور زمانۂ حال" پہلے دن کے لکچر سے زیادہ اہم تھا، چنانچہ اس کے

دوران میں فاضل گجوارنے فرمایا کہ ہندوستان میں علم ادب کے جو بڑے بڑے ماہر آجکل موجود ہیں اُس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمانہ علم ادب کی ترقی کا زمانہ ہے۔ مثال کے لئے آپ نے ملک کی بڑی بڑی ہستیوں کا شمار کرایا جیسے مہاتما گاندھی۔ ڈاکٹر ٹیگور۔ مسز سروجنی نیڈو۔ سر محمد اقبال مہرسی۔ وی۔ رمن۔ سر ایس۔ رادھا کشن۔ سر جگدیش چندر بوس۔ اور سر پی۔ سی۔ رائے جنھوں نے ہمارے ملک ہندوستان کو دنیا کی نگاہ میں بہت اونچا اُٹھا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں ملک کی اس موجودہ ترقی کو مفت رائیگاں نہ کرنا چاہیئے بلکہ ایسی کوشش کرنا چاہیئے اور وہ تدابیر اختیار کرنا چاہیئے جن سے کہ یہ ترقی مستقل اور دیرپا ہو۔

آپ نے اس سلسلے میں کئی عملی تجاویز بھی پیش کیں جنھیں ہم درج ذیل کرتے ہیں

(۱) ہندوستان کی بڑی بڑی زبانوں میں اعلیٰ تصانیف کے لئے سالانہ انعامات مقرر کئے جائیں۔ اور جس طرح نوبل انعام دیا جاتا ہے اسی طرح ایک بڑا انعام بھی مقرر کیا جائے جو کم از کم دس ہزار کا ہو۔

(۲) تمام ملک کے مصنفوں کی ایک انجمن قائم کی جائے

(۳) ہر سال کسی خاص مقام پر جو سالانہ تبدیل ہوتا رہے مصنفین جمع ہو کر تبادلہ خیالات کیا کریں۔

(۴) تمام ہندوستان کے لئے ایک عظیم الشان دارالاشاعت قائم کیا جائے جس کی شاخیں مختلف زبانوں کے لحاظ سے مختلف مقامات میں کھولی جائیں۔

ہم کو امید ہے کہ ہمارے ملک کے ارباب حل وعقد ان تجاویز کی طرف مناسب توجہ دیں گے۔

لالہ سری رام صاحب دہلوی مرحوم نے خمخانۂ جاوید کے نام سے اُردو شاعروں کا جو نا تمام مگر ضخیم تذکرہ مرتب کیا تھا اسکی پانچویں جلد اُردو کے مشہور محقق و مصنف پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کے زیر نگرانی مرتب ہو کر اشاعت کے لئے مطبع بھیجدی گئی ہے۔ لالہ صاحب مرحوم اپنا کتب خانہ اور خمخانۂ جاوید کی جلدیں ہندو یونیورسٹی کے نام وقف کر گئے ہیں چنانچہ خمخانہ کی کل جلدیں اب یونیورسٹی ہی سے مل سکتی ہیں

بنارس یونیورسٹی کے مولوی فاضل پروفیسر مہیش پرشاد صاحب رقعات غالب کا ایک خاص و مکمل ایڈیشن مرتب کر رہے ہیں جس میں آپ نے تمام خطوط کو سلسلہ وار ضروری حواشی اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں دو ہزار سات سو پچاس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یوروپین زبانوں میں انگریزی زبان کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی اسّی کروڑ بتلائی جاتی ہے۔ فرانسیسی بولنے والے چار کروڑ دس لاکھ جرمن بولنے والے چھ کروڑ ۹ لاکھ۔ اطالوی بولنے والے تین کروڑ، ہسپانوی زبان بولنے والے چار کروڑ دس لاکھ۔ روسی بولنے والے چھ کرور سات لاکھ اور پرتگالی بولنے والے ایک کرور تین لاکھ بتلائے جاتے ہیں۔

دنیا کے ہر ترقی کرنے والے ملک میں اس وقت اپنی اپنی ملکی زبان کو فروغ دینے کا خیال عام ہو رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں شاہ عراق نے ایک فرمان جاری کیا ہے جس کی رو سے حکومت عراق کے دفاتر میں صرف عربی زبان استعمال کی جائیگی اور انگریزی کو بالکل ترک کر دیا جائیگا۔

لالہ سری رام مرحوم اپنا جو بیش بہا کتب خانہ بنارس یونیورسٹی کو وقف کر گئے ہیں۔ اس میں فارسی کے ۶۶۳ قلمی نسخے اور ۱۴۰۴ مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ عہد مغلیہ کے مصوری کی بہت سے بیش قیمت نمونے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جن میں سے بعض کا شمار نایاب نوادرات میں ہے۔

ہندو یونیورسٹی بنارس ہندی بھاشا کی توسیع و ترقی میں خاص خدمات انجام دے رہی ہے چنانچہ پچھلے سال انٹرمیڈیٹ کلاس کی چند درسی کتابوں کے علاوہ یونیورسٹی نے مندرجہ ذیل کتابیں بھی شائع کیں

(۱) سادھارن رسائن (مبادیات کیمیا) حصۂ اول و دوم۔ مصنفہ پروفیسر پی۔ ایس۔ ورما۔

(۲) سواستیہ رکھین (حفظان صحت) از ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ ورما۔

(۳) بھارتیہ لوک نیتی اور سبھیتا (تہذیب و تمدن ہند) از پروفیسر ایس۔ وی پونبکار

(۴) بھارت کا اتہاس، ہندو کال (تاریخ ہندوستان۔ ہندوؤں کا عروج) از پنڈت گنگا پرشاد مہتا۔

ابتک افغانستان کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں کی زبان فارسی چلی آتی تھی، لیکن اب وہاں کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ فارسی کے بجائے پشتو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے۔ چنانچہ آئندہ سال سے سرکاری مدارس میں ہر طالب علم کے لئے پشتو زبان ایک لازمی مضمون ہوگا، تاکہ کچھ عرصہ کے بعد دفاتر میں فارسی کی جگہ پشتو لے سکے۔ پشتو زبان کی ترقی کے لئے ایک انجمن بھی قائم کی گئی ہے جو

عنقریب ہی ایک پشتو رسالہ جاری کرے گی،

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مہاتما گاندھی کبھی کبھی اُردو میں بھی خط لکھتے ہیں۔ چنانچہ جنوری گذشتہ میں انھوں نے ڈاکٹر عالم صاحب کی بیگم صاحبہ کو ایک خط لکھا تھا جو معصر سرفراز لکھنؤ کی عنایت سے ناظرین زمانہ کے تفنن طبع کے لئے لفظ بہ لفظ درج ذیل کرتے ہیں:-

"پیاری بہن! تمہارا خط مجھے ملا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا میرے خط تم کو کیوں نہیں ملتے۔ لاہور کا بھی خط لکھا اور کلکتہ کا بھی۔ میں نے دونوں میں پتہ ٹھیک جو تم نے بتلایا تھا وہی دیا تھا۔ اب دیکھیں اسکا کیا حال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو آرام ہو رہا ہے یہ جانکر بہت خوشی ہوئی ہے۔ خدا ان کو بالکل تندرست کرے۔ ملک کے لئے انکا بہت کام ہے۔ مجھے سب حال دیتی رہو۔ پہلے ڈاکٹر صاحب لکھ بھی سکتے ہیں تمہارا خط میرے لئے اُردو کا سبق ہوتا ہے۔ "ابینا" اور زہرہ تو وہی ہی ہیں۔ ہم سب مجھے (فرسلا) میں ہیں۔ اب ہم چاہیں آشرم کے جینگ لال بوشی کو مدد کے لئے سرکار نے بھیج دئے ہیں۔ آجکل ہری جنوں کے کام میں بہت وقت دینا پڑتا ہے۔ باپو کو دعا۔"

معلوم ہوا ہے کہ اسی طرح کے وہ خط ڈاکٹر عالم کو بھی موصول ہوئے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے دربار کا جو تاریخی مرقع اس نمبر کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے اس کی اصل ہمارے مرحوم دوست اور راجپوتانہ کے مشہور مورخ منشی دیبی پرشاد صاحب جودھپوری سے دستیاب ہوئی تھی منشی صاحب زمانہ کے مضمون نگاروں میں بھی تھے اور ان کے کئی دلچسپ مضامین اور نادر تاریخی تصاویر زمانہ کی پرانی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ منشی صاحب نے اُردو میں کئی اہم تاریخی تصانیف بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور اُردو کے ہندو شاعروں کا ایک تذکرہ "تذکرہ آثار الشعرائے ہنود" کے نام سے لکھا تھا جو مطبع رضوی دہلی میں ستمبر ۱۸۸۵ء میں طبع ہوا تھا۔

... بالکل مفت طلب فرمایئے

وید شاستری، جام نگر۔ کاٹھیاواڑ

لاہور ایجنٹ:۔ میسرس عبدالکریم اینڈ سنز ...

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

حضرات نامی گرامی ڈاکٹر کرنل ... صاحب بہادر سی آر ...

زمانہ

جلد ۶۰ — اپریل ۱۹۳۳ء — نمبر ۴

نَوْرس

(از حضرت کلیم اعظم گڈھی)

شعر کیا ہے؟ بقول لارڈ میکالے یہ ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے متشابہ ہے مگر یہ سب اظہار بطون میں عاجز ہیں۔ ایک اور محقق کا قول ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اسکو سنکر متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ ہندی محققین کا قول ہے کہ رعایاتِ لفظی اور محاسنِ معنوی کا نام شعر ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ بعض چیزوں میں قیود کے لگنے سے ایک دلفریبی آجاتی ہے، جیسے پانی کو صدف کی قید موتی، خون کو نافِ آہو کی قید مشک بنا دیتی ہے اسی طرح الفاظ، وزن اور بحور کی قید میں آکر ایک دلفریب شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور جب اس میں تاثیر کی روح دوڑ جاتی ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

ہندی اُردو میں ہر قسم کی کیفیات کے اظہار بذریعہ اشعار ہوتے ہیں، بعض بعض ایسے لطیف جذبات کا اظہار اشعار کے ذریعہ ہو جاتا ہے جس کی تشریح کے لئے لغت میں کافی الفاظ نہیں ملتے۔ اس سلسلے میں ہندی کے ساتھ اُردو کی مثالیں بھی پیش کی جائیں گی تاکہ موازنہ میں آسانی ہو۔

شعر کی تعریف میں تمام ہندی محققین اس رائے میں متفق ہیں کہ ایسے کلام جن میں رَس (التذاذ) ہو، شعر ہیں۔

تاثرات سے جو التذاذی کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کو رَس کہتے ہیں، یا یوں سمجھئے کہ جذباتِ مستقل

جذبات مستقل	کیفیت التذاذی	جذبات مستقل	کیفیت التذاذی
خواہش وصل رتی रती	تغزل شرنگار رس श्रृंगार रस	غم و اندوہ شوک शोक	مرثیہ کرونا رس करुणा रस
خوشی ہاس हास	مطائبہ ہاسیہ हास्य	غصہ کرودھ क्रोध	ہجو رودر رس रौद्र रस
محبت اُتساہ उत्साह	شجاعت بیر رس वीररस	خوف بھئے भय	خوف بھیانک رس भयानक रस
کراہت گلانی गलानी	نفرت وی بھتس बीभत्स	تعجب آشچریہ आश्चर्य	استعجاب اوبھت अद्भुत
معرفت نروید निर्वेद	معرفت شانت رس शान्त रस		

تغزل (شرنگار رس- श्रृंगार रस)

تغزل کا جذبہ مستقل خواہش وصال ہے۔ اسکی تعریف ان لفظوں سے ہوسکتی ہے کہ جس کیفیت سے طبیعت میں محبوب کے وصل سے التذاذی کیفیت پیدا ہو اور جدائی میں محبوب کے حسن و جمال کی یاد سے رنج و تکلیف کا احساس اور اس کے ملنے کی سعی کرتے ہوئے آنے والے آرام کے خیال سے لطف حاصل ہو شرنگار رس ہے۔ اسکی دو قسمیں ہیں وصال اور فراق۔

محرکات جذبہ وصال۔ یار موافق۔ چھٹکی ہوئی چاندنی۔ طمانیت بخش تنہائی۔ نسیم کے خوشگوار جھونکے وغیرہ۔

صورت انفعالی۔ حیرت۔ لرزش۔ پسینہ آجانا۔ رونگٹے کھڑے ہوجانا۔ گلا بیٹھنا۔ چہرہ فق ہونا۔ آنسو نکل آنا۔ محویت۔ اضطراری کیفیت۔ طالبیت۔ غمزہ۔ سیہ مستی وغیرہ۔

جذبات اضافی۔ رقابت۔ نفرت۔ استقلال۔ یاد محبوب۔ تعجب۔ تکلیف۔ خوشی۔ خوف۔ سستی۔ شرم وغیرہ

نمونہ کیف وصال

सावनी तीज सोहावनी को सजि सूहें दुकूल सबै सुख साधा
त्यों पदमाकर देख बनै न बने कहते अनुराग अगाधा
प्रेम के हेम हिंडोरन में सरसै बरसै रस रंग अगाधा

کی مشتمل صورت کا نام رس ہے۔ رس کا کالبد جذبات اور تاثرات کے خمیر سے طیار ہوا ہے۔ جذبات کو ہندی میں भाव کہتے ہیں اور یہ ودیعت خدا ہے جو سب میں موجود ہے مگر اپنے گرد و پیش کے حالات سے کسی میں کم کسی میں زیادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ علم و عمل کے درمیان کی کڑی ہے۔ لوگ مرثیہ سنکر رونے لگتے ہیں، اس رونے کے فعل اور مرثیہ کے سمجھنے کی درمیانی حالت کا نام جذبہ ہے۔

تاثرات सचारी भाव (سنچاری بھاؤ) جذبات پر ٹھیس لگنے سے جو خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ تاثر ہے اور یہ اپنے ماحول کا محتاج ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ علم ہی جذبات ہیں مگر ان دونوں میں فرق ہے۔ علم روحانیت سے بری اور جذبات اکثر روحانیت سے مملو ہوتے ہیں علم میں خودغرضی کم ہوتی ہے اور جمہور کی طرف جھکتا ہے۔ جذبات خودی کی طرف مائل ہیں۔ جہاں علم روحانیت سے تعلق رکھتا ہے وہیں جذبات میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ جہاں علم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور تدبیر بیکار ثابت ہوتی ہے وہاں جذبات سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک شخص کا رجز سنکر لڑائی میں جان دینے کے لئے تیار ہو جانا اسکا بیّن ثبوت ہے کہ اگر علم اور جذبات ایک ہی چیز ہیں تو ایک پھول کو دیکھکر ایک منطقی اور ایک شاعر کا خیال یکساں ہو جانا چاہئے۔

رس۔ جذبات مستقل स्थाई भाव (استھائی بھاؤ) محرک جذبات विभाव (وی بھاؤ) صورت انفعالی (अनुभाव) (انو بھاؤ) جذبات اضافی सचारी भाव (سنچاری بھاؤ) سے مرکب ہے۔

جذبات مستقل۔ وہ جذبات ہیں جن میں ایسی پختگی آگئی ہو کہ ہر حالت میں یکساں قائم رہیں اور دوسرے جذبات اپنے میں جذب کرلیں۔

محرک جذبات۔ وہ اسباب ہیں جو جذبات مستقل کو حرکت میں لائیں۔

صورت انفعالی۔ وہ نتیجہ ہیں جو جذبات کے برانگیختہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے مثلاً خوف و دہشت ایک جذبہ مستقل ہے اسکا محرک قبرستان، سنسان میدان وغیرہ۔ اس کی صورت انفعالی جسم کا کانپ جانا، روئیں کھڑے ہو جانا وغیرہ۔

جذبات اضافی۔ وہ جذبات ہیں جو مستقل جذبات کے ساتھ ساتھ لگے رہیں اور دریا کی موج کی طرح ابھرتے اور مٹتے رہیں مثلاً تغزل میں رنج و افسوس۔ شب ہجر کی مصیبت، وصل کی خوشی رونا۔ ہنسنا وغیرہ جذبات مستقل کی چھوٹی چھوٹی قسمیں ہیں جن میں ہر ایک سے ایک ایک التذاذی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

جذبات مستقل	کیفیت التذاذی	جذبات مستقل	کیفیت التذاذی
خواہش وصل رتی रती	تغزل شرنگار رس शृंगार रस	غم و اندوہ شوک शोक	مرثیہ کرونارس करुणा रस
خوشی ہاس हास	مطائبہ ہاسیہ हास्य	غصہ کرودھ क्रोध	ہجو رودرس रौद्र रस
محبت اُتساہ उत्साह	شجاعت بیرس वीररस	خوف بھے भय	خوف بھیانک رس भयानकरस
کراہت گلانی गलानी	نفرت وی بھتس बीभत्स	تعجب آشچریہ आश्चर्य	استعجاب اوبھت अद्भुत
معرفت نروید निर्वेद	معرفت شانت رس शान्त रस		

تغزل (شرنگار رس۔ शृंगार रस)

تغزل کا جذبہ مستقل خواہش وصال ہے اسکی تعریف ان لفظوں سے ہوسکتی ہے کہ جس کیفیت سے طبیعت میں محبوب کے وصل سے التذاذی کیفیت پیدا ہوا اور جدائی میں محبوب کے حسن وجمال کی یاد سے رنج وتکلیف کا احساس اور اس کے ملنے کی سعی کرتے ہوئے آنے والے آرام کے خیال سے لطف حاصل ہو۔ شرنگار رس ہے۔ اسکی دوقسمیں ہیں وصال اور فراق۔

محرکات جذبہ وصال۔ یار موافق۔ چھٹکی ہوئی چاندنی۔ اطمانیت بخش تنہائی۔ نسیم کے خوشگوار جھونکے وغیرہ۔

صورت انفعالی۔ حیرت۔ لرزش۔ پسینہ آجانا۔ روئیں کھڑے ہوجانا۔ گلا بیٹھنا۔ چہرہ فق ہونا۔ آنسو نکل آنا۔ محویت۔ اضطراری کیفیت۔ ملاعبت۔ غمزہ۔ سیہ مستی وغیرہ۔

جذبات اضافی۔ رقابت۔ نفرت۔ استقلال۔ یاد محبوب۔ تعجب۔ تکلیف۔ خوشی۔ خوف۔ مستی۔ شرم وغیرہ

نمونہ کیف وصال

सावनी तीज सोहावनी को सजि सूहैं दुकूल सबै सुख साधा

त्यों पदमाकर देख बनै न बनै कहते अनुराग अगाधा

प्रेम के हेम हिंडोरन में सरसै बरसै रस रंग अगाधा

राधा के हिय झूलत सांवरो सांवरो के हिय झूलत राधा
ساونی تیج سُہاونی کو بج سوہیں دوکول سجے سکھ سادھا
تیوں پدماکر دیوبنے نہ بنے کہتے اُنراگ اگادھا
پریم کے ہیم ہنڈورن میں سرسے برسے رس سنگ اگادھا
رادھاکے ہیہ جھولت ساورو ساورو کے ہیہ جھولت رادھا

پدماکر دیو رادھاکی حالت بیان کرتے ہیں کہ ساون کا مہینہ ہے، ہر طرف بدلی چھائی ہوئی ہے۔ رادھا ساونی کی خوبصورت تیج عیش اور خوشی میں پہنکر نہایت حسین ہوئی ہے۔ محبت کے سنہرے جھولے میں محبت کے پینگ بڑھ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رادھا کرشن جی کے دل میں جھول رہی ہیں اور کرشن جی رادھا کے دل میں ؎

خدا رکھے محبت کو کئے آباد دونوں گھر
میں اُن کے دلمیں رہتا ہوں وہ میرے دلمیں رہتی ہیں (داغ)

اس موقع کے بہاری اور متی رام کے ایک ایک دوہے ملاحظہ فرمایئے ؎

डीटि बरत बांधी भटन चढ़ि धावत न डेरात
دیٹھ برت باندھی اٹن چڑھی دھاوت نہ ڈرات
इते उते मन दुहुन को नट लौं आवत जात
اِتے اوتے من دُوہُن کونٹ لوں آوت جات
(بہاری)

دونوں کی مشتعل نگاہیں کوٹھوں سے بندھی ہوئی ہیں اور اس پر دونوں کے دل نٹ کی طرح اِدھر اُدھر بیخوف آتے جاتے ہیں ؎

ذوق:- آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا ؛ کہیں جائے نہ یہ اس جنگ وجدل میں مارا

داغ:- رکھنا وہ روک روک کے لڑتی نگاہ کا ؛ رہنا وہ تھام تھام کے دل محو دید کا

पितम को मन भावती मिलति बांह दै कंठ
پیتم کو من بھاوتی ملت بانہہ دے کنٹھ
बांह छुटै न कंट ते नाहिं छुटै ना कंठ
بانہہ چھٹے نا کنٹھ تے ناہیں چھٹے نا کنٹھ
(متی رام)

عورت عالمِ خیال میں اپنے شوہر کے گلے میں ہاتھ حائل کر دیتی ہے اور اس طرح لپٹاتی ہے کہ خود

اس کا ہاتھ اپنی گردن میں لپٹ جاتا ہے اور نہ گردن سے ہاتھ چھوٹتا ہے نہ ہاتھ سے گردن ۔ آتش

گستاخ ہاتھ گردنِ دلبر میں حسنم ہوا　　حدِ ادب سے شوق کا باہر قدم ہوا

حیرت

देखा देखी भई छूटि तब ते सकुच गई मिटी कुल कानि कैसी घूंघट को करिबो

دیکھا دیکھی بھئی چھوٹی تب تے سکچ گئی مٹی کل کانی کیسی گھونگھٹ کو کریبو

लगी टक टकी उर उठी धक धकी, गति जकी मत छकी ऐसो नेह को उधारिबो

لگی ٹکٹکی اُور اوٹھی دھک دھکی گت جکی مت چھکی ایسو نیہہ کو اوگھاربو

चित्र कैसे लिखे दोऊ ठाढ़े "कासी राम" नाहीं प्रवाह लागे लाख करो लारिबो

چترکے سے لکھے دوؤ ٹھاڑے کاسی رام ناہیں پرواہ لاگے لاکھ کرد لریو۔

बंसी को बजैबो नट नागर बिसर गयो नागर बिसरि गयो गगरी को भरिबो

بنسی کو بجیبو نٹ ناگر لبسر گیو ناگر لبسر گیو گاگرن کو بھریبو۔

رادھا اور کرشن جی کی آنکھیں ناگہاں چار ہوئیں، رادھا کو گھونگھٹ کا کرنا اور خاندانی شرم و حیا سب بھول گئیں۔ ٹکٹکی بندھ گئی دل میں دھڑکن پیدا ہوئی اور ششدر ہوگئیں۔ رادھا اور کرشن جی دونوں تصویر کی طرح خاموش کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اور محویت میں رادھا گھڑا بھرنا اور کرشن جی بنسی بجانا بھول گئے۔ ؎

آنکھ کے ملتے ہی باہم چھا گئیں حیرانیاں　　آئینہ کی شکل یاں عالم وہاں تصویر کا　(داغ)

سوز فراق

बिरह की ज्वाल सों बीजुरी जराय डारौं ।　　برہ کی جوالن سوں بیجوری جرلے ڈاروں

स्वास से उड़ाऊं बैरी बेदरद बादरन ॥　　سوانس سے اوڑاؤں بیری بیدرد بادرن

فراق کی سوزش سے بجلی کو جلا ڈالوں اور اپنی آہ گرم سے بادلوں کو اُڑا دوں ؎

پڑا فلک کو کسی دل جلے سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں　(داغ)

اسی طرح فراق۔ اشکباری۔ یاد محبوب وغیرہ کی مثالیں سمجھیے۔

(۳) مطائبہ (हास्य रस ہاسیہ رس)

تغزل میں تبادلہ دھیرے دھیرے ہوتا ہے مگر مطائبہ میں یک بیک پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک برقی لہر ہے جو یک بیک جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ مثلاً ہم کسی کو برسات میں پھسل کر گرتے دیکھتے ہیں تو یک بیک ہنس دیتے ہیں۔ کسی شخص کو عجیب و غریب سوانگ میں جو اسکی فطرت سے

الگ ہو دیکھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں۔

ہنسی کیا ہے؛ یہ ایک الگ سوال ہے۔ اس سے ہمیں یہاں بحث نہیں۔ یہ کیوں آتی ہے؛ اس کے متعلق راقم الحروف کا خیال ہے کہ خلاف فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ اگر غلطی اور سہو بھی شامل ہو تو ایسی باتیں ہنسی پیدا کرتی ہیں۔ برگسن کا خیال ہے کہ جب انسان بے اختیاری میں مشین کی طرح کام کرنے لگتا ہے تو اسی وقت وہ ہنسی کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے کوئی چلتے چلتے گر پڑے اور گیند کی طرح تھوڑی دور تک لڑھکتا چلا جائے۔ تو یہ غیر اختیاری حالت دیکھنے والوں کے لئے ہنسی کا سبب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جملے جب اپنے اصلی معنی سے الگ معنی پیدا کرتے ہیں یا وہ ایسی تشبیہ و استعارے سے مملو ہوتے ہیں جو اس کے لئے زیبا نہیں تو وہ مطائبات کے سبب بن جاتے ہیں۔ اُردو میں صنعت حسن التعلیل و اکبر مرحوم کا ظرافت آمیز کلام اس کے بہترین نمونے ہیں۔ سنسکرت کا ایک اشلوک سنیئے۔

कमल कमला शेते हर: हिमालये। क्षीरा बद्धौ च हरि शेते मन्ये मुत्कुण शंकया

مطلب یہ ہے کہ لکشمی جی کمل پر سوتی ہیں شیوجی ہمالیہ پر اور شیوجی چھیر ساگر میں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دُنیا میں کھٹمل کے ڈر سے انھیں سونے کی ہمت نہیں۔

مطائبات (ہاسیہ رس) کا جذبہ مستقل ہاسیہ (हास्य) ہنسی ہے۔

محرک جذبات۔ ہنسانیوالی چیزیں۔ ہنسی کو مشتعل کرنیوالی صورت۔ لباس۔ وضع قطع۔ زبان وغیرہ

جذبات اضافی۔ ہنسی۔ چہرے پر خوشی کے آثار۔ تعجب، مسکرانا، بشاشت وغیرہ۔

صورت انفعالی۔ سستی۔ خون میں تیزی سے روانی۔ بشاشت وغیرہ۔

ہنسی کی قسمیں (۱) تبسم زیرلب (۲) تبسم (۳) خندہ (۴) خندۂ دنداں نما۔

आइ है एक महाबन तें तिय गावत मानो गिरा पगु धारी

آئی ہے ایک مہابن تے تیہ گاوت مانو گرا پگ دھاری

सुंदरता जनु काम की कामिनी कोल कह्यो वृषभानु दुलारी

سندرتا جنو کام کی کامنی بول کہیو برشبھان دولاری

गोपि कै ल्याइ गोपालहिं वै अकुलाइ मिली उठि सादर भारी

گوپی کے لیائی گوپالہیں وے اکولائی ملی اوٹھی سادر بھاری۔

केशव भेटत ही भरि अंक हंसी सब तीक दै गोप कुमारी

کیشو بھینٹ ہی بھر انک ہنسی سب گیک دے گوپ کماری

کیشوداس کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گوپیاں کرشن جی کو زنانہ لباس پہنا کر رادھا کے پاس لائیں اور اس کو بلا کر کہا کہ بندرابن سے ایک عورت آئی ہے جو زبردست گانے والی اور نہایت حسین ہے چل کر دیکھو۔ وہ آکر اس مصنوعی عورت کو نہ پہچان سکی اور عزت کے ساتھ گلے لگایا اس پر تمام گوپیاں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

مطائبات اکبر

مس کو دیکھا عاشقِ زلفِ چلیپا ہوگیا ۔۔۔ مست تھا دل بھول کر وسکی کا پیپا ہوگیا

غضب ہے یہ صندری بڑے ہوگئے ۔۔۔ میں لیٹا تو اُٹھ کر کھڑے ہوگئے

سینہ پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے ۔۔۔ پوائنٹ نازک ہے اسے ٹچ نہ کرو

(۳) مرثیہ (करुणा रस کرونڑا رس)

کسی اپنے عزیز یا محبوب کے فوت ہونے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُسی کا نام करुणा (کرونڑا) صدمہ اور اُسی کے اظہار کا طریقہ مرثیہ ہے۔ عربی۔ فارسی اور اُردو شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی اس کا سبب یہ ہے کہ صدمات کا اثر زبردست اور دیرپا ہوتا ہے اور طبیعت کو نہایت سرعت سے مشتعل کر دیتے ہیں جس سے نہایت لطیف لطیف جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مرثیہ کا جذبۂ مستقل (शोक) صدمہ ہے اور اس کا محرک صدمات پیدا کرنے والے اسباب مثلاً محبوب کی جدائی، اسکا مرنا، اسکی لاش، تجہیز و تکفین، اس کی چیزوں کا دیکھنا، اس کی تعریف و توصیف سننا وغیرہ۔ اس کے جذبات اضافی دنیا اور علائق دنیا سے بیزاری۔ حجت، چکر کھا کر گرپڑنا، رنج و غم اور فکر ہیں۔ اس کی صورتِ انفعالی قسمت کی شکایت، زمین پر تڑپنا، رونا، لمبی لمبی سانسیں لینا، نالہ، فریاد وغیرہ۔

مثال

राम चले बन प्रान न जाहीं	رام چلے بن پران نہ جاہیں
केहि सुख लगी रहत तन माहीं	کیہی سکھ لاگی رہت تن ماہیں
राम राम सिय राम पुकारी	رام رام سیہ رام پکاری
परेउ धरनि तल ब्याकुल भारी	پریو دھرنی تل بیاکل بھاری

رام چندر جی کے بن جانے کے وقت دسرتھ جی اس طرح نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ آہ رام چندر جی بن کو

جار ہے ہیں اور ہماری جان نہیں نکلتی، اب نہیں معلوم یہ کس آرام کے خیال سے جسم میں مقیم ہے دسرتھ جی رام اور سیتا کو یاد کرتے کرتے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ انیس

مرتا ہے باپ اے علی اکبر ابھی نہ جا　　دل مانتا نہیں میرے دلبر ابھی نہ جا
اے لال سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا　　ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا

مضطر ہوں چین آئے، یہ آتا نہیں مجھے
رونے میں منہ تیرا نظر آتا نہیں مجھے

(۴) رجز (रौद्ररस رودر رس)

رجز کا جذبہ مستقل غصہ क्रोध (کرودھ) ہے۔ کوئی بات اپنی مرضی یا خواہش کے خلاف ہونے سے غصہ پیدا ہوتا ہے، غصہ اور رنج دونوں میں اپنی خواہش کے خلاف کام ہوتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ صدمات کے فاعل اپنے اختیار سے باہر اور غصہ کے فاعل زیادہ تر جسمیات سے تعلق رکھنے والے اسباب ہوتے ہیں جن سے بچا جا سکتا ہے۔ صدمات میں نا اُمیدی رہتی ہے مگر غصہ میں نہیں۔ صدمات میں عاجزی اور گڑگڑانے کا جزو اعظم ہے اور غصہ میں غرور کا۔

جذبہ مستقل غصہ۔ محرک جذبہ، اپنی مرضی یا خواہش کے خلاف کام۔ صورت انفعالی افسوس رنج۔ جذبات اضافی دانت نکالنا، باچھیں چر جانا، آنکھیں سرخ ہونا، منہ میں کف آنا وغیرہ۔

مثال

بالک بول بدھوں نہیں توہیں	बालक बोलि बधौं नहिं तो ही।
کیول منی جڑ جانس موہیں	केवल मुनि जड़ जानस मोहीं॥
بال برہمچاری اتی کوہی	बाल ब्रह्मचारी अती कोही।
وشو ودت چھتری کل دروہی	विश्व विदित क्षत्री कुल द्रोही॥
بھج بل بھومی بھوپ بن کینہی	भुज बल भूमि भूप बिन कीन्ही
بپل بار مہی دیون دینہی	बिपुल बार महि देवन दीन्ही॥
سہس باہو بھج چھیدن ہارا	सहस बाहु भुज छेदन हारा।
پرسو بلوک مہیپ کمارا	परशु बिलोक महीप कुमारा॥

پرسرام جی لچھمن جی پر بگڑ کر کہتے ہیں کہ اے بیوقوف تو نے شاید مجھے صرف درویش ہی خیال کر رکھا ہے یاد رکھ میں تجھے لڑکا سمجھ کر طرح دے رہا ہوں۔ تو شاید نہیں جانتا کہ میں لڑکپن سے برہمچاری ہوں اور

بہت زیادہ غصہ کرنے والا بھی ہوں۔ دنیا پر یہ روشن ہے کہ میں چھتریوں کے خاندان کا دشمن ہوں، میں نے اپنے بازو کی طاقت سے زمین کو بے بادشاہ کا کر دیا اور کئی مرتبہ اس زمین کو فتح کرکے برہمنوں کو بخش دیا، میں سہس باہو کے بازو کو زخمی کرنے والا ہوں تو میرے پھرسے کو دیکھ اور خوف کر۔ ؎

سمجھا ہے مجکو حق نے شہ لافتیٰ کا زور　　اس دستِ مرتعش میں ہے دستِ خدا کا زور

ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور　　پانی ہے میرے عدو کے آگے ہوا کا زور

الٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا

جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا　　(انیس)

لچھمن جی رام چندر جی سے ایک موقع پر کہتے ہیں۔

جو راؤر انوشاسن پاؤں	जौ राउर अनुशासन पाऊं ।
کندک ایو برہمانڈ اٹھاؤں	कन्दुक इवि ब्रह्मांड उठाऊं ॥
کاچے گھٹ سم ڈاروں توری	काचे घट सम डारों तोरी ।
سکوں میرو مولک ایو توری	सकूं मेरु मूलक इवि तोरी ॥

اگر میں آپ کا حکم پاؤں تو زمین کو گیند کی طرح اٹھاؤں اور کچے گھڑے کی طرح اس کو توڑ دوں اور میرو پہاڑ کو مولی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ ؎ انیس

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں　　آئے غضب خدا کا ادھر رُخ جدھر کروں

بے جبرئیل کارِ قضا و قدر کروں　　انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی

رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ٹکیا آفتاب کی

(۵) شجاعت (वीर रस　بیر رس)

ویر رس (شجاعت) کا بنیاد مستقل جوش کے ساتھ ہمت ہے، بادی النظر میں رودر رس (رجز) اور ویر رس (شجاعت) میں فرق نہیں دکھائی دیتا۔ مگر غور کرنے پر دونوں میں زبردست فرق نظر آنے لگتے ہیں۔

(۱) غصہ ہمیشہ اپنے سے کمزور پر آتا ہے اور اس میں رواداری کا اثر نہیں، مگر ویر رس (شجاعت) میں کمزور اور قوی کا خیال نہیں رہتا اور اس میں رواداری کا جزو غالب رہتا ہے۔

(۲) غصہ میں اپنی طاقت کی لن ترانی زیادہ رہتی ہے مگر ویر رس (شجاعت) میں استقلال کا جزو غالب رہتا ہے۔

(۳) غصہ کے دربار میں دشمن جس حال میں ہو اس کا ستانا، مارنا جائز ہے، مگر ویر رس (شجاعت) کے دربار میں سے مرے کو مارنا بیدردی سے ہے بہت دور جوانمردی سے
محرک جذبہ اپنی جائز مرضی کے خلاف کام۔ دشمن کا ناحق ستانا وغیرہ صورت انفعالی خوشی غمی وغیرہ جذبات اضافی استقلال، محبت، غصہ، روئیں کھڑے ہونا وغیرہ۔

مثال

छूटत कमान और तीर गोली बानन के, मुसकिल होत मुरचानहू के ओट में ।
چھوٹت کمان اور تیر گولی بانن کے مشکل ہوت مورچان ہوکے اوٹ میں

ताही समय सिवराज हुकुम कै हल्ला कियो दावा बांधि पर हलावीर भटओट में॥
تاہی سمے سیوراج حکم کے ہلا کیو داوا باندھی پر ہلا بیر بھٹ جوٹ میں

भूषन भनत तेरी किम्मेत कहां लौं कहौं हिम्मत इहां लगि है जाको भट झोट में।
بھوشن بھنت تیری کرتت کہاں لوں کہوں ہمت یہاں لگی ہے جاکی بھٹ جھوٹ میں

ताव दै दै मोछन कगूरन पै पांव दै दै अरि मुख घाव दै दै कूद परे कोट में ॥
تاؤ دے دے موچھن کگورن پے پاؤں دے دے اری مکھ گھاؤ دے دے کود پرے کوٹ میں

ایسے وقت میں جبکہ مورچوں کی پناہ میں بھی رہنا دشوار ہوتا ہو اور کمان سے تیر اور بندوق سے گولیاں برس رہی ہوں سیواجی نے قلعہ پر ہلے کا حکم دیا اور بہادر لوگ موچھوں پر تاؤ دے دیکر مخالف کو زخمی کرتے ہوئے کنگوروں پر پاؤں رکھکر قلعہ میں کود پڑے۔ بھوشن کوی کہتے ہیں کہ تیری قدر و قیمت اور ہمت بیان سے باہر ہے۔

انیس صاحب نے حضرت قاسمؑ کی شجاعت کی تصویر یوں پیش کی ہے:۔

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی نکال چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
ایک بند باندھکر جو فرس سے کہا کہ ہاں ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی ایکبے ٹوٹ گیا نابکار کا دو انگلیوں سے کام کیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور جھکا اُٹھا کے جب — قبضہ میں لی کمان کیا اِلی لعبِ غضب
چلّہ میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب — تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیر نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اُتر گیا

(۶) خوف (भयानक रस بھیانک رس)

خوف (بھیانک رس) کا جذبہ مستقل دہشت ہے، اس میں انسان کو ایسی غیر معمولی چیز سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس میں اپنے سے زیادہ طاقت ہو، اور جس سے مقابلہ میں جان جانے کا خطرہ ہو۔ یا ایسے ہولناک منظر کا سامنے آجانا جس کے دیکھنے کی تاب نہ ہو۔

محرک جذبہ، دہشت پیدا کرانے والی چیزیں۔ صورت انفعالی کانپ جانا، آنکھ جھپکنا، قدم اکھڑنا چہرہ فق ہونا وغیرہ جذبات اضافی عاجزی، افسوس، رنج، الحاح، وزاری وغیرہ

مثال

पौन पूत पागि को लगाय "भगवन्त कवि" लगत न घाव काहु तुपकत न तीर को।
پون پوت آگ کو لگائے بھگونت کوی لگت نہ گھاؤ کاہو تپکت تیر کو

रातो भयो आसमान, नातो भयो आसमान, कारो पीरो नीर भयो नीरधि के तीरको
راتو بھیو آسمان تاتو بھیو آسمان کارو پیرو نیر بھیو نیرودھ کے تیر کو

लंका लगी बरन, जरन रनिवास लाग्यो, व्याकुल होय असुर धरे नरन धीर को ॥
لنکا لگی برن جرن رنواس لاگیو بیاکل ہوے آسُر دھرے نہ رن دھیر کو

सुरन को जाप कैधौं सिता को सराप है कि रावन की पाप के प्रताप रघुबीर को
سرن کو جاپ کیدھوں سیتا کو سراپ ہے کہ راون کو پاپ کے پرتاپ رگھبیر کو

بھگونت کوی کہتے ہیں کہ ہنومان جی نے لنکا میں آگ لگائی اور اس سے وہاں کے لوگ اس طرح متاثر ہوئے کہ بندوق اور تیر کے زخم سے بھی اتنا متاثر نہ ہوتے۔ آگ کے شعلوں سے آسمان سرخ ہوگیا اور لنکا کے اطراف وجوانب میں گرمی پھیل گئی، سمندر کا کنارا آگ اور راکھ سے کالا پیلا اور نیلا ہوگیا۔ لنکا مشتعل ہوگئی اور تمام محلات شاہی جلنے لگے۔ راکھس پریشان ہوگئے۔ یہ آگ یا تو دیوتاؤں کی بددعا کا نتیجہ ہے یا سیتاجی کی بددعا ہے یا راون کے گناہوں کا نتیجہ یا رام چندرجی کے اقبال کا اثر ہے
میر انیس صاحب فوج کی ابتری اور میدان جنگ کا خوفناک منظر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

طلبانہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں چلے کہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں تھی سناں کہیں جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں
اِک اِک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں کا باغ تھا

نہ گھاٹ بارطہ اور وہ اُس کی چمک دمک کانپی کبھی زمیں کبھی تھرّا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک ہر ضرب میں سماسے تلاطم تھا تا سمک
کوئین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاؤ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سیاہ لعیں ہٹی یہ صف ہوئے لیسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال، نہر کہیں سے کہیں ہٹی دہشت سے آسماں ہوا اونچا، زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیِ گردوں پہ چڑھ گیا

(۷) نفرت (विभतस)

نفرت کا جذبہ مستقل کراہت اور گھن ہے، اس کے طریقۂ اظہار کا نام ہجو ہے۔ بھیانک رس اور نفرت میں فرق یہ ہے کہ بھیانک رس میں نقصان پہنچنے کا خوف لگا رہتا ہے اور نفرت میں یہ بات نہیں ہوتی۔ بھیانک رس میں خوف کی وجہ سے علحدگی اختیار کی جاتی ہے اور نفرت میں اس کی کراہت علحدگی پر مجبور کرتی ہے۔ محرک جذبہ، بدبو، مکروہ صورت وغیرہ۔ صورت انفعالی طبیعت کا بدکیف ہو جانا جذبات اضافی، ناک، مُنہ سکوڑنا، منہ پھیر لینا، لوٹ آنا وغیرہ۔

مثال

अनतवारी लै उड़त गिद्ध पिशाच कर गहि धावहीं।
انتواری لے اُڑت گدھ پشاچ کر گہی دھاوہیں۔

संग्राम पुर वासी मनहु बहु बाल गुड्डि उड़ावहीं ॥
سنگرام پُر باسی منہو بہو بال گوڈی اوڑاوہیں

گدھ انتڑیوں کو لیکر اوپر اوڑتے ہیں اور بھوت (پشاچ) اس کو ہاتھ میں پکڑ کر دوڑتے ہیں اسکو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لڑکے پتنگ اُڑا رہے ہیں۔

तिमिर लंग लई मोल चली बब्बर के हलके
تمر لنگ لئی مول چلی ببر کے ہلکے

रही हुमायूं साथ गई अकबर के दल के
رہی ہمایوں ساتھ گئی اکبر کے دل کے

जहांगीर जस लियो पीठ को भार छोड़ायो
جہانگیر جس لیو پیٹھ کو بھار چھڑایو

शाहजहां कर न्याय ताही को मांड़ चटायो
شاہجہاں کر نیاو تاہی کو مانڈ چٹایو

बलहरित भई पौरुश थक्यो भागी फिरत बन सियार डर
بل ہرت بھئی پورش تھکیو بھاگی پھرت بن سیار ڈر

औरंगज़ेब करनी सोई लै दीन्ही कवि गंग घर
اورنگ زیب کرنی سوئی لے دینھی کوی گنگ گھر

کوی گنگ ہاتھی کی ہجو میں کہتے ہیں کہ اس کو تیمور لنگ نے مول لیا تھا اور بابر کے ساتھ برابر رہا بابر کے مرنے کے بعد ہمایوں اور اکبر کے ساتھ رہا، جہانگیر کے وقت میں ضعیف ہو گیا تو اُس نے اپنی سواری سے آزاد کر دیا، شاہجہاں نے اس کو تبرک سمجھکر عزت کی اور آش چٹا چٹا کر پرورش کی جب بہت ضعیف ہو گیا تو گیدڑوں کے ڈر سے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا اسی کو اورنگ زیب نے کوی گنگ کو انعام میں دیا۔

سودا کی ہجو ملاحظہ ہو:۔

اِک دن گیا تھا انکے یہ گھوڑا برات میں — دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ سپید سے ہو اسفید — تھا سرو سا جو قد سو ہے اب شاخ باردار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں — شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں — دشمن کو بھی خدا نکرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ — ٹک تک سے پاشنے کے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے توبڑہ اُسے دکھلائے تھا سئیس — پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے بار بار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام — اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یہ پکار

پیٹے اسے لگا ڈ کہ تا ہو وے یہ رواں یا بادبان باندھو تو پَون کے دو اختیار

(۸) استعجاب (अद्भुतरस = ادبُھت رس)

اس رس کا جذبہ مستقل تعجب ہے۔ اس رس میں بھی مطایبہ کی طرح انقلاب ہوتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے۔ مطایبہ میں استقلال کم ہوتا ہے اور اس کے اسباب کچھ نہ کچھ ظاہر رہتے ہیں مگر لطیفہ کے اسباب ظاہر نہیں رہتے اور اگر کچھ ظاہر بھی ہو جائے تو وہ کسی کی بھول اور غلطی پر مبنی نہیں ہوتے محرک جذبہ تعجب میں ڈال دینے والی چیزیں، صوفیوں کے رموز اور کنائے صورت انفعالی۔ حیرت ہنسی۔ غور میں پڑ جانا وغیرہ۔ جذبات اضافی، چہرہ فق ہونا، ہنس دینا، پریشان ہو جانا وغیرہ۔

مثال

बिनु पद चलै सुनै बिन काना।
بن پد چلے سنے بن کانا

कर बिन कर्म करे विधि नाना॥
کر بن کرم کرے بدھ نانا

बिन बानी बकता बड़ योगी।
بن بانی بکتا بڑ یوگی

आनन रहित सरस रस भोगी
آنن رہت سرس رس بھوگی

تلسی داس خدا کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ وہ بغیر پیر کے چلتا ہے اور بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر ہاتھ کے طرح طرح کے کام کرتا ہے، بلا زبان کے بڑا بھاری خطیب ہے وہ تمام لذات سے بری اور تمام لذات میں ڈوبا ہوا ہے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں:-

ہے وہ بے آنکھ دیکھتا سب کو ہے وہ بے کان سنتا مطلب کو
اپنی مرضی سے کام کرتا ہے بے زباں وہ کلام کرتا ہے

अधर जोत विद्रुम भये लो कर मुक्ता लीन
ادھر جوت ودرم بھئے جو کر مکتا لین

निरखत ही गुंजा भये फिर हँसि मुक्ता कीन
نرکھت ہی گنجا بھئے پھر ہنس مکتا کین

حسین عورت نے جب ہاتھ پر موتی رکھا تو سُرخ سُرخ ہونٹوں کے عکس سے مونگا ہو گیا جب وہ تعجب میں آکر غور سے دیکھنے لگی تو پتلیوں کے عکس سے گھونگھچی ہو گیا اس پر اس کو سخت تعجب ہوا اور

ہنس دی، اب دانتوں کی چمک سے پھر موتی کا موتی ہوگیا۔ ذوق صاحب فرماتے ہیں سہ

رُخِ گلرنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ
کیا تماشا ہے کہ بن جاتا ہے مونگا گوہر

(۹) معرفت (शान्तरस شانت رس)

اس رس کا جذبہ مستقل معرفت ہے، اس میں طمانیت قلبی حاصل ہوتی ہے۔ محرک جذبہ دنیا کا ناپائدار ہونا، صحبت صالح، عارفانہ خیالات صورت انفعالی، دنیا کو فانی اور تعلقات دنیا کو فضول سمجھنا
جذبات اضافی حیرت، بیزاری، ہستی، رنج، خوشی، دیوانگی وغیرہ

مثال

میں دیکھو نردھار یہ جگ کانچو کانچ سم — मैं देख्यो निर्धार यह जग कांचो कांच सम।
ایکے روپ اپار پرت بمبت لکھیت تہاں — एकै रुप अपार प्रति बिम्बित लखियत तहां॥

میں نے خوب غور سے دیکھا ہے یہ دنیا کچے کانچ کے مانند ہے اسمیں جدھر نظر پڑتی ہے ایک ہی روپ دکھائی دیتا ہے سہ درد

جوں آئینہ جسے یاں نظر کی
ساتھ اپنے دو چار ہوگئے ہم

کرم گت ٹارے ناہیں ٹرے — करम गत टारे नाहिं टरे ।
मन 'बच' कर्म अगाध अगोचर केहि विधि बुध संचरे॥
من بچ کرم اگادھ اگوچر کہی بدھ بدھ سنچرے۔

جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔ خدا دل۔ زبان، افعال یعنی تمام محسوسات سے پرے ہو۔ بھلا وہ عقل میں کیسے آسکتا ہے۔

آتش:۔ معرفت میں اس کی ذات پاک کے — اُڑتے ہیں ہوش وخرد ادراک کے
اکبر:۔ عقل میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا — جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

مرزا رسوا مرحوم

(۳)

(از مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

مثنویات

لذتِ فنا مرزا صاحب کی بہت مختصر مثنوی ہے، اس کا سببِ تصنیف یہ ہے کہ ایک دن عرفی شیرازی کا یہ شعر نظر سے گزرا۔

ذوقِ فنا نیافتہ ورنہ در نظر　　　رنگیں تر از بہار بود جلوۂ خزاں

دیر تک محویت رہی اوسی عالم میں چند شعر قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کئے، ایک مختصر مثنوی تیار ہوگئی۔ یہ نظم از اول تا آخر حکیمانہ خیالات سے لبریز ہے، میرے خیال میں علاوہ یہ نظم کہیں نہیں چھپی ہے اس لئے زیادہ حصہ اُسکا نقل کئے دیتا ہوں۔

موت کلیدِ درِ اسرار ہے　　　موت مسیحائے ہر آزار ہے
معنیٔ امکان تغیر ہے موت　　　صورتِ بطلان تحیر ہے موت
موت ہے لاریب کمالِ حیات　　　علتِ غائی و کمالِ حیات
زندگیٔ صاحبِ عرفاں ہے موت　　　راہبرِ کوچۂ جاناں ہے موت
موت سے ڈرتے نہیں اہلِ کمال　　　موت سے ڈرنا ہے حماقت پہ دال
مایۂ زحمت ہے پئے اشقیا　　　آیۂ رحمت ہے پئے اولیا
قیدِ تشخص سے چھڑاتی ہے یہ　　　عالمِ تجرید دکھاتی ہے یہ
بند کشائے قفسِ تن ہے یہ　　　سیر نمائے گل و گلشن ہے یہ
زیست ہے اک اسم یہ موسوم ہے　　　زیست ہے اک لفظ یہ مفہوم ہے
اس سے بنا مطلبِ هست و بود　　　اس سے کھلا رابطۂ ہست و بود
علت و معلول بقا و حیات　　　حاصل و محصول بقا و حیات

خرچ کن مسیِ جسیم و رجا — درس دہ مکتبِ فقر و فنا
قالعِ شہواتِ طبیعی ہے یہ — ہادم لذاتِ طبیعی ہے یہ
بادۂ نخوت کا یہی ہے خمار — نشۂ دولت کا یہی ہو اُتار
سرد کنِ آتشِ ظلم و فتور — زرد کنِ چہرۂ اہلِ غرور
ہمہمِ مجلسِ شور و شغب — محتسبِ محفلِ عیش و طرب
علتِ کابوس و دماغِ علیل — مورثِ غلیانِ مزاجِ غلیل
مبطلِ ہر دعوی باطل ہو یہ — عجز ہے یاں سب کو وہ مشکل ہو یہ
راسِ غلطیات ہو حیلات — حکمت و عرفان ہی خیال محات
زیست میں ہو شائبۂ فصلِ دوست — موت میں ہو ذائقۂ وصلِ دوست
موت ہے محبوبِ شہیدانِ عشق — موت ہو مطلوبِ مریدانِ عشق
قلزمِ ہستی کا کنارا ہے یہ — جیتے ہیں جسپر وہ سہارا ہے یہ
ذاتِ خدائے ازل کے سوا — اور ہر اک شئے کیلئے ہے فنا
داخلِ ہر خلوت و جلوت ہو یہ — عارضِ ہر وحدت و کثرت ہو یہ
کونسے جوہر میں نہیں اسکا نور — کونسے عالم میں نہیں اسکا شور
چار عناصر میں اسی کی ہو دھوم — ملکے ہوا میں ہوئے بادِ سموم
مادۂ خاک سے پیدا ہوئی — زہر کی صورت میں ہویدا ہوئی
آب میں سیلاب کی صورت بنی — نار میں احراق کی علت بنی
مطلعِ انوارِ جمالی ہے یہ — مظہرِ آثارِ جلالی ہو یہ
جوہرِ آئینۂ علم و کمال — گوہرِ گنجینۂ ذکر و خیال
عینِ عنایاتِ عزیزِ علیم — قدرتِ قہارِ قدیر و قدیم
مرہمِ زخمِ غمِ دوری ہو یہ — واسطۂ قربِ حضوری ہو یہ
زیست حجابِ رخِ مطلوب ہو — بندِ نقابِ رخِ محبوب ہے
موت نے کی عقدہ کشائی اگر — شاہدِ مقصود ہوا جلوہ گر
لوثِ ہیولے سے مبرا کیا — عارِ تعین سے معرا کیا
عالمِ ناسوت سے پائی نجات — ہوگیا حاصل شرفِ قربِ ذات

داخلِ بزمِ جبروتی ہوئی محرمِ رمزِ ملکوتی ہوئی
عابد و معبود ہوئے روبرو شاہد و مشہود ہوئے روبرو
ساجد و مسجود مقابل ہوئے فانی و موجود مقابل ہوئے
عاقل و معقول ہوئے ایک جا قابل و مقبول ہوئے ایک جا
عالم و معلوم میں قربت ہوئی حاکم و محکوم میں قربت ہوئی
باطن و ظاہر کا کھلا مدعا اول و آخر کا کھلا مدعا
پردہ دوئی کا نہ رہا درمیاں کھل گئے اسرارِ نہانی عیاں
قطرہ و دریا میں ہوا اتحاد سہل ہوئی مشکل عود و معاد
لطفِ حیاتِ ابدی مل گیا نقد وصالِ صمدی مل گیا
روک لے مرزا قلمِ رستہ خاک مسلکِ توحید ہے اندیشہ ناک
ظلمتِ ظلمات سے تاریک ہے بال سے تلوار کی باریک ہے
پائے خرد لنگ ہے اس راہ میں جوہرِ کل زنگ ہے اس راہ میں
برتر از ادراک و خیالِ بشر خارج از امکانِ قیاس و نظر
حرف و حکایت کا یہ موقع نہیں رمز و کنایت کا یہ موقع نہیں
خوب لکھی تو نے ثنائے ممات دور ہوئی دل سے ہوائے حیات
عالمِ اجسام ہے ناپائدار ہستیٔ موہوم کا کیا اعتبار

مثنوی امید و بیم | اسا برا تقویٰ برین کالج میں شب کو پڑھانے جاتے تھے وہاں کسی سے تعلق خاطر ہو گیا اُسی دھن میں مثنوی امید و بیم کہہ ڈالی، اس میں تین جزو ہیں۔ جزو اول میں اُن آرزوؤں کا ذکر ہے جو کبھی پوری نہ ہونگی کسی کے تصور سے رمز و کنایت شکوہ و شکایت کا سلسلہ خواہ مخواہ پیدا کیا گیا ہے۔

جزو دوم میں صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر پھر انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے۔

جزو سوم میں طلسم امید و بیم کی ایک نمائش دکھائی گئی ہے۔

یہ پوری مثنوی سوائے حصۂ اول کے حکیمانہ خیالات سے مملو ہے۔

اشعارِ ذیل سے شروع ہوتی ہے:-

مرد اے حوصلۂ عشق و وفا مرد اے ولولۂ حرص و ہوا
مرد اے غلغلۂ جامہ دری مرد اے سلسلۂ بخیہ گری

مژدہ اے رنجِ گرفتاریِ دل مژدہ اے راحتِ بیکاریِ دل

مژدہ اے سوزشِ پنہانِ ہوس مژدہ اے شورشِ طوفانِ ہوس

مژدہ اے حسرتِ ناکامیِ شوق مژدہ اے وسعتِ بدنامیِ شوق

مژدہ اے دوستیِ تیغ و جگر مژدہ اے دشمنیِ سعی و اثر

مژدہ اے لذتِ افکارِ محال مژدہ اے تلخیِ اوقاتِ خیال

مژدہ اے ہمتِ دشوار پسند مژدہ اے جرأتِ آزار پسند

مژدہ اے نطقِ پریشاں تقریر مژدہ اے خامۂ ہذیان تحریر

اسکے بعد پانچ چار مصرعوں میں اپنی جوانی کے افسانے بیان کئے ہیں پھر اپنے عشق کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر ہوا عشق دلِ مضطر کو دو جنبہ میرے نصیحت گر کو

ہے ابھی تک وہی آشفتہ سری ۔ چارہ گر آکے کریں چارہ گری

کوئی تدبیر نکالیں اب بھی وہی زنجیر نکالیں اب بھی

آجتک سر سے وہ سودا نگیا عشقبازی کا وہ لپکا نہ گیا

راہِ الفت میں مجھے ٹوکیں تو وہیں جاتا ہوں مجھے روکیں تو

دھجیاں ڈھونڈھکے لائے کوئی پھر رفوگر کو بلائے کوئی

اس حصہ میں تو شاعری ہے اور اصلیت بہت مختصر مگر جزو دوم سے مرزا اپنے فلسفیانہ رنگ پر آگئے اور وہی حکیمانہ باتیں چھیڑ دیں۔

نفس کی تعریف میں کہتے ہیں:۔

سرِ مکتوم ہے کیفیتِ نفس کسکو معلوم ہے ماہیتِ نفس

محشرستانِ خیالِ انساں اِک طلسمات ہی حالِ انساں

کبھی ناظر ہے کبھی ہے منظور کبھی مختار کبھی ہے مجبور

مرکزِ دائرۂ بیم و رجا محورِ دائرۂ حرص و ہوا

جمع ہیں اس میں صفاتِ متضاد ہے مرید آپ ہی اور آپ مراد

کبھی طاعت میں ملک سے بھی سوا کبھی رفعت میں فلک سے بھی سوا

رہروِ منزلِ بدنامیِ شوق گروِ وادیِ ناکامیِ شوق

اپنی کوشش پہ کبھی ناز اسے ناامیدی نے کبھی ساز اُسے

مضمحل کوے جفا میں نہ کبھی   مستقل راہِ وفا میں نہ کبھی
کبھی آوارۂ میدانِ ہراس   کبھی گم کردۂ غولِ وسواس
کبھی جلوہ ہے کبھی طُور ہے یہ   کبھی سایہ ہے کبھی نور ہے یہ
میکشِ خمکدۂ جوش و خروش   خود فراموش سراسر مدہوش
کبھی دیوانۂ حسنِ تجرید   کبھی مستانۂ جامِ توحید

عالمِ کون و فساد کو ایک حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں:-

قابلِ غور ہیں اسرارِ وجود   دیکھنا چاہیئے آثارِ شہود
کچھ تو سمجھیں یہ معما کیا ہے   کچھ تو دیکھیں یہ تماشا کیا ہے
ہے جہاں صنعتِ صانع پہ دلیل   آیۃ اللہ ہے یہ بے تاویل
غور سے دیکھ شہودِ اشیا   اک تماشا ہے نمودِ اشیا
دیکھ تو صنعِ خدا کی عظمت   حیرت افزا ہے فضا کی وسعت
جس میں لاکھوں متحرک اجسام   اک وطیرے پہ ہیں گردش میں مدام
راستوں میں نہ وہ اٹکیں نہ تھکیں   اپنے محور سے کبھی ہٹ نہ سکیں
نہ الجھتے ہیں نہ گرتے ہیں وہ   ایک ہی وضع سے پھرتے ہیں وہ
کیوں گریں دوڑ کے چلتے ہی نہیں   حد سے باہر وہ نکلتے ہی نہیں
بیضوی شکل کسی کی تدویر   حرکت جس میں اسے بے تاخیر
متکافی متزاید حرکات   متباین متباعد حالات
حجم میں کوئی زیادہ کوئی کم   ایک سے ایک کو ہے ربط بہم
اک نئی شان ہے دیکھو جس کو   کھینچتا ہے یہ اسے وہ اسکو
یہ نہ سمجھو کہ ہیں اتنے تارے   آنکھ سے دیکھے ہیں جتنے تارے
نظر آتے نہیں ہمکو اکثر   جو کہ ہیں حدِ نظر سے باہر
دیکھ کیا حال ہے سیاروں کا   عجب انداز سے رفتاروں کا
گردشوں کیلیئے میدانِ وسیع   اک تماشا ہے بطی اور سریع
سیکڑوں شمس ہزاروں اقمار   بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھکے شمار
شمس کے گرد ہیں سارے سیار   گردِ سیار ہیں دائرا قمار

روشنی میں کوئی کم کوئی سوا　　ایک سے ایک کرے کسب ضیا
اس قدر دور ہیں اکثر انجم　　دیکھتے ہی نہیں جنکو ہم تم
بسکہ تیز ہے بہت دور اُن کا　　راستہ میں ہے ابھی نور انکا
دور ایسے ہیں وہ اجرامِ فلک　　روشنی ان کی نہ پہونچے ہم تک
ان کے ابعاد خدا ہی جانے　　ان کی تعداد خدا ہی جانے
ہے فضا جسم اثیری سے بھری　　ضو کی اس وجہ سے ہو جلوہ گری
حاملِ ضو ہے یہی جسم لطیف　　یہ ہوا جس کے مقابل میں کثیف
دیکھ آنکھوں سے یہاں کیا ہے　　دیکھ تو ظاہر و پنہاں کیا ہے
ایک ہی حکم کے سب ہیں تابع　　کیونکہ ہے ایک ہی اُن کا صانع
اک تماشا ہے یہ چلتی ہوئی کل　　عقل نے جسکی نہ پائی اٹکل
پرزے پرزے میں بھری ہے قوت!　　جس سے قائم ہے نظامِ حرکت
دور کیوں جا یہ زمیں کیا کم ہے　　بلکہ ہر ذرہ نیا عالم ہے
دیکھ اجرام ذواتُ الاذناب[1]　　اُنکے میقات اور اُنکے اسباب
چھوٹے تارے جنہیں کہتے ہیں شہاب　　ٹوٹتے رہتے ہیں جو مثلِ حباب
راہ میں دورِ زمیں کے آکر　　جب وہ کھاتے ہیں ہوا سے ٹکر
فوراً آجاتی ہے شامت اُنکی　　یہی ٹکر ہے قیامت اُن کی
اتفاقاً جو کوئی جرم کبیر　　جسکے آگے ہو زمیں جرم صغیر
بیچ میں پڑکے کہیں ٹکر کھائے　　دفعتہً ساری زمیں چکر کھائے
آئے اس طرح اِک آوازِ مہیب　　لوگ جانیں کہ قیامت ہو قریب
پرزے پرزے ہو جہانِ آباد　　ذرہ ذرہ ہو فضا میں برباد
ایک دم میں نہ شجر ہوں نہ حجر　　نہ چرندے نہ پرندے نہ بشر
کچھ زمیں پر نہیں موقوف یہ بات　　نہیں عالم میں کسی شے کو ثبات
کیا تعجب یہ کرہ جب ہو شکست　　یا کوئی اور ہی کوکب ہو شکست
مرکزِ ثقل سے گر جائے قمر　　پھر جہاں میں نہ نظر آئے قمر

---

[1] دمدار ستارے۔

شمس پر بھی کوئی آفت آجائے | سارے عالم میں قیامت آجائے
ابھی باطل ہو نظام شمسی | جائے ظلمت ہو مقام شمسی
روشنی ہو نہ حرارت ہو کہیں | زندگی ہو نہ طبیعت ہو کہیں
ہو صورت نہ ہیولیٰ کا پتا | نہ ہو قوت نہ انرجی کا پتا
ہیں یہ اعراض وجواہر کیا چیز | ایک ہی آن میں ہوں سب ناچیز
اس سے ہو ذات خدا بے پروا | کہ ہو اک دم میں جہاں ناپیدا
اُس کی مرضی پہ ہے پیدا ہونا | کچھ ضروری نہیں ان کا ہونا
ان گھروندوں کا بنانا بھی ہے سہل | اور پھر اُن کا مٹانا بھی ہے سہل
کیوں بنایا یہ ہمیں کیا معلوم | کیوں مٹایا یہ ہمیں کیا معلوم
اُسکی حکمت سے ہے یہ کون و فساد | اُس کی تقدیر سے ہے بود و معاد
رمز ایجاد کو کیا پہچانیں | بھید کی بات ہے ہم کیا جانیں

نو بہار۔ مرزا کی تمام مثنویوں میں اس مثنوی کا پایہ باعتبار زبان وخیالات بہت بلند ہے۔ یہ مثنوی نہایت مختصر ہے اور ابتدائی کلام معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ التفات کے قابل نہیں۔ چند شعر اس کے سُنکر اس باب کو ختم کر دیجیے۔

طفل غنچہ کی چمن میں آج بسم اللہ ہے | جس طرف دیکھو ادھر اللہ ہی اللہ ہے
کہد وملا سے گلستاں کا سبق ہو اب فضول | لیگئے مکتب کے لڑکے جھولیاں بھر بھر کے پھول
ابر دریا بار نے گلبن کے تھالے بھر دیے | ساقیِ فیاض نے نئے سے پیالے بھر دیئے
باغ میں کالی گھٹا نے آ کے چھائی چھاؤنی | کھل گئے کھانے زنگار رنگ پھولی ساؤنی

سلام

مرزا صاحب کو مرثیہ وسلام کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی مگر مرزا محمد جعفر صاحب اَوج مرحوم کی خاطر سے اکثر سلام کہا کرتے تھے حضرت اَوج مرحوم دستور قدیم کے موافق چھبیسویں رجب کو نیا مرثیہ میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں پڑھا کرتے تھے۔ اس موقع پر اکثر مرزا صاحب سے اصرار کر کے سلام کہلواتے تھے اور قبل اپنے مرثیہ کے خود پڑھا کرتے تھے۔ مرزا کے ساتھ میں بھی اکثر اُن مجلسوں میں شریک ہوا ہوں جس میں اُنکے سلام پڑھے گئے ہیں۔ مرزا محمد طاہر صاحب رفیع خلف حضرت اَوج مرحوم سے مرزا صاحب کے چند سلام ملے[1]

[1] کیونکہ یہ سب مکمات ہیں مرزوری صرف ذات واجب الوجود ہے۔

باقی سرمایہ سلاموں کا بھی ضائع ہوگیا۔ چند اشعار انتخاب کرکے لکھتا ہوں:۔

(۱)

شوقِ تسلیم و رضا بے سروساماں نکلا　　بے کفن فاطمہ کا زینتِ داماں نکلا
اشک کا تار مسلسل ہے نہ کر فکر مآل　　سلسلہ عفو کا اے خجلتِ عصیاں نکلا
لاشِ سرور کا نہیں کوئی چھپانے والا　　اب تو ارماں ترا اے ریگِ بیاباں نکلا
ہیچ ہو جائے گی خورشیدِ قیامت کی نمود　　دل سے میرے جو کوئی داغ نمایاں نکلا
غمِ کونین کو حسرت نے جگہ دی دل میں　　ہم جسے تنگ سمجھتے تھے پریشاں نکلا
ذکر مرزا کے جو نالوں کا ہوا گلشن میں　　آشیاں سے نہ کوئی مرغِ خوش الحاں نکلا

(۲)

صورتیں غم کی ہیں یوں تازہ گرفتاروں میں　　کوئی دیکھے تو کہے نقش ہے دیواروں میں
اے خوشا گرمیِ بازارِ جمالِ اکبرؑ　　نام لکھواتے ہیں یوسف بھی خریداروں میں
پاس تھا صنعت و قدرت کے ذخیرہ جتنا　　ہے وہ سب شبرؑ و شبیرؑ کی سرکاروں میں
گو کہ کمسن تھے بہت حضرت زینب کے پسر　　آنکھ جھپکی نہ چمکتی ہوئی تلواروں میں
سرِ اصغر کو جو دیکھا تو یہ بولا انصاف　　کیا یہ بچہ بھی ہے حاکم کے گنہگاروں میں
مشورہ فوج میں ہے لاش کی پامالی کا　　نہیں جز یاس کوئی شہ کے طرفداروں میں

(۳)

منزلِ شوق سے تا سرحدِ عرفاں جاتے　　کربلا ہوتے ہوئے سوئے خراساں جاتے
بزمِ ماتم بھی نہیں سوزِ الم سے خالی　　ہم کہاں جینے کو اے شمعِ شبستاں جاتے
دل بھی ہے درد بھی ہو سر بھی ہو سودا بھی ہے　　عرصۂ حشر میں کیوں بے سروساماں جاتے
لاشِ اکبر پہ یہ کہتی تھی جوانی روکر　　ایسے دیکھے نہیں دنیا سے پُرارماں جاتے
ہے وہ درگاہِ حسینی کہ بشرطِ اقبال　　دن میں سو بار گدائی کو سلیماں جاتے
منزلِ شوق میں جو پاؤں ہوئے گرد آلود　　(قلم) کیوں لیے زینتِ اورنگِ سلیماں جاتے
تاجِ شاہی کو مبارک رہے رفعت اپنی　　خاک ہو کر بھی نہ ہم تا سرِ خاقاں جاتے
آرزو تھی کہ ہم اس راہ میں سرتا بقدم　　اپنے سائے کی طرح خاک پہ غلطاں جاتے
قسمِ حضرتِ عباس کہ اس وادی سے　　ہو کے پیاسے نہ سوئے چشمۂ حیواں جاتے

قتل میں سبط پیمبر کے جو ہوتے نہ شریک — کس بہانے سے جہنم میں مسلماں جاتے
کربلا جاتے تو اس شان سے جاتے مرزا — خستہ دل خاک بسر چاک گریباں جاتے

مرزا صاحب کا اس قدر کلام بہت دقت سے دستیاب ہوا۔ تصابہ۔ خدنگ نظر۔ پیام یار کہنہ کے پرانے رسالے۔ امراؤ جان وغیرہ سے بعض بعض اشعار نقل کئے گئے، اور اس کا افسوس رہا کہ ان کا کلیات برباد ہو گیا۔

مرزا کی قدر جیسی چاہئے نہیں ہوئی، بلکہ یہ کہنا چاہئیے کہ انھوں نے اپنی خود نہیں کی۔ موجودہ زمانہ اس رنگ کا ہے کہ ارباب کمال جب تک اپنی شہرت کے اسباب نہ پیدا کریں لوگ پہچانتے ہی نہیں مرزا صاحب فطرتاً اس بات سے محروم تھے۔

مرزا صاحب کے اُن تلامذہ کا شمار ہی نہیں ہو سکتا جنھوں نے کالجوں میں اون سے فیض حاصل کیا۔ گھر پر آنے والے اصحاب بھی بہت کثرت سے تھے جن میں بعض مشہور ادیب اون کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اکثر افادات حاصل کئے مگر مرزا صاحب کی ذات اس سے مستغنی تھی کہ وہ اپنا شاگرد کسی کو بتائیں اور اس پر فخر و مباہات کریں۔ وہ ہمیشہ سب سے دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔

بہترین تحفہ

(بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو)

میرے لئے صندل کا شربت نہ لاؤ۔
میرے محبوب! مجھے وہ خاک پا جمع کر لینے دے جسے تو نے شرف خرام بخشا ہے، وہ ذرات خاک میرے لئے ریزۂ گل ہیں۔ مجھے قند و شکر کے سرو شیریں رس بھرے پیالے درکار نہیں۔ تیرے ہاتھ سے مس کئے ہوئے جام سفالی کا ایک قطرہ میرے لئے "اولمپس" کی شراب آسمانی سے زیادہ ہے۔ تیرے خوان کرم کے ریزے میرے لئے لذیذ ترین طعام ہیں۔ مجھے کنول کے اس ہار کی ضرورت نہیں جسمیں شبنم در آغوش پھول گندھے ہوئے ہیں اور جنھیں صبح کے چاند نے بیدار کیا ہے۔ میرا تڑپتا ہوا سینہ تیرے نقوش پا سے ایک ایسی بڑی مسرت محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسی تسکین جو خواب حیات کی لذتوں سے زیادہ ہے۔ میرے لئے سمندروں کی تہ سے نادر الوجود موتی نہ لاؤ۔ مجھے گوشہ ہائے عالم کے ناممکن الحصول جواہر درکار نہیں! میرے محبوب! میرے آگے یہ سب سیم و زر ہیچ ہے۔ زنبیل تیرے ایام رفتہ کا سوگ اور گرم گرم آنسوؤں کا راز میرے لئے تیرا بہترین تحفہ ہے۔

(عام اخبار)

اینگلو پرشین آئل کمپنی اور حکومت ایران

(از مسٹر منوہر لال طالب بی اے ایل ایل۔ بی۔ وکیل چکوال)

چند ماہ سے بین الاقوامی سیاسیات میں اینگلو پرشین آئل کمپنی اور حکومت ایران کا جو قضیہ چھڑا ہوا ہے، اہل نظر سے اس کی اہمیت پوشیدہ نہیں۔ اینگلو پرشین آئل کمپنی تیل اور متعلقہ معدنیات کے شصت[۶۰] سالہ اجارہ کے تحت کام کرتی ہے۔ یہ اجارہ سنہ ۱۹۰۱ء میں ولیم ناکس ڈی آرکی کے حق میں ہوا تھا۔ بعد میں کناڈا کا مشہور کروڑپتی لارڈ اسٹراتھکونا بھی اس میں شامل ہو گیا۔ تیل دریافت ہونے پر سنہ ۱۹۰۹ء میں یہ کمپنی وجود میں آئی۔ موجودہ حکومت ایران کا خیال ہے کہ یہ معاہدہ ناجائز دباؤ اور دھوکے سے کیا گیا ہے اس لئے حکومت پر اب اسکی پابندی لازم نہیں اور وہ اسے جب چاہے منسوخ کرنیکی مجاز ہے۔ چنانچہ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء میں شاہ ایران نے یہ مستاجری نامہ رد کر کے کمپنی کو مطلع کر دیا کہ آئندہ معاہدہ مذکور کالعدم متصور ہوگا۔ بالفاظ دیگر کمپنی کا کام حکماً بند کر دیا۔ ادھر اینگلو پرشین آئل کمپنی بھی کوئی معمولی کمپنی نہ تھی جو خاموش ہو کر بیٹھ جاتی، لہذا کمپنی مذکور نے اس حکم کے سامنے گردن تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ حکومت ایران کو میعاد مقررہ سے پہلے کمپنی کے کاروبار میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ معاہدہ کی تکمیل عرصہ ہوا ہو چکی ہے اور اکتیس[۳۱] سال سے اسپر عملدرآمد ہو رہا ہے جو مزید اُنتیس سال تک جاری رہیگا۔ اس طرح یہ جھگڑا شروع ہو گیا۔ قضیہ کی تفصیلات میں جانے سے پیشتر اینگلو پرشین آئل کمپنی کے متعلق بعض باتیں عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کے بغیر ناظرین کو فریقین کی صحیح پوزیشن کا علم نہیں ہو سکتا۔

ایران میں تیل کے موجودہ کنوئیں پچیس سال کے صبر آزما تجربات کا نتیجہ ہیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں مشہور برما آئل کمپنی نے ایک کمپنی بنائی جسکا نام اینگلو پرشین آئل کمپنی رکھا گیا۔ آج بھی اول الذکر کمپنی موخرالذکر کمپنی کے جاری شدہ سرمایہ میں جو بقدر اُنتالیس کروڑ نوے لاکھ پونڈ ہے ساڑھے تین کروڑ پونڈ کے حصص کی مالک ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک معاہدہ ہوا جسکی رو سے شاہ ایران نے تمام مملکت ایران میں مٹی کا تیل قدرتی گیس وغیرہ ڈھونڈھنے، نکالنے ...... اور فروخت کرنیکا اجارہ سنہ ۱۹۰۱ء لغایت سنہ ۱۹۶۱ء ڈی آرکی

کر دے دیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں اینگلو پرشین آئل کمپنی بنائی گئی اور اس وقت سے تیل نکلنا شروع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں حکومت برطانیہ نے کمپنی مذکور کے بہت سے حصص خرید لئے جنکی مالیت اس وقت پچیس لاکھ پونڈ تھا انکے علاوہ ایک ہزار پونڈ کے توجیحی حصص اور ایک لاکھ نوے ہزار پونڈ کے پانچ فیصدی والے ڈبنچر (تمسکات) بھی اس کمپنی میں حکومت برطانیہ نے خرید کئے ہیں۔ کمپنی نے حکومت برطانیہ کو کئی برس تک تیل کی بڑی بھاری مقدار مہیا کرنا اپنے ذمہ لیا۔ ابھی تک ایرانی تیل کے کنوئیں ایران کے جنوب مشرقی حصہ میں خلیج فارس سے سو میل دور مسجد سلیمان کے قریب واقع ہیں لیکن ایران میں تیل اسی رقبہ تک محدود نہیں اس کے علاوہ اور بھی کئی علاقوں میں تیل کے زبردست ذخیرے موجود ہیں جو کمپنی کو معلوم ہیں مگر تا حال انکی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

کمپنی نے آبادان اور بصرہ میں تیل صاف کرنے کے کارخانے جاری کر رکھے ہیں، تیل نلوں کے ذریعہ ان کارخانوں میں پہنچتا ہے۔ تیل صاف کرنیکا ایک کارخانہ کمپنی نے لنڈارسی (ویلز) میں بھی قائم کیا ہے۔ ایران سے کچھ تیل وہاں بھی صاف کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ اس کارخانہ کے علاوہ اینگلو پرشین آئل کمپنی نیشنل ریفائنریز کی وساطت سے انگلستان۔ فرانس اور دیگر ممالک کے تیل صاف کرنیوالے کارخانوں کے نظام و اہتمام میں بھی عمل دخل رکھتی ہے۔

اینگلو پرشین آئل کمپنی نے حال ہی میں برطانوی جہاز ساز کمپنیوں کو تیرہ جہاز بنانے کا آرڈر دیا ہے ان کو ملا کر کمپنی کے پاس تراسی جہاز ہیں جن کا مجموعی وزن سات لاکھ ستر ہزار ٹن ہے۔ کمپنی مذکور بلاواسطہ یا بالواسطہ اینگلو پرشین آئل کمپنی آسٹریلیا (سنہ ۱۹۲۰ء) سیلون (سنہ ۱۹۲۱ء) مصر (سنہ ۱۹۲۶ء) انڈیا (سنہ ۱۹۲۰ء) کینیا (سنہ ۱۹۲۱ء) اور جنوبی افریقہ کے تمام جاری شدہ سرمایہ کی مالک ہے۔ مزید براں برٹش پٹرولیم کمپنی اور دس دیگر کمپنیوں کا تمام جاری شدہ سرمایہ بھی کمپنی مذکور کی ملکیت ہے۔ ان کے علاوہ بارہ دیگر کمپنیوں کے سرمایہ میں حصۂ کثیر کی بھی مالک ہے۔

نہر سوئز کی تجارت میں پندرہ فیصدی اینگلو پرشین آئل کمپنی کا حصہ ہے۔ فی الواقعہ ایران کی تجارت برآمد میں سنہ ۱۹۱۲ء سے ایک انقلاب رونما ہونا شروع ہو گیا۔ اس انقلاب کی ذمہ دار تیل کے کاروبار کی وسعت ہے۔ کمپنی کی دیگر سرگرمیاں بھی ناقابل لحاظ نہیں۔ کمپنی مذکور تیس لاکھ پونڈ ہر سال ایران میں خرچ کرتی ہے سال سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء میں کمپنی نے ۱۱،۴۰،۰۰۰ پونڈ کی رقم خطیر صرف محصول کی شکل میں ایرانی خزانے میں داخل کی۔ کمپنی ۳۱۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء تک ایک کروڑ بارہ لاکھ پینسٹھ ہزار پونڈ داخل خزانۂ ایران کر چکی ہے۔ ایران میں کمپنی نے سڑکیں بنائیں، ہسپتال جاری کئے، اسکول کھولے، صنعتی اور فنی تعلیم کا انتظام کیا، ایرانیوں کو اپنے

کارخانوں اور کاروبار میں ملازمتیں دیں اور بالواسطہ اور بلاواسطہ ایران کی فلاح و بہبود میں حتی الوسع امداد کی۔
کمپنی مذکور کے منافع کا نقشہ حسب ذیل ہے:۔

	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۳۰ء	سنہ ۱۹۳۱ء
خالص منافع	۶،۵۰۰،۴۰۰	۹،۶۱۷،۴۹۷	۳۰۴۹،۵۱
محصول (رائلٹی)	۱،۱۹۱،۵۸۹	۱،۵۱۹،۵۹۵	۱۳۴۷۵۰
منافع جو فی حصہ کمپنی نے کمایا	۳۲۰۱ %	۲۶۰۹ %	۳۰۰ %
منافع جو فی حصہ ادا کیا گیا	۲۰ %	۱۵ %	۵ %

کسی کمپنی کے کاروبار کی صحیح حالت کا اندازہ لگانے کے لئے اسکا بیلنس شیٹ (گوشوارہ محاصل و مصارف) دیکھنا چاہیئے کیونکہ یہی اسکے کاروبار کا آئینہ دار ہوتا ہے اسلیئے اینگلو پرشین آئل کمپنی کے بیلنس شیٹ بابت سال ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء سے مندرجہ ذیل اعداد اقتباس کرکے ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

جائداد ۶۰،۰۲۲،۰۰۰ پونڈ اسٹاک ۷،۱۹۰۰۰ پونڈ
صنعتہائے متعلقہ میں مصارف سرمایہ ۱۶،۰۵۳۱۰۰۰ پونڈ پیشگی ۷،۰۵۹۶۰۰۰ پونڈ
ملحقہ کمپنیوں میں لگایا ہوا سرمایہ ۳،۰۲۵۰،۰۰۰ پونڈ۔ کروڈ آئل کا اسٹاک ۲۰،۴۲۱،۰۰۰
مقروضوں کے ذمے ۳،۳۲۴،۰۰۰ پونڈ نقد سرمایہ ۱،۲۹۸،۰۰۰ پونڈ
برٹش گورنمنٹ اسٹاک ۴،۰۲۰،۰۰۰ پونڈ میزان ۴۰،۶۹۰۵،۰۰۰ پونڈ

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ کمپنی کا ساٹھ کروڑ روپیہ جائداد وغیرہ پر لگا ہے، مندرجہ صدر اعداد سے یہ بھی عیاں ہے کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی کوئی ہندوستانی کم سرمایہ کمپنی نہیں بلکہ اسکی دولت اور رسوخ کئی ہندوستانی ریاستوں کے لئے موجب رشک ہو سکتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ برٹش گورنمنٹ اس کمپنی کی حصہ دار ہے اور بطور حصہ دار اسے اس کے کاروبار میں دلچسپی لینا اور اسے ہر ممکن نقصان سے بچانا اپنے مفاد کی حفاظت کرنا ہے لیکن اس غیر معمولی دلچسپی کی تہ میں محض اقتصادی وجوہات کے علاوہ سیاسی اور فوجی ضرورتیں بھی ہیں۔ ہم نے اس سے پہلے کسی مضمون میں ناظرین زمانہ کی واقفیت کے لئے دور جدید کے فوجی نظام اور بحری بیڑوں کی ضرورت کی روشنی میں تیل کی اہمیت پر اعداد و شمار پیش کئے تھے اس لئے اعادہ غیر ضروری ہے۔ انگلستان کے عدیم المثال بحری بیڑے کی کامیابی کے لئے اسے تیل کے ذخیروں پر اختیار ہونا چاہیئے لیکن بدقسمتی سے انگلستان درکنار تمام برٹش امپائر میں دنیا کی تیل کی پیداوار میں سے صرف ۲½ فیصدی سے زیادہ تیل نہیں نکلتا، اور اگرچہ معاہدہ اوٹاوہ کی

غرض وغایت رو بہ تنزل برطانی تجارت کو سبھالنے کے علاوہ برٹش امپائر کو غیر
سے آزاد کرنا بھی ہے، لیکن کیا کیا جائے قدرت نے امپائر کو تیل کا حصہ دینے میں
مقام غور ہے کہ ۰۰۰۰۰۰ ۸۰۶، ۳، ۴۳ گیلن میں سے ہماری امپائر میں صرف ....
ہو سکتے ہیں۔ آخر ۲ فیصدی ہوتا ہی کیا ہے۔ خصوصاً جب ضرورت اس قدر
پیدا وار (تیل) کو ایک سَو فرض کیا جائے تو مختلف ممالک کے حصص حسب ذیل

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۷۲،	روس	۶،
مکسیکو	۲، ۵	وزویلا	۲،
ایران	۲، ۵	رومانیہ	۹،
ڈچ ایسٹ انڈیز	۱، ۶	ہندوستان (برہما)	۲
دیگر ممالک	۵، ۹		

مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ سے اینگلو پرشین آئل کمپنی کی مالی حالت،
اس کے لا محدود ذرائع اور اس کی سیاسی اہمیت آپ پر واضح ہوگئی۔ آپ نے
امپائر کا تیل کچھ خوش قسمت واقع نہیں ہوئی۔ آپ پر یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ کمپنی کی
خزانہ میں بشکل محصول (رائلٹی) داخل کرتی ہے۔ تو کیا یہ وجہ تعجب نہیں کہ ایسی متمو
کمپنی کا اجارہ قبل از وقت منسوخ کر دیا جائے جس نے ملک کی تعلیمی، صنعتی اور مالی
میں مناسب حصہ لیا ہو اور جو اپنے خالص منافع کا ۱۶ فیصدی ہر سال شاہی
بظاہر مقام حیرت ہے مگر مطالعۂ واقعات و نگاہ تعمق ظاہر بیں آنکھوں سے حیرت
جن دنوں (۱۹۰۱ء) یہ شصت سالہ اجارہ دیا گیا تھا، ایران میں ذمہ دار
اس وقت ملک کو شاہ ایران کی شخصی حکومت سمجھنا چاہیئے۔ اہل ایران کی پوزیشن
ان حالات پر حاوی نہیں جو جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد رونما ہوئے۔ اسکا منشا
یا ایرانی بندرگاہ تک تیل کی تجارت سے پابندیاں ہٹانے کا تھا۔ اس میں ہرگز ا
جو کمپنی کی سرگرمیوں کے بعد پیدا ہو گئے۔ کمپنی نے تراسی جہازوں کا ایک تجارتی
کاروبار کو دنیا کے مختلف ممالک میں اتنی وسعت دیدی ہے کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی
ہوگیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں بھی ان مشکلات کو عبور کرنے کی کوشش کی گئی۔
ایران نے شکایت کی کہ اگرچہ کمپنی نے بے حساب منافع حاصل کیا ہے لیکن ایرا

چنانچہ زرِ محصول میں بتدریج کمی ہو رہی ہے (ملاحظہ ہو نقشہ منافع مندرجہ صدر) ۱۹۲۱ء سے کمپنی اور حکومتِ ایران کے مابین خط و کتابت ہو رہی تھی مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ایران نے مجبوراً تنسیخ اجارہ کا سخت قدم اٹھایا۔ یہ نومبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ کمپنی نے ایران کے حقِ تنسیخ مستاجری سے انکار کیا حکومت برطانیہ نے پُرزور پروٹسٹ کیا۔ اور ایک طرح سے جنگ کی دھمکی دی۔ برطانیہ نے معاملہ ہیگ کورٹ آف جسٹس (عدالت انصاف مقام ہیگ) کے سپرد کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایران نے یہ تجویز نامنظور کر دی۔ برطانیہ نے دفعہ ۱۵ کی رو سے اس معاملہ کو لیگ کونسل میں پیش کر دیا سرجان سائمن نے برطانیہ کی وکالت کی۔ ایران کی طرف سے مرزا علی اکبر خاں داور وزیر عدل نے مکمل جواب کا حق محفوظ رکھتے ہوئے بعض الزامات (مثلاً ایران کا برطانی رعایا کے مال و جان کی حفاظت سے انکار وغیرہ) کی تردید کی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ چونکہ ایران نے اجارہ منسوخ کر دیا ہے اس لئے وہ دفعہ ۱۷ کے ماتحت جو مستاجرنامہ کا جزو ہے اور جسے وہ منسوخ کر چکا ہے اس معاملہ کو کسی ثالث کے سپرد کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا کیونکہ اسکا یہ فعل تنسیخ اجارہ کی تنسیخ ہوگا۔ مزید براں تنازعہ حکومت ایران اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے مابین ہے۔ حکومت ایران اور حکومت برطانیہ کے مابین نہیں اور اس لئے تاوقتیکہ کمپنی مذکور ایرانی قانون کے مطابق چارہ جوئی نہ کرے۔ یہ معاملہ لیگ کونسل کے سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ یہ بات کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی میں حکومت برطانیہ بھی حصہ دار ہے اسکے قانونی پوزیشن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو حکومت برطانیہ ہر ایک کمپنی میں شامل ہو کر دیگر ممالک کے قوانین کو پامال کر سکتی ہے۔ وہ ہر ایک معاملہ کو لیگ کونسل میں (جہاں اس کا گہرا رسوخ اور اثر ہے) گھسیٹ کر اپنے حسب منشا فیصلہ کرا سکتی ہے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لیگ کونسل کا فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب کی پوزیشن بہت حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سردست مسٹر بنیش کی وساطت سے سلسلہ گفت و شنید شروع ہو گیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ معاملہ کا فیصلہ ہو جائے تا فیصلہ قطعی مندرجہ ذیل امور طے پائے ہیں:۔

۱۔ فریقین معاملہ لیگ کونسل سے واپس لے لیں گے اور مئی ۱۹۳۳ء سے پہلے اس میں پیش نہ کرینگے۔

۲۔ کمپنی حکومت ایران سے سلسلہ گفت و شنید شروع کر دیگی۔

۳۔ اگر کمپنی نیا اجارہ لینے میں ناکامیاب ہو تو فریقین لیگ کونسل کے سامنے اپنی پہلی پوزیشن اختیار کرنے کے مجاز ہونگے۔

۴۔ حکومت ایران کے ۱۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کے تار کے بموجب کمپنی اپنا کام اسی طرح جاری رکھیگی، جس طرح وہ ۲۷ نومبر ۱۹۳۲ء سے پہلے کرتی رہی ہے۔

یہ تجاویز ۲۴ جنوری ۱۹۳۳ء کو مسٹر بینس کی مصالحانہ کوشش سے طے شدہ امور کی شکل میں لیگ کونسل میں پیش ہوئیں۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی اور حکومت ایران میں فیصلہ ہو جائیگا کیونکہ برطانیہ کا مشرق میں اب وہ زور نہیں ہے جو پہلے تھا۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ایران نے سویٹ روس کے زیر اثر ہو کر تنسیخ اجارہ کا اقدام کیا ہو بہر حال خواہ کچھ بھی ہو ایرانی تیل کا قضیہ بین الملی سیاسیات اور بین الاقوامی حلقوں میں خاص اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اور مشرق قریب کی سیاسیات میں اسے وہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کا جسم

انسان کو حکماء اور علماء نے "عالم صغیر" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ آج ہم اپنے معزز ناظرین کو اس عالم صغیر کی کسی قدر سیر کراتے ہیں جو ازدیاد معلومات کا باعث ہوگا۔

ہاتھ کی ہتھیلی کے ایک مربع انچ میں ۲۰ ۲۵ مسامات ہیں، اور اوسط قد و قامت کے انسان کے جسم میں ۷۰ لاکھ مسامات ہوتے ہیں، اگر ان مسامات کو مسلسل رکھا جائے تو یہ سلسلہ ۲۰ میل کا ہوگا۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر غیر ارادی طور پر جسم انسان سے ۳۲ اونس پسینہ خارج ہوتا ہے۔ انسان کے جسم میں بحالت طبعی ۹۸ درجہ حرارت رہتی ہے جسم انسان کے ایک مربع انچ پر چودہ پونڈ ہوا کا دباؤ پڑتا ہے۔ اس طرح گویا تمام جسم پر ۱۲ ٹن (ایک ٹن = تقریباً ۲۸ من) کا وزن رہتا ہے۔ شہروں میں زندگی کا اوسط ۳۰ برس اور دیہات میں ۵۵ سال ہے۔ ۱۲۰ بچے فی ہزار پیدا ہو کر پہلے ہی سال میں فوت ہو جاتے ہیں۔ دوسرے سال کے دوران میں ۵۰ بچے فی ہزار۔ اور آئندہ تین سال کے عرصہ میں ۱۹ بچے فی ہزار، اور آئندہ دو سال کے دوران میں ۱۹ بچے فی ہزار مر جاتے ہیں۔ اس طرح پیدائش سے لیکر سات برس کے اندر ۲۰۰ بچے فی ہزار مر جاتے ہیں۔

میاں ہُدہُد

ازسید مظہر حسین اختر میرٹھی

غدر شہ سے پہلے سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا زمانہ دہلی کی شاعری کا آخری وقت تھا۔ حسن اتفاق سے اردو کے وہ کامل الفن اساتذہ جن پر آخری زمانہ تک اردو شاعری ناز کرے گی اور جن کا کلام گذشتہ اور موجودہ دور ہی میں نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بھی اپنے وقار کو برابر قائم رکھے گا۔ اس عہد میں یک جا جمع ہو گئے تھے۔ حکیم مومن خاں مومن۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ شیخ ابراہیم ذوق میں سے ہر ایک اپنے کمالات کا استاد اور سفینۂ شاعری کا ناخدا تھا۔

خاص لال قلعہ میں یا قلعہ والوں کی تحریک پر مشاعرہ ہوتے رہتے تھے۔ اور بادشاہ کے کلام کے ساتھ ساتھ ان درد آشنا طبیعتوں کو جن کے دل اس سے آشنا ہیں اُستادان فن کے کلام سننے کا بھی برابر موقع ملتا رہتا تھا۔ شاعر صرف فطرت کی نیرنگیوں کا مدح خواں نہیں بلکہ وہ اپنی سحرکاریوں سے اُن نیرنگیوں میں نئی روح پھونک کر ایک ایک رنگ میں سو سو رنگ کی بہار دکھاتا ہے۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ہر شخص کو اُس کی طبع آزمائی کے اظہار کا موقع دیا جاتا تھا۔ اور مختلف دماغوں میں جو جدا جدا خیالات پیدا ہوتے تھے اُن سب کا مجموعہ گلستانِ بہار کا وہ بیش قیمت ہار تھا۔ جس میں یاسمن چمپا جوہی کی کلیاں اور گلاب کے پھول ترتیب و قرینے سے گوندھے گئے ہوں اور اُن کی نزاکت خوشبو وضعداری اپنے اپنے درجہ اور مرتبہ پر نمایاں دکھائی دے رہی ہو۔

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے چند سال ہوئے رسالہ اردو (حیدرآباد دکن) میں "دہلی کا آخری مشاعرہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر صرف اردو شاعری سے اپنی دلچسپی کا اظہار ہی نہیں کیا تھا بلکہ دنیائے ادب کو اُن مختلف الخیال اور مختلف المذاق ہستیوں سے روشناس کرانے کی خدمت انجام دی تھی جن سب کا مقصد تو ایک ہی سہی لیکن ہر ایک اپنے رنگ میں ایکدوسرے سے جدا دکھائی دیتا ہے یوں کہیے کہ ایک وسیع دسترخوان پر کھانے چنے ہوئے ہیں اور ہر ایک چیز اپنے

رنگ، مزے اور تاثیر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

اس سلسلہ میں حکیم آغاجان عیش کیساتھ میاں ہُدہُد کا ذکر مرزا صاحب نے چھوڑ دیا ہے
جس کی خاص وجہ تو یہ ہے کہ شاعر اُن کو مانتا ہی کون ہے اور وہ بیچارے تھے کس شمار میں۔
لیکن اس موقعہ پر اُن کا ذکر نہ آنے کا سبب یہ بھی ہے کہ مرزا صاحب نے مشاعرہ کا جو نقشہ کھینچا ہے
اُس میں دکھایا ہے کہ حکیم آغاجان عیش نے میاں ہُدہُد کو اس خیال سے چھپا دیا تھا کہ میر صاحب نے
جو بحر طویل کے زبردست شاعر تھے میاں ہُدہُد کی تعلی وخودستائی سے تنگ آکر ان کی ایک ہجو لکھی تھی
اور مشاعرے میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہُدہُد کی شان میں ایک قصیدہ سنائیں گے۔ حکیم صاحب کو خوف تھا کہ کہیں
اس سلسلہ میں میں بھی نہ پیٹا جاؤں اور ندامت وشرمندگی اٹھانی پڑے۔

ہُدہُد نہ کوئی بڑے شاعر تھے اور نہ اُن کے کلام میں کوئی خاص بات تھی سوا لغویات کے۔ لیکن چونکہ
حکیم آغاجان عیش کے توسل سے اُن کی رسائی شاہی دربار تک ہو گئی تھی اور سرکار شاہی سے کچھ
امداد بھی ملتی تھی۔ اس لئے میاں ہُدہُد کا یہ خیال کر لینا کہ وہ شاعر ہیں اور اُن کی شاعری نے دہلی کے گلی
کوچوں سے نکل کر لال قلعہ میں بھی اپنا اثر جما لیا ہے بیجا نہ تھا۔

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے آب حیات میں آپ کا حلیہ یہ لکھا ہے کہ :۔

کھچڑی ڈاڑھی لمبی اور نکیلی۔ سر منڈا ہوا جسپر چھوٹا سا عمامہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھٹ بڑھئی ہیں۔
ان کا اصلی نام عبدالرحمٰن تھا۔ پورب کے رہنے والے تھے حکیم آغاجان عیش بادشاہی طبیب
کے مکان کے پاس ایک مکتب تھا اُسمیں لڑکے پڑھایا کرتے تھے معمولی استعداد تھی لیکن گلستان،
بوستان، اور سکندر نامہ کے مطالب ایسی خوش اسلوبی سے بیان کرتے تھے کہ اصل مضمون کوسوں دور
ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب نے ایکمرتبہ اُن کے شاگردوں سے سکندر نامہ کا سبق سنا تو حیران رہ گئے
لڑکوں نے جو مطلب بیان کیا اُس سے حکیم صاحب کو صرف حیرت ہی نہیں ہوئی بلکہ ان حضرت کی ملاقات
کا بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ حکیم صاحب بڑے خوش اخلاق اور ظریف طبع تھے۔ اُن کا کلام قلعہ معلّٰی میں
شوخی اور حسن محاورے کے لحاظ سے بہت بلند خیال کیا جاتا تھا۔ بات بات میں ظرافت فقرہ لیتی تھی۔
انہوں نے ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ مولوی صاحب بالکل کورے ہیں لیکن ان کو محفل کا بھانڈ بنانا
اور دربار کا مسخرہ شاعر مقرر کر کے تماشہ دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ اُن کو شعر کی تعریف سمجھائی
اور ہُدہُد تخلص رکھ کر مشاعرے میں ہمراہ لے گئے۔ اور مناسب الفاظ میں اپنی زبان سے تعریف کر کے
غزل پڑھوائی۔ ہُدہُد کے گھونسلے میں کوڑے کرکٹ کے سوا کیا تھا۔ لیکن لوگوں نے صف سے باہر نکل

غل کرو واہ واہ اور سبحان اللہ کا شور بلند کر دیا تو یہ بے وقوف سمجھے کہ مجھ سے زیادہ کسی کی تعریف نہیں ہوئی اور اب میرے ملک الشعرا ہونے میں تھوڑی ہی کسر باقی رہ گئی ہے

کچھ دنوں کی مشق سخن کے بعد مولوی صاحب مدرسہ کے کام کے تو نہ رہے لیکن امرا کے جلسوں اور مشاعروں میں ان کے بغیر رونق ہی نہ ہوتی تھی غرضکہ ہر جگہ ہُدہُد، ہُدہُد کا گیت گایا جاتا تھا۔ حکیم صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ نہایت شستہ الفاظ میں ان کی غزلیں اصلاح کر کے مجمع عام میں پڑھوائیں۔ جنکا مطلب تو خاک بھی نہیں تھا لیکن غالب اور مومن کی ہمسری کا دعویٰ کیا جاتا تھا۔ ایک غزل غالب کے انداز میں تیار کی گئی جسکا مطلع تھا:۔

مرکزِ محورِ گردہ ل بہ لبِ آسیا نہیں ناخنِ قوس و قزح شبیۂ مضراب نہیں

غالب مرحوم تو اس مطلع کو سنتے تھے اور ہنستے تھے لیکن مومن خاں کا برا حال تھا۔ کہتے تھے کہ یہ جانور غالب کے رنگ میں کیا شعر کہہ سکتا وہ خود یا اس کے استاد حکیم صاحب مرزا نوشہ کے اشعار کو سمجھ تو لیں۔

غرض میاں ہُدہُد اپنی وحشیانہ حرکتوں اور استاد کی ظریفانہ ترکیبوں سے شاعروں میں بدنام ہو گئے بھلا اُستاد کی تضحیک کون گوارا کرتا ہے چاروں طرف سے بازؔ اور زاغ وغیرہ پرندوں نے اُن کو گھیر لیا مگر چند دنوں میں یہ شکاری تھک کر بیٹھ گئے لیکن ہُدہُد کی منقار بند نہیں ہوئی۔

جب متقی کا سلسلہ شاعری کے دیوتا کی نذر ہو چکا تو حکیم صاحب کو فکر ہوئی کہ ان کے دانہ پانی کا بھی بند و بست ہونا چاہیے۔ ان میں قابلیت ہی کیا تھی لیکن حکیم صاحب بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے سوچا کہ اُن کے آشیانے کو ایسے مضبوط درخت پر لگا دیں جو ہوا اور آندھی میں بھی نہ اُکھڑ سکے۔ بہادر شاہ کی شان میں ان سے ایک قصیدہ لکھوایا اور اُن کو اپنے ساتھ دربار میں لے گئے ظفرؔ غربا پروری کے ساتھ ہی سخن پرور بھی تھے۔ اور شاعری سے انہیں خاص انس بھی تھا۔ میاں ہُدہُد دربار میں آئے اور قصیدہ گذرانا تو فرمایا کہ بھئی ہم ایسے تو خالی خولی اڑائیں گے نہیں۔ طائر الاراکین شہپر الملک، ہُدہُد الشعراء۔ منقار جنگ بہادر خطاب عطا فرمایا اور کچھ ماہانہ بھی مقرر کر دیا۔ قصیدہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کردوں تو رشکِ باغِ ارم اپنا گھونسلا کر دوں

میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لئے فلک کہے ہے مقرر ہیں باجرا کر دوں

ہُدہُد کی شاعری جس کو حکیم صاحب کی استادانہ عنایات و مراعات کہیئے یا اُن کی دماغ سوزی

کا نتیجہ بے معنی اور تعلی آمیز ہے۔ لیکن مسخرہ پن زمانے کو پسند ہے پھر رئیسوں اور بادشاہوں کی صحبت میں جہاں الفاظ کے تیر برستے ہیں۔ فقروں کی تلواریں چلتی ہیں اور جہاں مضامین نوک سنان بن بن کر دلوں کو چھیدتے ہیں اور صاحب محفل کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

ان کے چند اشعار یہ ہیں :۔

آشیاں سے جو غزل پڑھنے کو ہُدہُد آیا   غل ہوا پیش رو ملک سلیماں آیا

ہُدہُد کا مذاق ہے نرالا سب سے   انداز ہے اک نیا نکالا سب سے

سر دفتر لشکر سلیماں ہے یہ   اڑتا بھی ہے دیکھو بالا بالا سب سے

جسے کہتے ہیں ہُدہُد وہ تو زر شیر دل کا وا ہے   مقابل تیرے کیا ہو تو تو اک جرّہ کی مادہ ہے

ادب اے بے ادب اب تک نہیں تجھ کو خبر اسکی   کہ ہُدہُد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

برسات میں ان کا مکان گر گیا۔ حکیم صاحب کے مشورہ سے بادشاہ کے حضور میں گھونسلے کے لئے درخواست گذرانی گئی۔ مطلع ہے :۔

جز ترے شاہنشہا کس کس کے آگے روئیے   کس سے کہئے جاکے یہ غم کس کو سارے کہوئیے

چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کیوں کھوئی عمر   کاشکے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوریئے

رشتۂ عمر شہنشاہ جہاں ہو وے دراز   یا خدا کھلتے رہیں دنیا میں جب تک ہوئیے

دیوے اس کو بھی زمیں تھوڑی سی بن گھونسلے   مارتا پھرتا ہے ہُدہُد تیرا ٹامک ٹوئیے

فن شعر میں پھنسکر کسی کام کا نہ رہنا اور بیچارگی و درماندگی سے مجبور ہو کر بارگاہ خسروی میں فریاد کرنا اظہار مطلب کیلئے کافی لمبی چوڑی داستان تھی اس پر حکیم صاحب کا نمک مرچ گھوڑا ہمیشہ کھونٹے کے بل کودتا ہے ورنہ ایسے ایسے ہزاروں ہُدہُد و ہُما مارے مارے پھرتے تھے اور کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ ہُدہُد کے مکان کا فی الفور بندوبست کر دیا گیا۔

دہلی کی بربادی کے ساتھ ساتھ میاں ہُدہُد اور اُن کی شاعری برباد ہو گئی حکیم صاحب بھی غدر کے تھوڑے دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔ یہ چند واقعات باقی رہ گئے ہیں جو اس قابل نہیں کہ اُنکو بار بار دوہرایا جائے اور ماضی کے ان افسانوں پر تبصرہ کیا جائے۔ لیکن یہ پُرانی باتیں ہیں اور سلف کی یادگاریں ان کا مزہ اُن کے دل سے پوچھئے جو یہ مزے اٹھا کر قیامت کی نیند سو رہے ہیں اور کروٹ نہیں لیتے

تکیہ کلام

(از مسٹر سلیم جعفر)

چتلی قبر کے سامنے ایک بالاخانہ میں چند لوگ روز شام کو جمع ہوتے ہیں۔ یہ کلب اجتماع ضدین کا نمونہ ہے۔ یہاں عہد قدیم کے آخری دور کی شمعیں جھلملاتی اور انھیں کے پہلو بہ پہلو نئی روشنی کی حیرت انگیز شعاعیں بھی نظر آتی ہیں۔ مرزا شہباز ایک پرانی وضع کے مغل کوچہ عاشق میں رہتے ہیں۔ اس کلب میں روز ہی آتے ہیں اور دنیا کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھ دیکھ کر کچھ افسوس اور کچھ حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ اپنے کلام کو "کیا نام کہ" سے مزین فرمایا کرتے ہیں۔

ایک روز کہیں سرکس دیکھنے چلے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کو دیر تک سوتے رہے۔ شام کو حلقۂ احباب میں دیر سے پہنچے۔ دوستوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "آیئے، قدم رنجہ فرمایئے، تشریف رکھئے" کے شور سے بالاخانہ گونج اٹھا۔ مرزا ابھی اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک صاحب بول اٹھے "کہیئے مرزا صاحب آج کہاں رہے"۔

مرزا: "کیا نام کہ رات دیر تک جاگنے کا اتفاق ہوا، اس لئے کیا نام کہ آج دوپہر کو جو سویا تو آنکھ وقت پر نہ کھلی"۔

دوست: "رات کہیں اکیلے اکیلے جلسہ کا مزا لوٹتے رہے ہونگے"۔

مرزا: "کیا نام کہ میں ایسی جگہ نہیں جایا کرتا"۔

دوست: "تو پھر رات بھر کیوں جاگتے رہے"

مرزا: "کیا نام کہ آپ اسی شہر میں رہتے ہیں یا کہیں اور"۔

دوست: "رہتا تو دہلی ہی میں ہوں، مگر آپکو کونسی دلچسپی کہاں گھسیٹ لے گئی"۔

مرزا: "کیا نام دعوے تو یہ ہیں لیکن کیا نام کہ آپ کو یہ بھی خبر نہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے"۔

دوست: "کچھ فرمایئے تو سہی"۔

مرزا: "کیا نام کہ کل شام کو جب میں یہاں آرہا تھا تو کیا نام کہ کیا نام کہ کیا دیکھتا ہوں کا اکثر جگہ مکانوں اور دکانوں پر بڑے بڑے سفید کاغذ چپکے ہوئے ہیں جن پر کیا نام کہ ہاتھی گھوڑوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ کیا نام کہ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ کوئی ہاتھی گھوڑوں کا سوداگر تجارت کرنے آیا ہے اور یہ اس کا اشتہار ہے اس لئے کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن کیا نام کہ جامع مسجد کے سامنے آیا ہی تھا کہ سامنے سے ایک بگھی آتی دکھائی دی۔ کیا نام کہ اسکی چھت پر کیا نام کہ ایک لڑکا بیٹھا کیا نام کہ ایک تختہ تھامے ہوئے تھا، جس پر کیا نام کہ موٹے موٹے حرفوں میں ہاتھی گھوڑوں کی تصویروں کے اوپر لکھا تھا۔ "آج رات کو کشمیری دروازہ باہر" اور کیا نام کہ بگھی کے اندر دو آدمی تھے کیا نام کہ ایک زور زور سے ڈھول بجا رہا اور دوسرا کچھ کاغذ کے پرچے بانٹ رہا تھا اور کیا نام کہ بچے بوڑھے سب اس پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ کیا نام کہ بگھی کا گھوڑا چلنے بھی نہ پاتا تھا۔ یہ دیکھکر کیا نام کہ مجھے بھی حیرت ہوئی کہ کیا نام کہ الٰہی ماجرا کیا ہے۔ کیا نام کہ میں نے بھی ہاتھ بڑھا کر ایک پرچہ لے لیا کہ فرصت میں گھر جا کر پڑھیں گے۔"

دوست: "خوب! مرزا صاحب خوب! آپ بڑے صبر کے آدمی ہیں۔"

مرزا (بگڑ کر) "کیا نام مجھے آپ نے کوئی گنوار سمجھا ہے کہ کیا نام کہ وہیں کھڑا ہو کر کیا نام پڑھنے لگتا؟"

دوست: "مرزا صاحب، معاف کیجئے، مجھے خیال نہیں رہا کہ آپ ماشاءاللہ یادگار دورِ قدیم ہیں۔"

مرزا صاحب ذرا ٹھنڈے ہوے اور پہلو بدلکر بولے:۔

"اسکا دعویٰ تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن کیا نام کہ بندہ "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کا مصداق ضرور ہے۔"

دوست: "اچھا مرزا صاحب، جب یہاں سے گھر واپس گئے تو پھر؟"

مرزا: "کیا نام کہ جاتے ہی انگرکھا اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا، صحن میں چارپائی بچھی تھی، لیٹ گیا۔ کیا نام کہ ذرا پسینہ خشک ہونے لگا تھا کہ آپ کی بھتیجی نے پوچھا "ابا، کھانا لاؤں" کیا نام کہ میں نے کہہ دیا "لے آؤ"۔ کھانا کھا کر کیا نام کہ میں نے حقے کے دو ہی کش لیے تھے کہ مرزا گلیانہ کے صاحبزادہ نے کیا نام کہ تصدق حسین خاں صاحب کے لڑکے کو آواز دیکر پوچھا "میاں چلتے ہو؟" خاں صاحب کے لڑکے نے جواب دیا "میاں کہاں؟" مرزا صاحب کے صاحبزادہ بولے "میاں بھول گئے، دیتے میں اشتہار لیا تھا۔ نا؟" کیا نام کہ اس وقت مجھے یاد آیا کہ ایک اشتہار میری جیب میں بھی ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے جلدی جلدی حقے کے دو اور کش لیکر کیا نام کہ آپ کی بھتیجی سے کہا "میری جیب

میں کاغذ کا ایک پرچہ ہے نکال لاؤ۔ کیا نام کہ وہ پرچہ دے گئی، مَیں نے جو اُسے غور سے پڑھا تو کیا نام کہ جی چاہا کہ میں بھی یہ تماشا دیکھوں، چنانچہ کیا نام کہ ٹھٹے کے دو اور کش لیکر کپڑے پہنے اور روانہ ہوگیا۔

دوست: تو یہ کہئے کہ کل آپ سرکس دیکھنے چلے گئے۔

مرزا: جی ہاں، کیا نام کہ کشمیری دروازہ باہر پہنچا۔ کیا نام کہ وہاں جا کر دیکھا تو باجا بج رہا ہے اور کومیوں کے ٹھٹھ لگ رہے ہیں، کیا نام کہ لوگ ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوئے بالکل ویسے ہی ٹکٹ خرید رہے ہیں جیسے کہ کیا نام کہ ریل کے اسٹیشن پر۔ کیا نام کہ میں نے بھی جیب سے ایک روپیہ نکالکر ٹکٹ خریدا، تھوڑی سی دیر میں کیا نام کہ باجا بند ہوگیا اور لوگ ایک طرف دوڑے۔ کیا نام کہ غضب کی ریلا پیلی تھی۔ میں بھی دھکے دیتا دلاتا منڈوے میں داخل ہوگیا۔ اور ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ جب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو کیا نام کہ ایک گھنٹی بجی اور لوگ چپ ہوگئے۔ کیا نام کہ تھوڑی سی دیر میں منڈوے کے ایک کونے سے چند گھوڑے اور کیا نام کہ ایک بندر ہیٹ لگائے اور اُوور کوٹ پہنے کیا نام کہ پورا جنٹلمین بنا داخل ہوا۔ اور گھوڑے آگے پیچھے ایک حلقہ بنا کر کھڑے ہوگئے۔ کیا نام کہ پھر ایک شخص نے سیٹی بجائی اور بندر اُچک کر ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اس کا سوار ہونا تھا کہ سب گھوڑے دوڑنے لگے کیا نام کہ بندر اس پر اس طرح ران جمائے کیا نام بیٹھا تھا کیا نام کہ جیسے کوئی بڑا چابک سوار ہو۔ کیا نام یہ عجیب بات دیکھی کیا نام کہ جب کوئی گھوڑا کیا نام اِدھر اُدھر ہونے لگتا تو یہ شہسوار کیا نام اس کے چابک مار کر کیا نام اُسے قطار میں لے آتا۔ اسی طرح کے اور بہت سے تماشے دکھائے گئے، لیکن کیا نام سب سے آخر میں ایک عجیب و غریب بات دیکھنے میں آئی، کیا نام یہ تو سنتے آئے ہیں کہ میاں توپ چلاتا ہے مگر کیا نام آج تک طوطے کو توپ چلاتے نہ دیکھا نہ سنا۔ کیا نام کہ بیچ منڈوے میں ایک چھوٹی سی توپ۔ ایک کاغذ کی گولی اور ایک گز لا کر رکھا گیا۔ کیا نام کہ پھر منڈوے کے ایک کونے سے ایک طوطا اُڑ کر آیا اور توپ کے پاس بیٹھ گیا پہلے تو کیا نام اس نے کاغذ کی گولی کیا نام کہ چونچ سے پکڑ کر کیا نام کہ توپ کے مُنہ میں رکھی۔ پھر چونچ سے پکڑ کر کیا نام گز اُٹھایا اور کیا نام اس ڈاٹ کو ٹھونکنے لگا۔ کیا نام یہ کام کر کے پھر سے اُڑ کر کیا نام کہ توپ کے پیچھے جا بیٹھا۔ کیا نام کہ پھر اس نے پاس ہی جو فتیلہ رکھا تھا اُٹھایا اور کیا نام کہ فتیلہ کو کیا نام رنجک پر رکھ کر کیا نام ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ کیا نام کہ دو ہی سکنڈ میں توپ کی آواز سے کیا نام

سا... ما... منڈوا گونج اٹھا۔ کیا نام کہ کئی آدمی اچھل پڑے مگر طوطا کیا نام وہیں کا وہیں کیا نام جا رہا۔ کیا نام کہ ایک واہ واہ کا نعرہ بلند ہوا اور تماشا ختم ہو گیا۔ کیا نام کہ سب طالبیں اپنے اپنے گھر چلے آئے۔"

اس کے بعد کچھ دیر ہنسی مذاق ہوتا رہا پھر محفل برخاست ہو گئی۔ سب اپنے اپنے گھر روانہ ہوئے مرزا صاحب کے دوست اختر اور انجم کا مکان ایک ہی محلہ میں ہے، دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے ہیں اور باتیں ہو رہی ہیں۔

اختر: "آج تو مرزا نے غضب کیا۔ کیا نام۔ کیا نام کی جھڑی لگا دی، بات کا سمجھنا دشوار تھا۔"

انجم: لیکن وہ بچارے فطرت اور عادت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

اختر: عادت تو خیر، لیکن فطرت کو اس میں کیا دخل ہے۔"

انجم: اس امر میں فطرت کے بعد عادت کو دخل ہے۔"

اختر: کیونکر؟

انجم: بعض لوگ فطرۃً اس قابل نہیں ہوتے کہ خیال کو مسلسل ظاہر کر سکیں، ان کی قوت بیانیہ ناقص ہوتی ہے۔ خیال کا ایک حصہ ظاہر کرنے کے بعد ہی جواب دے دیتی ہے۔ گھبرا کر رک جاتے ہیں اس وقت بحالتِ غیر شعوری کچھ بے معنی لفظ منہ سے نکل جاتے ہیں اور جب وہی لفظ بار بار اکثر موقعوں پر نکلنے لگتے ہیں تو عادت پڑ جاتی ہے کہ ادھر سلسلۂ کلام ٹوٹا اور ادھر وہ لفظ خود بخود منہ سے نکلے۔"

اختر: لیکن مرزا صاحب تو اکثر ایک ایک دو لفظوں کے بعد ہی 'کیا نام' کا ترکش خالی کرنے لگتے ہیں۔"

انجم: ہاں جس قدر دماغ کسی جذبہ کے غلبہ سے زیادہ پریشان ہوتا ہے۔ قوت بیانیہ کا نقص اسی قدر زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھا ہو گا کہ جب ہکلے کو غصہ آتا ہے تو زیادہ ہکلانے لگتا ہے۔"

اختر: تو یہ کہیے کہ تکیہ کلام خلقی نقائص کا آئینہ ہے۔"

سلسلۂ کلام یہیں تک پہنچا تھا کہ بیرم خاں کا تراہا آ گیا جہاں سے دونوں کے گھروں کو الگ راستہ جاتا تھا۔ اختر سلام علیکم اور انجم وعلیکم السلام کہہ کر اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

مشاہیر عالم

ہر ایڈلف ہٹلر

عہدنامۂ وارسائی کے ماتحت جرمنی کچھ ایسا مجبور و معذور ہوکر رہ گیا کہ نہ اس کے پاس کوئی جنگی بیڑہ رہا نہ طیارہ اور نہ فوج۔ اس کے تمام اسلحہ ضبط اور تمام قوائے حربیہ سلب کر لئے گئے۔ اور اربوں پونڈ کا تاوان جنگ عائد ہوا۔ اس سختی کے بعد رد عمل لازمی تھا۔ دنیا کی عالمگیر اقتصادی پستی کا بھی سب سے زیادہ اثر غریب جرمنی ہی پر پڑا جسے کروڑوں پونڈ کی قسطیں بطور تاوان جنگ ادا کرنی پڑیں۔ شکست کی وجہ سے اس کا سیاسی شیرازہ بھی بکھر گیا تھا چنانچہ تمام ملک میں بیسیوں سیاسی پارٹیاں پیدا ہو گئیں، اور چونکہ ان جماعتوں کے خیالات میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی۔ اس لئے تمام ملک طوائف الملوکی میں گرفتار ہو گیا۔ ہر طرف نفسی نفسی کی پکار سنی جاتی تھی۔ اتحادی طاقتیں ایک طرف اور یہودی مہاجن دوسری طرف ملک کا خون چوس رہے تھے۔ وحدت قومی کی جگہ افتراق و انتشار اور نشو و نما کی جگہ اضمحلال و انحطاط پیدا ہو گئے۔ جذبۂ وطنیت کو صدمہ پہونچا اور ہر شخص اپنی ناک چوٹی میں گرفتار نظر آنے لگا۔ سب سے زیادہ ظلم جرمنی پر کارل مارکس کی تعلیم بالشویت نے کیا ہر طرف اجتماعیت (Communism) کا دور دورہ ہونے لگا۔ قریب تھا کہ بہادر اور غیور جرمن قوم فنا ہو جائے لیکن قدرت نے

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مقولے پر عمل کرکے ایک اولوالعزم رہنما کو میدان میں لاکر کھڑا کر دیا جس کا نام ہر ایڈلف ہٹلر ہے اور جو اس وقت جرمنی میں سیاہ و سفید کا مالک یا "ڈکٹیٹر" ہے اور جس پر اس وقت تمام مغربی دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔

آج سے بارہ سال قبل کوئی شخص ہٹلر کے نام سے واقف بھی نہ تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے یہ وائنا کی گلیوں میں کس مپرسی کی حالت میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ مگر آج وہی مفلس و گمنام ہٹلر جرمنی میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے بڑی سیاسی جماعت کا مسلمہ سردار ہے۔ اس آسٹرین نژاد شخص نے جرمنی کے جسم مردہ میں قومیت و غیرت کی روح از سر نو پھونک دی ہے۔

ابتدائی حالات جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اڈولف ؔ قومیت کے لحاظ سے جرمن نہیں ہے البتہ وہ جرمن سرحد کے قریب ملک بوہیمیا میں بمقام لنتز پیدا ہوا تھا اور یہ مقام جنگ سے پیشتر سلطنت آسٹریا میں داخل تھا، ہٹلر کا باپ جو بلحاظ نسل یورین تھا آسٹریا کے محکمہ جمرک (کسٹم) میں ملازم تھا۔ اس کا خاندان ضرور جرمن نژاد تھا لیکن یہ لوگ عرصہ سے غیر ملک میں آباد تھے۔ لنتز میں جرمنوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے لڑکپن ہی میں ہٹلر کو تیر ملامت کا نشانہ بننا پڑا کیونکہ جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا وہاں کے لڑکے اُس کو سخت پریشان کیا کرتے تھے۔

ابھی ہٹلر کی عمر تیرہ سال ہی کی تھی کہ اس کے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کے تین سال بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس طرح یتیم و یسیر ہٹلر خدا کی وسیع خدائی میں بے یار و مددگار رہ گیا۔ جو کچھ اندوختہ تھا وہ والدین کی بیماری اور اُن کی تجہیز و تکفین میں صرف ہو گیا تھا اب اُس کے پاس تین پونڈ سے بھی کم رہ گئے اس وقت دنیا اس کی نظروں میں تیرہ و تار تھی لیکن ہٹلر ایک طاقتور دل اور ہمت عالی کا مالک تھا اُس نے یہ سب اُفتادیں صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیں وہ لنتز سے ترک وطن کر کے وائنا پہونچا۔ چونکہ اُس کی طبیعت شروع ہی سے فنون لطیفہ کی طرف مائل تھی اس لئے اُس نے ارادہ کیا کہ وائنا اکیڈیمی میں داخل ہو کر فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرے اور ایک اعلیٰ درجہ کا آرٹسٹ ہو جائے مگر ہٹلر کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اُس نے اکیڈیمی میں داخلہ کی درخواست دی۔ چونکہ اُس کو فنِ مصوری میں کوئی سابقہ مہارت یا تربیت حاصل نہ تھی اس لئے اُس کی درخواست نا منظور ہو گئی۔

یہ وہ وقت تھا کہ مفلس و نادار ہٹلر پر تین تین وقت کے فاقے گذرتے تھے اور افلاس و ناداری سے اُسکی زندگی دوبھر ہو گئی تھی، وہ چاہتا تھا کہ اسے کہیں روٹیوں کا سہارا مل جائے۔ آخر کار ایک معمار کو اس پر رحم آ گیا اور اُس نے ہٹلر کو مزدور کی حیثیت سے اپنے کام میں لگا لیا۔ اُس نے ہٹلر کو رہنے کے لئے بھی ایک جھونپڑے میں جگہ دیدی۔ مگر چند در چند وجوہ سے یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا۔ ہٹلر کو کئی جگہ ملازمت ملی مگر دیر تک کہیں کام کرنے کا موقعہ نہ ملا بالآخر دوسروں کی غلامی سے تنگ آ کر وہ تجارت کی طرف مائل ہوا، اور شہر کے گلی کوچوں میں پھیری لگا کر تصویریں فروخت کرنے لگا مگر اس سے بھی گذر اوقات کا کوئی معقول ذریعہ نہ نکلا اور وہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد جرمنی کی طرف روانہ ہو گیا اور ۱۹۱۲ء میں شہر میونخ پہونچا جہاں اُس نے

لے موقع گی۔

فن تعمیرات سیکھنا شروع کردیا۔

اس وقت ہٹلر کی عمر بیس برس کی تھی۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ چھڑ گئی اور آسٹریا نے اعلان جنگ کردیا اور جرمنی نے اس کا ساتھ دیا۔ اس وقت ہٹلر نے اپنا نام فوراً بیویریا کی سولہویں پیدل رجمنٹ میں لکھوالیا۔ اور جرمن فوج میں داخل ہوگیا اس طرح اب اس کی قومیت جرمن ہوگئی۔ بہرحال جنگ عظیم میں ہٹلر نے خوب دادِ مردانگی دی، کئی جگہ لڑا اور ۱۹۱۶ء میں زخمی ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں جب انگریزوں نے مقام ایپرس پر حملہ کیا تو وہ زہریلی گیس سے بیہوش ہوگیا۔ ان اعلیٰ خدمات کے صلے میں اسکو "صلیب آہنی" کا تمغہ و نشان بھی عطا کیا گیا۔

سیاسی زندگی | جنگ کے بعد فوج سے قطع تعلق کرکے ہٹلر میونخ کو واپس آگیا۔ یہاں آکر اُسے معلوم ہوا کہ جرمنی میں ایک عظیم سیاسی انقلاب برپا ہونے والا ہے اُس نے دیکھا کہ ہر طرف اور ہر جگہ لوگ اربابِ حل و عقد سے سرکشی پر مائل ہیں اور حکام وقت کی کوئی نہیں سنتا۔

ہٹلر ابھی فوج ہی میں تھا، وہ وقتاً فوقتاً اپنے احباب سے حالات حاضرہ پر خاص انہماک سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس کے نام ایک تحریری دعوت نامہ آیا، جس میں اُسے ایک جدید قائم ہونیوالی سیاسی پارٹی میں شامل ہونیکی دعوت دی گئی تھی۔ ان دنوں جرمنی میں سیاسی پارٹیاں برسات میں حشرات الارض کی طرح نمودار ہورہی تھیں۔ بہرحال ہٹلر نے دعوت قبول کرلی، اور ایک جدید پارٹی "جرمن ورکمینس پارٹی" (German Workmen's Party) کے نام سے قائم کی گئی کہتے ہیں کہ اس پارٹی کا جلسہ گاہ ایک تنگ گلی کے اندر ایک غیر مشہور بوزہ خانہ (Beer House) میں اس طرح منعقد ہوا کہ چھوٹے سے تنگ کمرہ میں ایک گیس برنر ٹمٹما رہا تھا اور اُس کی روشنی میں چار نوجوان بیٹھے تھے کہ اتنے میں ہٹلر بھی کمرہ میں داخل ہوا اور چاروں آدمی اُس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ہٹلر بھی انہیں میں شامل ہوگیا، آپس میں بات چیت ہوئی اور شروع میں یہ نوزائیدہ پارٹی صرف سات افراد سے قائم ہوئی۔ آغاز میں اسکے خزانہ میں سات شلنگ کی رقم تھی، ارکان پارٹی نے سات رنگ کے فیتے اپنا نشانِ امتیاز قرار دیا تھا، جب ہٹلر کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو چند منٹ غور و خوض کرنے کے بعد اُس نے سر اُٹھایا اور کہا "اچھا تو میں بھی اسمیں شریک ہوتا ہوں" اس کے بعد سے وہی اس تمام پارٹی کا سردار قرار پایا۔ چنانچہ ہٹلر نے اس پارٹی کا نام تبدیل کرکے "نیشنل سوشلسٹ ڈیموکریٹک ورکمینس پارٹی" (National Socialist Democratic Workmen's Party.) اسکا نام رکھا۔ مگر اب یہ جماعت نیشنل سوشلسٹ پارٹی یا نازی جماعت (Nazis) کے نام سے مشہور ہے،

پارٹی کے نام میں ایک ٹکڑا یعنی "نیشنل" ایک طلسمی ٹکڑا ہے، اسی کی بدولت نازی جماعت نے ملک میں اس قدر اقتدار و ہردلعزیزی حاصل کر لی ہے۔ کیونکہ "سوشلسٹ" کے اندر بین الاقوامیت کا خیال شامل ہے لیکن لفظ "نیشنل" نے اس کو جرمن قوم کے لئے محدود کر دیا ہے۔ اب اس پارٹی کو تقریباً ہر جرمن اپنی "قومی پارٹی" سمجھنے لگا ہے۔ گویا جو شخص اس پارٹی میں داخل ہوتا ہے وہ اپنی "قوم کا سپاہی" بن جاتا ہے۔

بہر نوع جدید پارٹی کے باقاعدہ جلسے ہونے لگے۔ شروع میں تو صورت حال حوصلہ شکن رہی کیونکہ اس کے جلسوں میں مشکل سے بیس آدمی شریک ہوتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر ہٹلر نے ایک تدبیر یہ سوچی کہ تھوڑی سی رقم خرچ کر کے ایک مقامی اخبار میں پارٹی کا اشتہار دیدیا، اس سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے، یعنی اشتہار کے بعد جب پارٹی کا دوسرا جلسہ ہوا تو اس میں تقریباً سو آدمیوں نے شرکت کی۔ اشتہار میں یہ بات مشتہر کی گئی تھی کہ "جلسہ میں پہلے ایک مشہور و معروف پروفیسر حالات حاضرہ پر فصیح و بلیغ تقریر فرمائیں گے۔ اس کے بعد ہر ہٹلر کی تقریر ہوگی"۔ الغرض جلسہ میں ایک پروفیسر صاحب کھڑے کر دئے گئے جن کی بھونڈی اور خشک تقریر کا لوگوں کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن ان کے بعد جب ہٹلر کھڑا ہوا تو اول اول تو وہ کسی قدر رک رک کر بولا لیکن بعد میں اسکی تقریر میں روانی پیدا ہوگئی اور اُس نے اپنے تمام آلام و مصائب جو اغیار و احباب ہیں۔ کر برداشت کئے تھے نہایت رقت آمیز لہجہ میں بیان کئے۔ اُس نے جرمنی سے اپنی پرخلوص محبت کا اظہار کیا، ملک کی موجودہ ذلت و خواری کا مفصل ذکر کیا اور جرمنی کی بیدست و پائی اور بے لبسی کا رونا رویا۔ یہ تمام باتیں اس خوش اسلوبی سے بیان کیں کہ سب حاضرین آبدیدہ ہو گئے۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو ہر طرف سے واہ واہ اور مرحبا کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور ہٹلر کی خوشی اور کامیابی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب چندہ کے لئے اپیل کی گئی تو فوراً تین سو مارک جمع ہو گئے۔

اجتماعین سے جھگڑا اب ہٹلر کی پارٹی میدان میں سامنے آنے لگی، پروپیگنڈا کیلئے پوسٹروں اور اشتہاروں سے کام لیا جانے لگا۔ اس وقت جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی سب سے زیادہ طاقتور تھی چنانچہ یہ پارٹی بھی ہٹلر کی جماعت کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس درجہ مخالفت بڑھ گئی کہ کمیونسٹوں نے ہٹلر کو کچل ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔

اول اول صرف اس قدر مخالفت رہی کہ جب کبھی ہٹلر کی پارٹی کا جلسہ ہوتا تو کمیونسٹ پارٹی کے لوگ آ کر شور و غل مچاتے، میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پھینک کر جلسہ کو بھر بھنڈ کر دیتے۔ ان حرکتوں

سے پریشان ہو کر ہٹلر نے یہ تدبیر سوچی کہ اُس نے اپنے بعض ایسے دوستوں کو جلسہ میں مدعو کیا جو اس سے سابق فوج میں کام کر چکے تھے۔ جب دوسرے جلسہ میں کمیونسٹوں نے آ کر گڑ بڑ مچائی تو ہٹلر کے سپاہیوں نے فوراً ان لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور زد و کوب کر کے جلسہ گاہ سے نکال دیا۔ اس کامیابی کے بعد ہٹلر نے سابق فوجیوں کو اپنی پارٹی میں باقاعدہ بھرتی کرنا شروع کر دیا اس ہٹلرنازیوں کے پاس بھی ایک فوجی جماعت ہو گئی جو اس وقت "آہنہ باز دستے" (Storm Detachments = Sturm Abteilung) کے نام سے مشہور ہے۔

نازی فوج | نازیوں کی یہ "فوج" درحقیقت کوئی باقاعدہ فوج نہیں ہے مگر اسمیں جو معمولی شہری داخل ہوتے ہیں وہ سب نازی وردی (بھوری کرتی) پہنتے ہیں۔ ساری جماعت باقاعدہ سپاہ کی طرح ڈویژنوں، برگیڈوں، بٹالینوں اور دستوں میں تقسیم ہے۔ اور تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے سرکاری حیثیت سے یہ سپاہی "غیر مسلح" ہیں اور ان کا مقصد محض اس قدر بتایا جاتا ہے۔ کہ نیشنل سوشلسٹ پارٹی کی باتیں پُرامن طور پر سُنی جا سکیں، اور اسکے جلسوں میں مخالفین کسی قسم کی گڑ بڑ نہ کر سکیں۔

انسائیکلو پیڈیا برطانیکا میں نازی پارٹی کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"اسی اثنا میں نیشنلسٹ جماعتیں تقویت حاصل کرتی گئیں۔ اور اس قدر خود سر اور متمرد ہو گئیں کہ انھوں نے حکومت کے احکام سے سرتابی کرنا شروع کر دی۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ طاقتور پارٹی "نیشنل سوشلسٹ" تھی۔ یہ اتحاد یہ کی عسکریت پسند اور قومیت پرور جماعت ہے اور اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ یہودیوں کی سخت دشمن ہے۔ اگرچہ اس پارٹی کا رجحان طبع برائے نام ڈیموکریسی کی طرف ہے مگر درحقیقت اس سے دولتمند طبقہ کام لیتا ہے چنانچہ یہ ہڑتالوں کو روکنے اور اجتماعین پر حملے کرنے میں کام آتی ہے۔"

تیه | ۱۹۲۳ء تک ہٹلر نے اس قدر پروپیگنڈا اور اپنی جماعت کو اس قدر منظم و مستحکم کر لیا کہ وہ بڑا لیڈر شمار ہونے لگا۔ شہر میونخ کا میر مجلس میر ہر کہر (Kahr) بھی اس کا حامی و مددگار بن گیا۔ اور کچھ دنوں بعد جرمنی کا مشہور و معروف جنرل لیوڈنڈارف بھی اسکا دوست اور رفیق کار ہو گیا۔ ان لوگوں کی مدد اور اپنی نازی فوج کے بھروسہ پر ہٹلر نے نومبر ۱۹۲۳ء میں بویریا کی حکومت پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ناکام رہی۔ کہر اور لیوڈنڈارف اس انقلاب کے لئے آمادہ نہ تھے حتیٰ کہ پارٹی کا آخری جلسہ منعقد ہوا، جونہی کہر جلسہ گاہ میں داخل ہوا ہٹلر نے جیب سے ریوالور

نالائقیوں کے سرکی طرف تول دیا، اور اس طرح اسکو جبراً مجوزہ انقلاب کی حمایت پر مجبور کر دیا۔
لیکن اسی اثناء میں اس سازش کی خبر کسی نہ کسی طرح حکومت کے ارباب حل وعقد کو لگ گئی چنانچہ انھوں نے بروقت عمل کرنے کے لئے خفیہ طور پر ایک فوج مہیا کر لی۔ ہٹلر اور اس کے ساتھیوں کو بے خبری میں گرفتار کر لیا جس سے پارٹی اس وقت منتشر ہو گئی اور بعض لوگوں کو گلی کوچوں میں ہی گولی مار دی گئی۔
اس کے بعد جماعت کے لیڈروں پر حکومت کے خلاف غداری اور بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اس مقدمہ میں جنرل لیوڈنڈارف تو بری ہو گئے۔ ہٹلر نے اپنی صفائی میں کئی دن تک تقریر کی مگر عدالت نے اس کو اور پارٹی کے دیگر لیڈروں کو مجرم قرار دیکر سزا دیدی۔ چنانچہ بعض لوگوں کو پاگل خانہ بھیجدیا گیا اور خود ہٹلر کو پانچ سال کے لئے ایک قلعہ میں قید کر دیا گیا۔

رہائی کے بعد

ایک سال بعد ہٹلر کو قلعہ لینڈسبرگ سے رہا کر دیا گیا، مگر اسی دوران میں اس نے اپنی پارٹی کا پروگرام مکمل کر لیا تھا اور اپنی پالیسی میں بھی کئی طرح کی تبدیلیاں کر لی تھیں یعنی جبر وتشدد کے بجائے تمام کارروائیوں کو "آئین وقانون" کے سانچے میں ڈھال لیا اور پارلیمنٹری طریقوں سے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت اس پارٹی کا صدر مقام میونخ میں ہے اور اس کے دفتر کی سیاہی مائل و شاندار عمارت سب کو معلوم ہے۔ دروازے پر دو نیزے نصب ہیں جن سے نازی جماعت کی عسکریت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس دفتر میں بیٹھکر ہر ہٹلر اپنی جنگی کونسل پر فولادی گھونسہ سے حکومت کرتا ہے۔ جس وقت ہٹلر تقریر کرنے لگتا ہے تمام کمرہ میں سکوت وسکون طاری ہو جاتا ہے۔ کسی نے ہٹلر کی نسبت خوب کہا ہے کہ "وہ منہ سے نہیں بولتا بلکہ اپنے چہرہ سے بولتا ہے"
ہر فقرہ کے ساتھ ہٹلر کا چہرہ حرکت کرتا ہے، اور اسکے سامعین مسحور ہو جاتے ہیں۔ اسی جگہ سے وہ اس وقت تمام جرمنی پر حکومت کر رہا ہے۔ جو درجہ فی زمانہ ٹرکی میں مصطفےٰ کمال پاشا کا یا اٹلی میں سائینور مسولینی کا یا آئرلینڈ میں ڈی ویلرا کا ہے وہی درجہ اس وقت جرمنی میں ہر ہٹلر کا ہے، اور کوئی تعجب نہیں جو آئندہ وہ تمام یورپ کا "ڈکٹیٹر" بن جائے۔
ہٹلر کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ہنٹر رہتا ہے جس پر چاندی کی موٹی سی موٹھ چڑھی ہوئی ہے۔ اس کے بہت سے پیرو بھی اسکی تقلید میں ہنٹر لئے رہتے ہیں، خصوصاً ڈاکٹر گوبلیس تو جو سوشلسٹ جماعت سے ٹوٹکر نازیوں میں جا ملا ہے ہٹلر کی ہر ادا کی نقل کرتا ہے۔ اس کی وضع قطع رفتار وگفتار سبھی ہٹلر اینتھ ہے یہی حال لفٹننٹ روذبرگ کا ہے۔ نازیوں کی خاکی کرتی (Brown Shirt) اسی لفٹننٹ کی ایجاد کی ہوئی ہے۔

ہٹلر کا مقصد ہٹلر عہدنامۂ وارسائی کا سخت دشمن ہے وہ چاہتا ہے کہ جرمن قوم پھر مثل سابق طاقتور ہو جائے۔ وہ جرمنی کی نوآبادیوں کو بھی واپس لینا چاہتا ہے۔ وہ یہودیوں کا دشمن ہے کیونکہ یہ لوگ غریب اور محتاج جرمنوں کو بھاری شرح سود پر قرض دیکر قوم کا خون چوستے ہیں اور ان کو روپیہ نے جامعہ جرمنوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ جرمن قوم کو بہادر سپاہی بنانا چاہتا ہے۔ ہٹلر اور اسکی نازی پارٹی کے مقاصد کا ایک نمونہ مشہور انگریزی اخبار "گارڈین" سے لیکر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں

"عہدنامہ وارسائی کا اصلی مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے مناز ل ارتقا ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیئے جائیں سیاسی طور پر ستانے، ہمیشہ کے لئے غیر مسلح کرنے اور اقتصادی طور پر پریشان کرنے کے علاوہ عہدنامہ مذکور کا یہ بھی مقصد ہے کہ جرمن قوم کو روحانی طور پر بھی بے بس و مجبور بنا دیا جائے۔ جس قوم میں ہر وقت آمادگی اور مستعدی کا خیال عظیم نہیں اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جرمنی کے ترقی کے زمانے میں یعنی جنگہائے آزادی، جدوجہد جرمن اتحاد اور ۱۹۱۴ء میں لفظ "جنگ" جذبات کو مشتعل کرنے کا اثر رکھتا تھا۔ آج بھی ہماری قوم کے دل میں دفاع قومی کے لئے مسلح ہونے کے عزم کا شعلہ اس طرح بھڑکنا چاہیئے کہ تمام منتشر و مضمحل، خستہ و درماندہ افراد قومیت کے شعلوں سے جلنے لگیں شجاعانہ خیالات قوم کے اندر جوہر شرافت پیدا کر دیتے ہیں۔

تاریخ ایک ازلی و ابدی چشمہ کی صورت میں بہتی ہے۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کو قرار ہو تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ طاقتور لوگوں کے حق میں ہوتا ہے جو زندہ رہنے کے مستحق ہوتے ہیں۔ قوموں کی قسمت کا فیصلہ معاہدوں سے نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی قوتوں اور زندہ رہنے کے عزم بالجزم اور سلطنت کے لئے سرفروشانہ وفاداری سے ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کے معنی ہی جنگ کرنا ہیں۔ تاریخ اور جنگ دونوں ایک چیز ہیں۔ اور جنگ ہی کسی قوم کی اعلیٰ ترین قسمت ہے"

اقتدار کے لئے جدوجہد جرمنی کی تاریخ میں ۱۹۳۲ء کا سال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کیونکہ اسی سال میں پریسیڈنٹی کی جدوجہد شروع ہوئی، انتخابات عامہ عمل میں آئے، مسئلہ تاوان کا آخری فیصلہ ہوا اور تمام ملک میں انتشار رہا۔ اسی سال میں دو متضاد طاقتیں یعنی نازی اور حکومت بالمقابل صف آرا ہوئیں اسی اثنا میں اجتماعیت نے زور پکڑا ملک بھر میں فسادات ہوئے اور اس سال کے بعد تحریک بادشاہت کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس لئے مناسب ہے کہ یہاں پر اس سال کے خاص خاص واقعات کا مختصراً ذکر کر دیا جائے تاکہ ناظرین کو جرمنی کی موجودہ حالت بخوبی سمجھ میں آ جائے۔

چانسلر برننگ کی وزارت نے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا۔ اسی اثنا میں ہر ہٹلر کا رفیق اور لفٹنٹ

پھر الفریڈ روزنبرگ لندن پہونچا۔ اور بیان کیا کہ ہٹلر کی پالیسی یہ ہے کہ شرط تاوان پر خط تنسیخ کھینچ دیا جائے۔ ہٹلر انگلستان کو جرمنی کا دوست مگر فرانس کو دشمن سمجھتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ معاہدۂ صلح کے وقت سے لیکر ابتک انگلستان نے ایسی ہر سلطنت کی طاقت توڑ دینے کی کوشش کی ہے جس کا نیچہ میں عام سطح سے بلند ہو جانا چاہا۔ انگلستان یہ نہیں چاہتا کہ جرمنی دنیا بھر میں سب سے زیادہ طاقتور ہو جائے۔ مگر فرانس اتنا بھی نہیں چاہتا کہ جرمنی کو کسی قسم کی بھی طاقت نصیب ہو، یہی دونوں میں فرق ہے:

ہٹلر نے حکومت برونگ کو شکست دینے کی سخت جد وجہد کی۔ ملک میں نازیوں کی قوت بڑھ رہی تھی اور مارچ ۱۹۳۲ء میں انتخاب پریسیڈنٹ کا مرحلہ درپیش تھا۔ اسلئے جرمن چانسلر ڈاکٹر برونگ اور جنرل گروز نے ہر ہٹلر سے .... جنرل ہنڈنبرگ کو آئندہ پریسیڈنٹ رکھنے یا نہ رکھنے کا مشورہ کیا۔ اسی اثنا میں چانسلر نے اپنے سفیر متعینہ لندن کے ذریعہ حکومت برطانیہ کو بھی اطلاع دی کہ جرمنی تاوان جنگ کی آئندہ قسط ادا نہ کر سکے گا۔ ہٹلر نے انتخابات عامّہ کے بغیر ہنڈنبرگ کو پریسیڈنٹ کے عہدہ پر برقرار رکھنے کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر ہنڈنبرگ کو بلا مقابلہ پریسیڈنٹ بنائے رکھنے کا ارادہ ہے تو ڈاکٹر برونگ کی گورنمنٹ کو مستعفی ہو جانا چاہیئے اس جواب کے بعد یہ طے پایا کہ پریسیڈنٹ کا انتخاب از سر نو ہو جائے چنانچہ گو اس وقت ہنڈنبرگ کی عمر چوراسی برس کی ہے مگر (فروری ۱۹۳۲ء میں) انھوں نے پھر پریسیڈنٹی کے لئے کھڑا ہونے کا ارادہ کر لیا۔ ہر ہٹلر نے ان کی مخالفت کی اور ہنڈنبرگ کے مقابلہ میں نیشنلسٹ جماعت کی طرف سے لفٹننٹ کرنل ڈوسٹربرگ کو کھڑا کر دیا گیا۔ بہرحال پریسیڈنٹی کے لئے چار شخص امیدوار تھے۔ یعنی (۱) ہنڈنبرگ، (۲) ہٹلر، (۳) ڈوسٹربرگ، (۴) تھالمان کمیونسٹ، اور چونکہ اس وقت کی جرمن گورنمنٹ ہنڈنبرگ کی طرفدار تھی اس لئے ہٹلر اور اس کی جماعت کو بہت پریشان کیا گیا اور نازی پارٹی کے اخباروں اور مقرروں پر سخت قیود عائد کر دی گئیں۔ غرض اس انتخاب میں ہنڈنبرگ ہی کامیاب ہوئے اور ہٹلر کا دوسرا نمبر رہا۔ لیکن چونکہ ہنڈنبرگ کے ووٹ اپنے مخالفین کے ووٹوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ نہ تھے اس لئے ۱۰۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو دوبارہ رائیں طلب کی گئیں، اس میں بھی ہنڈنبرگ کا نمبر اول رہا۔

۲۴۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو ریاست پروشیا میں بھی انتخابات ہوئے اس میں بھی ہٹلر کی جماعت کو سات کے بجائے ایک سو باسٹھ نشستیں حاصل ہوئیں۔ اسی طرح ہٹلر کی پارٹی کو ہر جگہ کامیابی حاصل ہوئی

آخر مئی ۳۲ء میں برونگ گورنمنٹ کو مستعفی ہونا پڑا۔ اور جون میں ہر فان پاپن جرمنی کے چانسلر مقرر ہوئے۔ ۴ جون ۳۲ء کو پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے پارلیمنٹ شکست کردی اب گویا جرمنی میں تین شخصوں کی حکومت ہوگئی۔ یعنی (۱) ہنڈنبرگ (۲) ہر فان پاپن اور (۳) جنرل فان شلیشر وزیر افواج۔

اس زمانہ میں نازی پارٹی گورنمنٹ کی نظروں میں معتوب تھی چنانچہ اپریل ۳۲ء میں اسکے خلاف احکام جاری ہوئے لیکن ڈھائی مہینہ کے اندر ہی اندر پریسیڈنٹ کو یہ احکام منسوخ کرنا پڑے مگر جون ہی میں جرمنی کی مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان فسادات ہونے شروع ہوگئے۔ اور گورنمنٹ کو مجبوراً مارشل لا جاری کرنا پڑا۔ اور مختلف پولیٹیکل جماعتوں کا مخصوص وردیاں پہننا ممنوع قرار دیا گیا۔ اور پبلک جلسے اور ہر قسم کے مظاہرے بند کردیے گئے۔ غرض ۲۰ جولائی ۳۲ء کو برلن میں معمولی قانون معطل کرکے فوجی قانون جاری کردیا گیا۔ اور ہر فان پاپن پروشیا کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ چند ہی روز بعد جنیوا میں جرمنی کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ عہدنامہ فرسائی کو منسوخ کردیا جائے۔

۳۱ جولائی ۳۲ء کو پھر جنرل الکشن ہوا جس میں ہٹلر کی پارٹی کی طاقت ہر جگہ دوگنی ہوگئی اور نازیوں کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہوگئی۔ اگست ۳۲ء میں بھی فسادات کا سلسلہ جاری رہا جن کی وجہ سے ہنڈنبرگ کو فسادیوں کے خلاف ایک سخت فرمان جاری کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ فرمان عام تھا۔ لیکن اس کا شکار خاص طور پر نازی جماعت ہوئی۔ جس کا باعث یہ تھا کہ ملک میں سب سے بڑی جماعت ہونے کی وجہ سے وہ اپنے لئے خاص اقتدار کے دعویدار تھے۔ ان کا خاص مطالبہ یہ تھا کہ ہٹلر کو وزیر اعظم اور ان کے دیگر لیڈروں کو وزیر بنا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۳۔ اگست کو ہر ہٹلر نے ہر فان پاپن کے پاس جاکر وزارت عظمیٰ کا مطالبہ کیا۔ فان پاپن نے ہٹلر کے لئے وائس چانسلری اور ریاست پروشیا کی وزارت عظمیٰ پیش کی لیکن ہٹلر نے اسے منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد ہٹلر نے پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کے پاس جاکر اپنے مطالبات پیش کئے۔ مگر انھوں نے بھی ان مطالبات کو منظور نہ کیا۔

۱۵ اگست ۳۲ء میں گورنمنٹ اور ہٹلر پارٹی کے درمیان تصادم ہوگیا کیونکہ نازیوں نے ایک کمیونسٹ کو قتل کردیا تھا جس پر پانچ نازیوں کے لئے موت کی سزا تجویز کی گئی مگر ہٹلر نے اس فیصلے کے خلاف شور و شر برپا کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کو اس سزائے موت کو قید سے بدلنا پڑا۔

۲۰۔ اگست ۱۹۳۲ء کو ریشسٹاغ کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں نازیوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے کپتان گورنگ (ہٹلر پارٹی) ریشٹاغ کا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ مگر اسی اثنا میں ہر فان پاپن نے پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ سے ایک حکم لکھوا لیا جس کی رو سے چانسلر کو پارلیمنٹ کے شکست کرنے کے اختیارات مل گئے۔ چنانچہ جب ۱۲۔ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ریشٹاغ میں ہر فان پاپن کے خلاف ملامت کا ووٹ پاس کرنے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے پارلیمنٹ ہی کو برخاست کر دیا۔ اس طرح پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ پارلیمنٹ کے بغیر ہی جرمنی پر حکومت کرنے لگے۔

آخری کامیابی ۱۲۔ ستمبر کے اجلاس پارلیمنٹ میں ہر فان پاپن کی حکومت کے خلاف پانچسو تیرہ ووٹوں کی موافقت اور صرف بتیس ۳۲ ووٹوں کی مخالفت سے عدم اعتماد کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ چونکہ پارلیمنٹ توڑ دی گئی تھی اسلئے پھر جنرل الکشن ہوا۔ اسی اثنا میں نازیوں کی طاقت بہت بڑھ گئی اور پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کو ہٹلر کی طرف سے جو مخالفت تھی وہ زائل ہو گئی۔ بہرحال اس جنرل الکشن میں مختلف جماعتوں کے جو ممبر منتخب ہوئے اُن کی تعداد یہ ہے:۔

(۱) نازی جماعت کے	۲۸۸	(۲) سوشلسٹ واسٹیٹ پارٹی	۱۲۵
(۳) کمیونسٹ	۸۱	(۴) مرکزی پارٹی	۷۳
(۵) نیشنلسٹ پارٹی	۵۹	(۶) بویریا پیپل پارٹی	۱۹
(۷) جرمن پیپل پارٹی	۷۰	(۸) متفرق	۲۰

اس انتخاب کے بعد یکم فروری ۱۹۳۳ء کو پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے ہٹلر کو چانسلر کا عہدہ پیش کیا جسے اُس نے بخوشی منظور کر لیا۔

اس طرح نازی جماعت کا تمام ملک پر اقتدار قائم ہو گیا اور اس کا لیڈر ہر ہٹلر جرمنی کا وزیر اعظم بلکہ ڈکٹیٹر بن گیا۔ مارشل ہنڈنبرگ جیسے جہاں دیدہ و تجربہ کار مدبر کا ہر ہٹلر کی تائید و حمایت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ہٹلر کی پارٹی کو اس وقت جرمنی میں خاص ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہٹلر کو اپنے ذاتی مفاد یا اقتدار کا چنداں خیال نہیں ہے بلکہ وہ اور اس کی جماعت جرمنی کے ترقی خواہ ہیں اور وہ جنگ عظیم کے تباہ کن نتائج سے نجات دلا کر از سر نو اپنے ملک کی عظمت و عزت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہٹلر کی پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں اور اس کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ جرمنی میں اس وقت جمہوری نظام کا خاتمہ ہو گیا ہے حتیٰ کہ اس وقت جمہوری جھنڈے کے بجائے تمام سرکاری عمارتوں میں پرانا

شاہی جھنڈا اور اس کے ساتھ نازی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خاندان قیصر کی بحالی کا پیش خیمہ ہے۔ سابق قیصر ولیم نے ہٹلر کی کامیابی پر اظہار طمانیت کیا ہے۔ اتحادیوں نے جنگ عظیم کی تمامتر ذمہ داری جرمنی پر ڈالی تھی اور اسی لحاظ سے صلحنامہ وارسائی میں اس کے ساتھ اتنی سختیاں روا رکھی گئی تھیں، لیکن ہٹلر نے اس ذمہ داری سے صاف انکار کر دیا ہے۔ بقیہ تاوانِ جنگ کی عدم ادائگی کا پہلے ہی اعلان ہو چکا ہے۔ اب جرمن نوآبادیوں کی واپسی کا بھی مطالبہ ہے اور فوج کی از سر نو تنظیم کی بھی کوشش ہو رہی ہے۔ غرض اس وقت جرمنی اپنی کھوئی ہوئی عظمت و اہمیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہے۔ یہ جد و جہد کہاں تک کامیاب ہوگی؟ اس سوال کا جواب مستقبل کے ہاتھ ہے۔

(نوٹ) ہٹلر گورنمنٹ کے قائم ہوتے ہی نازیوں نے اپنی توجہ ان یہودیوں کی طرف منعطف کر دی جو جرمنی میں آباد ہیں۔ واضح ہو کہ پولینڈ اور جرمنی میں یہودیوں کی آبادی اس قدر کثیر ہے کہ کوئی حرفت اور کوئی پیشہ ان سے خالی نہیں۔ نازیوں کو ان سے خصومت ہے لہذا انھوں نے یہودیوں کا بائیکاٹ شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے اکثر یہودی جرمنی سے مجبوراً ہجرت کر گئے۔ چنانچہ ڈاکٹروں کا ایک وفد ہر ہٹلر کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بائیکاٹ کا شاکی ہوا۔ جس کا جواب ہر ہٹلر نے یہ دیا کہ جرمنی میں علم و فضل کے لحاظ سے یہودیوں نے ایسی طاقت حاصل کر لی ہے جس کی وجہ سے واقعی وہ ملک کے دل و دماغ بن گئے ہیں لیکن وہ دراصل غیر ہیں اور انھیں جرمنی یا جرمنوں سے کوئی محبت نہیں ہے۔ بلکہ وہ جرمن بنکر جرمنوں کا خون چوس رہے ہیں اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ جرمنی ان کی گرفت سے رہا ہو جائے۔ بہرحال یہ بائیکاٹ اس حد تک کیا گیا کہ جرمن کارخانوں سے یہودیوں کو برطرف کر دیا گیا۔ یہودی سوداگروں سے خرید و فروخت اور یہودی ڈاکٹروں اور وکلا سے معاملہ وغیرہ بالکل ترک کر دیا گیا۔

ہٹلر گورنمنٹ نے ایک جدید فرمان بھی جاری کیا ہے جسکی رو سے جرمنی کی ریاستوں میں ڈکٹیٹروں کا تقرر عمل میں آسکیگا اور ہر فیڈرل ریاست میں ایسے ناظم مقرر کئے جائیں گے جنکو اپنی ریاستوں کے وزرا کو برخاست کرنے کا اختیار حاصل ہوگا اور جو صرف ہر ہٹلر کو جوابدہ ہونگے۔ خود ہر ہٹلر ریاست پروشیا کے ناظم اعلیٰ ہونگے۔ اس جدید قانون کی رو سے جرمنی کی ریاستوں میں جدید انتخاب کی ضرورت بھی باقی نہ رہیگی

ہٹلر گورنمنٹ کی یہ تجویز بھی ہے کہ دستور ویمر کے ماتحت جو خطابات اور اعزازات منسوخ کر دیئے گئے تھے وہ پھر بحال کر دیئے جائیں۔ جدید خطابات و اعزازات دینے کا اختیار پریسیڈنٹ کو ہوگا۔ فی الحال دو قسم کے اعزاز جاری کئے جائینگے (۱) ان لوگوں کیلئے جنھوں نے قومی انقلاب کے سلسلہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں (۲) ان لوگوں کیلئے جنھوں نے ادب یا سائنس کے سلسلہ میں خدمات کی ہیں۔"

(ا۔ ز)

یادِ رفتگاں

سر جیون جی جمشید جی مودی

علمی دنیا میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء کی صبح کو بمبئی کے مشہور و معروف پارسی عالم اور فاضل سر جیون جی جمشید جی مودی کا اٹھاسی سال کی عمر میں اپنے مکان واقع قلابہ بمبئی میں حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ اگرچہ مرحوم کی عمر کافی زیادہ ہوگئی تھی تاہم آپ میں ابھی جوانوں کی طرح قوت تحریک و عمل تھی۔ چنانچہ مرنے سے چھبیس گھنٹے پہلے آپ سر کاؤس جی جہانگیر ہال بمبئی میں ایک مجمع کثیر کے سامنے لکچر دے چکے تھے۔

دنیا آتی جاتی ہے، سب ہی تو پیدا ہوئے اور مرگئے۔ لیکن "ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق"۔ اور عشق بھی کیسا؟ علم کا۔ اس لئے جب تک ہندوستان میں علم و فضل کا چرچا باقی ہے مرحوم کی شہرتِ عام بصورت دوام قائم رہیگی۔ آپ کو علوم مشرقیہ خصوصاً فارسی لٹریچر اور اوستا کے ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ آپ اپنی ان علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے نہ صرف بمبئی کے علمی حلقوں بلکہ یورپ و امریکہ کے علما و فضلا میں بھی ادب و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک معظم نے بھی ماہ جون ۱۹۳۰ء میں آپ کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں آپ کو "سر" "نائٹ" کا خطاب و اعزاز عطا فرمایا تھا۔

سر جیون جی کے والد قلابہ کے پارسی مندر کے متولی تھے یہیں اکتوبر ۱۸۵۴ء میں آپ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۷۷ء میں آپ نے الفنسٹن کالج سے بی۔اے پاس کیا، اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے علوم دینی میں بھی اس قدر فضیلت حاصل کرلی کہ اپنے والد کی وفات پر آپ ہی کو دستور اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے علوم دینی میں بھی دستار فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کی چنانچہ آپ نے ملا فیروز اور سر جمشید جی کے مدرسوں میں داخل ہوکر اوستا کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ پھر چند سال تک اسی مدرسہ میں پروفیسر رہے۔ چونکہ آپ کو علوم قدیمہ کا جو منی

و فرانس کے علما و فضلا نے زرتشتی لٹریچر کی نہایت محنت و جانفشانی کے ساتھ تحقیق و تدقیق کی ہو اس لئے ان مغربی محققین کی کتابوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے آپ نے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔

اس زمانہ میں پارسیوں کے اندر (۱) قدامت پرست، اور (۲) اصلاح پسند، دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں، اصلاح مذہب کے دلدادوں نے مشہور پارسی عالم اوستا مسٹر کے. آر. کاما کی صدارت میں ”رہنما ئے مزدا یسنی سبھا“ کی بنیاد ڈالی اور نہایت شد و مد کے ساتھ قدامت پرست اور لکیر کے فقیر پارسیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ فرامجی کاؤس جی انسٹیٹیوٹ میں تلاطم خیز جلسے ہونے لگے، جن کی رپورٹیں خوب نمک مرچ لگا کر پارسی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ چونکہ سر جیون جی پارسی قوم کے مقتدائے اعظم یعنی دستور تھے اس لئے رہنمائی کے لئے تمام قوم کی آنکھیں آپ ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ چند سال بعد جب مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ دب گیا تو سر جیون جی نے مذہبی لکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۸۸۵ء میں سر جیون جی بمبئی یونیورسٹی کے فیلو نامزد ہوئے اور آخر عمر تک اس منصب جلیل پر فائز رہے۔ ایک سال تک بمبئی کارپوریشن میں بھی آپ نے یونیورسٹی کی قائم مقامی کا حق ادا کیا۔ جولائی ۱۸۸۹ء میں آپ علمائے مستشرقین کی کانگریس کے اجلاس ہشتم میں شرکت کرنے کے لئے یوروپ تشریف لے گئے۔ یہ کانگریس ماہ ستمبر میں بمقام اسٹاکہام منعقد ہوئی تھی۔ اس کے سلسلے میں شاہ سویڈن نے آپ کو ایک طلائی تمغہ مع سند و نشان عطا فرمایا تھا۔

۱۸۹۳ء میں آپ پارسی پنچایت فنڈ کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور اسی سال آپ کو گورنمنٹ آف انڈیا نے ”شمس العلما“ کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۹۰۱ء میں حکومت فرانس نے آپکو ”آفیسر اکیڈیمی“ اور ۱۹۰۲ء میں ”آفیسر دولا انسٹرکشیان پبلیک“ نامزد کیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کو یونیورسٹی ہیڈلبرگ سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا ہوئی۔ سالہا سال تک آپ رائل ایشیاٹک سوسائٹی شاخ بمبئی کے ممبر رہے اور ۱۹۰۰ء میں اس سوسائٹی کے وائس پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ اسی طرح عرصہ تک آپ بمبئی کی انتھراپولاجیکل سوسائٹی کے ممبر رہے اور ۱۹۱۲ء میں اس کے پریسیڈنٹ بنا دیے گئے۔

۱۹۲۵ء میں آپ نے دوبارہ یوروپ کی سیر و سیاحت فرمائی اور جب آپ فرانس گئے تو وہاں کی حکومت نے آپ کو شولیر دو لیجیان دآنر "Chevalir de Legion de Honneur" کا خطاب عطا کیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آپ بوڈاپسٹ گئے تو حکومت ہنگری

طے آپ کو "آفیسر دو کراس میرٹ" (Officer de Croix de Merit) کا خطاب دیا گیا۔
۱۹۳۱ء میں بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو "ایل۔ایل۔ڈی" کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔
غرض آپ کی وفات سے ہندوستان کا ایسا عالم و فاضل اٹھ گیا جس کی شہرت دور و نزدیک
پھیلی ہوئی تھی۔

سر جوالا پرشاد مرحوم

صوبہ بہار کا یہ مایۂ ناز فرزند مارچ ۱۸۷۵ء میں ضلع شاہ آباد صوبۂ بہار میں پیدا ہوا۔ اور ۵۷ سال کی عمر میں ۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء کو اپنے وہی وطن میں چند روز علیل رہکر وفات پائی۔ آپ نے میور سنٹرل کالج الہ آباد میں تعلیم پاکر ۱۸۹۳ء میں بی۔اے پاس کیا جس میں آپ تمام یونیورسٹی میں اول رہے تھے اور زبان انگریزی میں اعزاز حاصل کیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے بعد آپ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں منسلک ہو جاتے اور صوبجاتی سروس میں معراج کمال حاصل کر لیتے، لیکن آپ نے ملازمت کو پسند نہ کیا اور وکالت پاس کر کے قانون کا پیشہ اختیار کر لیا۔ جس میں اس قدر ترقی کی کہ ۱۹۱۶ء میں پٹنہ ہائیکورٹ قائم ہونے پر آپ بھی اس کے ایک جج مقرر کئے گئے۔ آپ کئی مرتبہ پٹنہ ہائیکورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس بھی مقرر ہوئے۔ جج کی حیثیت سے آپ کی قابلیت اور بے لوثی ہمیشہ مسلم رہی۔ قوت فیصلہ میں آپ کو اس قدر کمال حاصل تھا اور آپ کے فیصلے اس قدر مدلل ہوا کرتے تھے کہ بڑے بڑے قانون داں آپ کی قابلیت کا لوہا ماننے لگے تھے۔ بہر حال آپ کا شمار ہندوستان کے بہترین ججوں میں تھا۔ علم دوستی کی وجہ سے آپ کا پٹنہ یونیورسٹی سے بھی نہایت گہرا تعلق تھا، چنانچہ سالہا سال تک آپ اس یونیورسٹی میں سنڈیکیٹ کے ممبر رہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے بھی آپ کا تعلق تھا۔ الغرض کیا بلحاظ شخصیت اور کیا بلحاظ جج آپ کا بیحد احترام کیا جاتا تھا۔ ہائی کورٹ پٹنہ کے تمام ججوں کے ایک جلسہ میں آپ کی وفات پر انتہائی رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔

دیوان بہادر کیشو پلے

عموماً جنوبی ہند اور خصوصاً صوبۂ مدراس مشہور محب وطن اور خادم قوم دیوان بہادر کیشو پلے کی وفات حسرت آیات پر جس قدر بھی اظہار غم و ملال کرے اس قدر کم ہے۔ تقریباً نصف صدی تک اس جاں نثار قوم نے اپنے صوبہ میں پبلک لائف کا معیار بلند کرنے میں جو انتھک کوشش کی وہ

جنوبی ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اگرچہ آپ گوٹی جیسے دور افتادہ اور پست ضلع کے وکیل تھے، لیکن اپنے قومی جوش، ہمت عالی، اور لگاتار محنت سے آپ نے احاطہ مدراس میں ایک مسلمہ اور ممتاز ترین پوزیشن پیدا کر لی تھی۔ انتظامی امور اور قانونی موشگافیوں میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اور چونکہ آپ جمہور کی ترقی میں ہمیشہ سچے دل سے منہمک رہتے تھے اس لئے تمام صوبہ آپ کا بیحد احترام کرتا تھا۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں آپ مدراس کونسل کے دوسری مرتبہ باتفاق رائے ڈپٹی پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے۔ چنانچہ مدراس کونسل کے پریسیڈنٹ دیوان بہادر سر ایم۔ کرشنان نائر نے آپ کی خدمات کا ان الفاظ میں اعتراف فرمایا تھا۔

"آپ ہمیشہ جمہور کے طرفدار رہے، ہمیشہ قوم کی خاطر لڑتے رہے، لیکن آپ جب کبھی لڑے صاف دل اور صاف ہتھیاروں سے لڑے، حتیٰ کہ جس شخص پر آپ حملہ کرتے تھے اس کے جسم پر زخم کا نشان تک نہ ہوتا تھا۔ ...... وہ بھی دن دُور نہیں کہ آپ کو مدراس کی دنیا "بابائے کونسل" کے نام سے پکارے گی۔"

پریسیڈنٹ نے آپ کے لئے "بابائے کونسل" کا لفظ اس لئے استعمال کیا تھا کہ آپ کونسل کے لگاتار سولہ سال تک ممبر رہے تھے۔ دراصل آپ کا شمار اِن بزرگوں میں ہے جنھوں نے ہندوستان میں پبلک لائف کی بنیاد قائم کی ہے۔ افسوس اس وقت تمام صوبۂ مدراس میں کوئی شخص آپ کا جانشین نظر نہیں آتا۔

سلکِ جواہر

اگر تمہیں روپیہ کی قدر و قیمت معلوم نہ ہو تو کسی سے قرض لیکر دیکھ لو۔ (بنجمن فرینکلن)

پڑھنے کے بعد اُس پر غور نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا خوراک کھا کر اسے ہضم نہ کرنا۔ (برک)

ہماری پیدائش کیا ہے موت کی ابتدا۔ (ینگ)

تم کسی جگہ ہو موت تمہیں ضرور ڈھونڈھے گی۔ خواہ تم بڑے بڑے مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ (قرآن مجید)

میں اُس شخص کو اپنے دوستوں میں شامل نہیں کرونگا جو بلا وجہ ایک بیچارے چیونٹی پر پاؤں رکھدے۔ (کوپر)

نیند کیا ہے؟ چند گھنٹوں کی موت؟ موت کیا ہے؟ ہزارہا سال کی نیند! (فلیچر)

دولت ایک پرند ہے اور شان و شوکت ایک خواب (کوپر)

عالمِ نسواں

پچھلے ماہ ہندوستان کے دو مشہور مقام لاہور اور دہلی میں عورتوں کا ایک بڑا اسپتال اور کالج کھلے ہیں۔ ۱۱۔مارچ کو ہز اکسلنسی لیڈی ولنگڈن نے لاہور میں "لیڈی ولنگڈن زنانہ اسپتال" کا افتتاح فرمایا جو زچہ و بچہ اور عام عورتوں کی نفع رسانی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔اس شفاخانہ پر پونے پانچ لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے۔اور چار لاکھ روپیہ طبی سامان پر مزید صرف ہوا۔اس کے تین وارڈ ہندوستانی اور ایک وارڈ اینگلو انڈین اور یوروپین عورتوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ہر وارڈ میں بارہ مریضوں کے قیام کا انتظام ہے۔لیڈی ولنگڈن نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں اسپتال کی بہت تعریف کی ہے۔

دہلی میں لیڈی اروِن صاحبہ کی یادگار میں ایک اعلیٰ درجہ کا زنانہ کالج قائم ہوا ہے۔چنانچہ ۲۰۔مارچ کو ہز اکسلنسی وائسرائے نے لیڈی اروِن کالج نسواں دہلی کا معززین و حکام کی جمعیت کثیر کے سامنے افتتاح فرمایا۔مسز فریدون جی نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ تقریباً تین سال کی لگاتار محنت اور غور و فکر کے بعد آج یہ کالج وجود میں آیا ہے۔جس کی بنیاد ایک کرایہ کی عمارت میں ڈالی گئی تھی۔ کالج کمیٹی کے پاس ساڑھے چار لاکھ روپیہ تھا جس میں دو لاکھ روپیہ حضور نظام کا عطیہ تھا۔اب مزید عمارتوں کے لئے ڈھائی لاکھ روپیہ کی اور ضرورت ہے، امید ہے کہ کوئی دریا دل اہل ملک جلد اس ضرورت کو بھی پوری کر دیگا۔لیڈی تھوسے نے کالج کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ یہ کالج قابل نمونہ اُستانیاں، بیویاں اور مائیں وغیرہ پیدا کرے گا۔وائسرائے نے تقریر کرتے ہوئے ایک پرلطف فقرہ یہ کہا کہ امید ہے اس کالج کی پڑھی ہوئی عورتیں اپنے شوہروں کو اسی طرح قبضہ میں رکھیں گی جیسے کہ لیڈی ولنگڈن اپنے شوہر کو رکھتی ہیں۔مسز ہناسین نے جو کالج کی سب سے پہلی پرنسپل ہیں، وائسرائے کو پھولوں کے ہار پہنائے۔بیگم شاہنواز، مسز سریواستو کا پنجہ اور بیگم حبیب اللہ لکھنؤ بھی اس جلسہ میں شریک تھیں۔

پچھلے دنوں شیخ محمد حبیب اللہ صاحب نے قانونی کونسل صوبہ متحدہ میں یہ تحریک پیش کی کہ صوبہ میں اعلیٰ درجہ کی زنانہ تعلیم کے وسائل بہم پہونچانے کی غرض سے آگرہ و اودھ کے ہر بڑے شہر میں عورتوں کے لئے ایک انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہونا چاہیئے۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اس مشورہ کو اصولاً تسلیم کیا۔ اور کہا کہ اگرچہ لکھنؤ بنارس، الہ آباد اور علیگڈھ میں زنانہ انٹرمیڈیٹ کالج موجود ہیں لیکن تعلیم نسواں کی روز افزوں ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تعداد بہت کم ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارا سررشتہ تعلیم جلد ہی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس وقت تک عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سررشتہ تعلیم نے کوئی خاص کورس مقرر کرنے پر غور نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ہریتی گرلس اسکول لکھنؤ کے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر اے ملیح بیکسٹری ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ نے اس مسئلہ پر اظہار خیالات فرمایا۔ آپ نے تسلیم کیا کہ تعلیم نسواں کے لئے ایسا نصاب معین کرنے کی سخت ضرورت ہے جو ملکی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی لڑکیوں کے لئے مناسب اور مفید ہو آپ کی رائے میں یہ نصاب ایسا ہونا چاہیئے جو ہندوستانی عورتوں کے شمائل و فضائل کے نشوونما میں مدد دے۔ آپ کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مغربی لڑکوں یا لڑکیوں کے نصاب کی تقلید ہمارے لئے نہ موزوں ہے اور نہ ضروری ہمکو امید ہے کہ ہمارے رہنمایانِ تعلیم اس ضروری مسئلہ کی طرف جلد ہی توجہ فرمائیں گے۔

بیگم شاہنواز صاحبہ جو گول میز کانفرنسوں میں ڈیلیگیٹ تھیں وھائٹ پیپر پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ نے عورتوں کو حق رائے دہی دینے میں لوتھین کمیٹی کی سفارشوں پر بھی عمل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں فیڈرل اسمبلی کی رکنیت کے لئے عورتوں کے نمائندہ ہونے کی سفارش بھی منظور نہیں کی۔ ہندوستان کی عورتوں پر یہ صریح ظلم ہے۔

سرسوتی بھون دہلی میں تقریر کرتے ہوئے غازی رؤف بے نے ترک عورتوں کی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ یوں تو تحریک بیداری نسواں سلطان سلیم کے عہد ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ سلطان عبدالمجید خاں کے زمانہ میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہا۔ انیسویں صدی میں تعلیم نسواں فروغ ہوگئی۔ لیکن جب جنگ بلقان اور بعدازاں جنگ یونان میں عورتوں نے کارنامہائے عظیم انجام دیئے

خوشی کی بات ہے کہ گزشتہ پانچ سال کے اندر لڑکوں کے اسکولوں میں پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد یو۔پی میں اٹھتالیس ہزار سے ستاون ہزار ہو گئی ہے۔

مس نورجہاں حسین صاحبہ بی۔اے بی ٹی مدراس میں ڈسٹرکٹ انسپکٹریس مدارس مقرر کی گئی ہیں۔ آپ صوبہ بہار کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے لندن یونیورسٹی سے ٹیچری کا ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔اے بی۔ٹی پاس کرنے کے بعد آپ کو مسٹر دیپ نراین سنگھ صاحبہ بھاگلپور نے وظیفہ دیکر ولایت بھیجا تھا جہاں سے آپ نے ٹیچری کا ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔

ملک معظم نے ریاست ٹراونکور کی چھوٹی مہارانی صاحبہ کو جو موجودہ مہاراجہ کی والدہ ہیں ہر ہائینس کا خطاب عطا فرمایا ہے۔

۶۔ مارچ کی شام کو قصر سلطانی بھوپال میں ولیعہد شہزادی گوہر تاج بیگم کی تقریب رخصتی منعقد ہوئی جس میں بہت سے مہمانان عزیز شریک ہوئے تھے۔ ہز اکسلنسی وائسرائے اور لیڈی ولنگڈن بھی جلوہ افروز تھے شہزادی ساجدہ بیگم بھوپال، شہزادی رابعہ بیگم بھوپال بھی شریک تھیں۔ علاوہ ازیں بعض دیگر ریاستوں کے روسا بھی آئے تھے۔ جب شہزادی گوہر تاج عابدہ سلطان کی عمر صرف ایک ہفتہ کی تھی تو ان کو لیڈی ولنگڈن نے گود میں کھلایا تھا۔ اس لئے خود لیڈی صاحبہ نے شہزادی اور نواب صاحب کروائی (دولہا) کا جام صحت تجویز کیا۔ تمام شہر اور تمام شاہی محلات فرط آرایش و زیبایش سے دلھن بنے ہوئے تھے۔ شب کو تمام شہر کثرت چراغاں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، ریاست کی فوج زرق برق وردیوں میں بارات کے ساتھ تھی۔ نواب سرور علی خاں والی کروائی بحیثیت نوشہ ایک ہاتھی پر زرنگار ہودہ میں جس میں طلائی عماری بھی تھی سوار تھے دولھا نے اترتے ہی انگریزی طریقہ پر اپنی تلوار سے ایک بڑا کیک کاٹا اور وائسرائے اور لیڈی ولنگڈن کی مبارکباد قبول کی، بعد ازاں دلہن کو لیکر جو ایک مرصع پالکی میں جس پر گلابی ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے سوار تھیں، راحت منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہزادی کو نواب صاحب نے ستر ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا فرمائی۔ تمام تقریب بصد مسرت و کامیابی انجام پذیر ہوئی۔ ہم بھی اس تقریب سعید پر دولھا دلھن اور نواب صاحب بھوپال دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔

انتشارِ شاعر

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم اے)

درد کی سوز کی الفت کی کہانی میری ذرّہ ذرّہ نے سُنی مجھ سے زبانی میری

تہ بتہ سے مَیں سرگرمِ سخن رہتا ہوں رات کو تاروں سے سب قصۂ غم کہتا ہوں

میرے گائے ہوئے نغمے جو یہ سُن جاتی ہیں بلبلیں بیٹھ کے گلشن میں چہک آتی ہیں

خوشبوئے مہر و وفا میری جو پا جاتے ہیں غنچے کھل پڑتے ہیں اور پھول مہک جاتے ہیں

یہ نسیمِ سحری اتنا جو اٹھلاتی ہے شوخیٔ طرزِ ادا میری چُرالاتی ہے

دشت و دریا نے بھی لی مجھ سے نشانی دل کی اسمیں وسعت ہی تو اسمیں ہے روانی دل کی

یہ جو اُڑتے ہوئے مرغانِ چمن گاتے ہیں رنگ اندازِ بیاں میرا اُڑا لاتے ہیں

دیکھکر سوز مرا سوز کا دم بھرتے ہیں جوش میں آتے ہیں پروانے تو جل مرتے ہیں

سیکھ لی سیکھ لی یہ سوزِ بیانی میری شمع رو رو کے سُناتی ہے کہانی میری

کرتو لی جذب یہ پُردردِ حقیقت میری مجھ سے ملتی تو ہے آواز پپیہے تیری

دل مرا الفتِ سربستہ کا شیرازہ تھا کھل گیا ٹوٹ گیا پھیل گیا پھیل گیا

قمریاں بلبلیں پروانے جو نالاں ہیں یہ
مجھ کو شک ہے مرے اوراقِ پریشاں ہیں یہ

کلامِ اثر

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی۔اے)

اسیری میں جو فکرِ آشیاں ہے
نفس ہم رنگ شعلہ پرفشاں ہے

کبھی سن لے کہ دلکش داستاں ہے
زباں میری ہے اور تیرا بیاں ہے

کوئی روٹھا ہوا کیوں مہرباں ہے
مرے حسرت بھرے دل تو کہاں ہے

خدارا ہمت اے پائے شکستہ
نظر کے سامنے وہ آستاں ہے

چمن کی جان تھے جو پھول توڑے
فغاں ہے دستِ گلچیں سے فغاں ہے

نشیمن سے جو اٹھا تھا اسیرو
مری آنکھوں میں ابتک وہ دھواں ہے

قفس میں ہو گیا اکثر یہ دھوکا
ستارا صبح کا یا آشیاں ہے

تکلف برطرف، پردہ ہی اچھا
اگر مقصود جلوہ امتحاں ہے

ہوئی ہے سرخ جس سے چشمِ عاشق
بہار اُس آتشِ تر کا دھواں ہے

رقم گلشن میں ایک اک برگِ گل پہ
مرے خونی کفن کی داستاں ہے

عیاں ہو اور اے حسنِ جہانتاب
حجابِ جلوہ اب تک درمیاں ہے

مژہ پر بھولا بسرا کوئی آنسو،
کہے جو کچھ، خموش اپنی زباں ہے

مے جلوہ لٹائے آج ساقی
مگر اس مے کا پیمانہ کہاں ہے

نگاہیں مل کے جھکنا، دل کا جانا
مری آنکھوں میں ابتک وہ سماں ہے

مژہ نمدیدہ، چہرہ زرد، لب خشک
اثر پندارِ خودداری کہاں ہے

سچ ہے محبت زہر نہیں ہے
جینے کی پھر بھی لہر نہیں ہے

کشتوں سے تیرے جو نہ بسا ہو
ملکِ وفا میں شہر نہیں ہے

چھلکے سے پی جا اے دلِ مضطر
اشکِ الم ہے، زہر نہیں ہے

مسلکِ اہلِ صبر و رضا میں
جبر نہیں ہے، قہر نہیں ہے

معنیِ صورت، صورتِ معنی
تو ہی تو ہے، دہر نہیں ہے

دل ہی اثر کا تاب نہ لایا
ورنہ محبت زہر نہیں ہے

تبرکات

(از علامہ شاد عظیم آبادی مرحوم)

غفلت میں گزرتی ہے جوانی — بس طولِ حیات ہے سربانی
سوتا سنسار، جاگتا حق — سچی تھی اسی قدر کہانی
اب ایک کا بھی پتہ نہیں ہے — چھوڑی تو بہت سی تھی نشانی
بے بال و پر ہوئے نہ افسوس — مرنے پہ بھی جنت آشیانی
تصویر تری ہے اب بھی دل میں — اے مجمع دوستانِ جانی
آنا ہو تو آ کہاں تلک صبر — اے وجہ بقائے زندگانی
موقوف ہے شاید اس جہاں پر — اے روح لقائے یار جانی
خاموش ہوں مدتوں سے اے شاد — موقوف ہے شغل شعر خوانی

طاقت شگفتگی کی نہ نشو و نما کی ہے — خوبی یہ اے چمن تری آب و ہوا کی ہے
ہمت ہی ساتھ جادۂ الفت میں ہر جگہ — رہبر کی احتیاج نہ حاجت عصا کی ہے
رکھتا ہوں ٹھیک پاؤں جو تاریک راہ میں — اے چشم روشنی یہ کسی نقشِ پا کی ہے

خود صفحۂ وجود ہے اے شاد کالعدم
جس شکل پر نگاہ اٹھاؤ فنا کی ہے

موت

(از مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی (از مدراس))

نومبر [illegible]ء کے رسالہ یادگار لاہور میں ایک مختصر مضمون "موت" کے عنوان سے چھپا ہے، جو غالباً کسی انگریزی مضمون یا نظم کا ترجمہ ہے۔ یہ نظم بعض تصرفات کے بعد اسی سے تیار کیگئی ہے (محوی)

شرف وجاہ، اور مال ومنال ہیں حقیقت میں خواب اور خیال
موت کے سامنے ہے کس کی مجال

نہ اولوالعزم بادشاہ رہے نہ وہ ارباب عز وجاہ رہے
نہ سپہ لشکر وسپاہ رہے

اب وہ اگلے جہاں پناہ کہاں وہ سلاطین کج کلاہ کہاں
وہ ستم راں، وہ دادخواہ کہاں؟

آہ بے رحم موت ہاتھ اپنے پھیر جاتی ہے آکے چپکے سے
حلق پر ہر امیر و سلطاں کے

یہ عصا شاہی اور زرّیں تاج ہونگے پیوندِ خاک کل یا آج
اک نہ اک دن گیا ہی سمجھو راج

نہ ملی موت سے کسی کو پناہ نہیں اس سے نجات کی کوئی راہ
سب ہیں فانی سوائے ذاتِ اِلٰہ

گو وہ ذی مرتبت ہوں شاہنشاہ بینوا بیکسوں کی طرح تباہ
ہونگے دستِ اجل سے اِکدن آہ

زندگی اپنی کھونے والے ہیں ابدی نیند سونے والے ہیں
خاک کا ڈھیر ہونے والے ہیں

منتظر اُن کی ہے زمینِ قبور جانے والے ہیں اس جہاں سے ضرور

موت سے آہ وہ بھی ہیں مجبور!

وہ بہادر سپاہی جانباز جس پہ میدانِ جنگ کو تھا ناز
کام جس کے ہیں آج تک ممتاز

وہ صفِ کارزار کے ضیغام تیغ تھی جن کی تیغ خوں آشام
جن کے تاریخ میں ہیں روشن نام

تزک و احتشام سے جا کر اور اپنے غنیم پر چھا کر
آ گئے فتح اور ظفر پا کر

تھیں جو ممتاز خدمتیں اُن کی عزت افزائی اُن کی خوب ہوئی
پائے انعام اور تمغے بھی

وہ دلاور، وہ سورما، وہ جواں جن کے آگے تھی ہیچ قیمتِ جاں
بگنا ہوں کا خون بھی ارزاں

جو تھے ممتاز جنگ کے فن میں بڑھ کے گھمسان کے ہر اک رن میں
کر گئے وہ جو آ گیا من میں

تیغ کے گھاٹ اسے اُتار دیا ایک حملے میں اُس کو مار دیا
دن اسی کام میں گزار دیا

جن کی تلواریں آخری دم تک برق آسا دکھا رہی تھیں چمک
نہ کھٹک دل میں تھی نہ کوئی جھجک

موت کے چنگلوں سے اُن کو بھی نہ رہائی دلا سکیں محوی
تیغ نبرد آزمائیاں اُن کی

آخر کار آ گئی وہ گھڑی موت کے آستاں پہ اُن کو بھی
آہ کرنی پڑی جبیں سائی

دیکھو دیکھو وہ اُن کے ہی لاشے آج ہیں خون و خاک میں لتھڑے
رونے والے کہاں گئے اُن کے

جو نمایاں کئے اُنھوں نے کام جب سر انجام پا چکے وہ تمام
تو ملا اُس کا یہ انھیں انعام

فتح و نصرت کے تازہ پھولوں کا ایک سہرا ہر اک کے سر پہ بندھا
کہ رہے یادگار نام وفا

آہ وُہ دن بہار دکھلا کر رہ گئے ہیں وہ پھول کملا کر
خاک میں مل رہے ہیں مرجھا کر

رفتہ رفتہ بعینہ یوں ہی اُن کے اس آفتاب شہرت کی
ہو رہی ہیں تجلّیاں پھیکی

ہونے والا ہے ایک دن یہ غروب بھول جائیں گے ان کو سب کے قلوب
ہے زمانے کا بس یہی اسلوب

اس لئے اپنے کارناموں پر جو ہیں جان بہادری یکسر
بھول کر تو غرور فخر نہ کر!

موت کے بعد سب یہ اے پیارے! محو ہو جاتے ہیں ہر اک دل سے
نام لیتا نہیں کوئی ان کے

رکھتے ہیں زندہ، اے فنا انجام بعد مرنے کے آدمی کا نام
نیکیاں اور منصفانہ کام

نیکیاں ہیں اگر طبیعت میں ہیں معاون وہی حقیقت میں
آدمی کے حصول شہرت میں

وہ معطر مشام جاں سب کے کرتی رہتی ہیں اپنی خوشبو سے
تا ابد جیسے تازہ تر غنچے

(ترجمہ)

ملازمت

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

مانگی ہے بھیک برسوں نواح کنشت میں جب آئی ہے کہیں یہ غلامی سرشت میں
طوقِ ملازمت رہے گردن میں تا حیات غلماں بنوں جو جاؤں خدایا بہشت میں

علمی خبریں اور نوٹ

۱۹۳۲ء کی آخری سہ ماہی میں صوبہ متحدہ میں مختلف زبانوں کے جس قدر رسالے اور کتب شائع ہوئے اُن کی تعداد حسب ذیل ہے:-

انگریزی	۸۲	سنسکرت	۱۵	عربی	۱	فارسی	۶
نیپالی	۵	مرہٹی	۱	بنگالی	۲	اُردو	۱۵۲
		ہندی	۵۰۱	مخلوط	۸۸		

ان مطبوعات میں تقریباً نوے فیصدی درسی کتابیں ہیں، مخلوط قسم میں وہ کتابیں داخل ہیں جو ایک سے زیادہ زبانوں میں ہیں، جیسے ڈکشنریاں، شرحیں، تفسیریں، ترجمے مع متن، ترجمے کی کتابیں وغیرہ۔ ان اعداد و شمار سے ناظرین کرام پر روشن ہوگیا ہوگا کہ فی زمانہ ہندی زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے۔ اُردو کتابوں کی تعداد کی کمی قدر دانان کے لئے غور طلب ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک کی مردم شماری کے نقشوں سے خواندہ اور ناخواندہ آبادی کا جو تناسب معلوم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

ملک	ناخواندوں کی تعداد فیصدی	ملک	ناخواندوں کی تعداد فیصدی	ملک	ناخواندوں کی تعداد فیصدی
ہندوستان	۹۱ ″	پرتگال	۶۵ ″	ہسپانیہ	۴۲ ″
اطالیہ	۲۷ ″	امریکہ	۶ ″	انگلستان	۶ ″
فرانس	۴½ ″	جرمنی	۲½ ″		

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ علمی ترقی کے لحاظ سے ہمارا ملک دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں کس قدر پیچھے ہے۔ آخر اسکا کیا سبب ہے؟ بہی خواہانِ وطن غور فرمائیں اور اس جہالت کے رفع کرنیکی معقول تدابیر سوچیں۔

ہمارے لئے یہ خبر دل خوش کن ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں شہر جنیوا کے قریب سلیوا نامی پہاڑ پر ایک ہندو کرڈرتی مسٹر ودیتا نامی اور ان کی امریکن بیوی مسز دیکیں ۱۲½ لاکھ پونڈ کے صرف کثیر سے ایک رصدگاہ تعمیر کرا رہے ہیں جو گورنمنٹ

فرانس کو نذر کی جائیگی، اس رصدگاہ میں ۱۰۰ انچ قطر کی ایک منظور بین نصب کیجائیگی، دنیا کی کسی دوسری رصدگاہ میں اتنی بڑی خوردبین نہیں ہے۔ اس رصدگاہ کی بلندی ۴ہزار فٹ ہوگی منظور بین کے علاوہ اس میں فلکیات کے متعلق اور بھی بہت سے قیمتی آلات رکھے جائیں گے۔

انگریزی کی مشہور ترین ڈکشنری جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۸۵۸ء سے تیار ہو رہی ہے اسمیں کل نوہزار صفحات اور چار لاکھ الفاظ ہیں۔ الفاظ کے معانی کی تشریح کے ساتھ لطور ثبوت ۱۸۴۴۶۵۰۰ سندیں اساتذہ کے کلام سے پیش کی گئی ہیں۔

رنگپور سے عبداللہ یوسف علی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ ان کو غالب مرحوم کی قلمی بیاض کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جس پر خود غالب کے دستخط موجود ہیں۔

اس وقت دنیا میں تین ہزار چار سو چوبیس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں الفاظ کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

انگریزی	۴ لاکھ ۳۰ ہزار	روسی	ایک لاکھ ۴۰ ہزار
جرمن	ایک لاکھ ۴۰ ہزار	ہسپانوی	ایک لاکھ ۲۰ ہزار
فرانسیسی	۳ لاکھ ۱۰ ہزار	اطالوی	ایک لاکھ ۴۰ ہزار

مشرقی زبانوں میں سب سے وسیع زبان چینی ہے، اس کے بعد اردو اور اسکے بعد عربی کا نمبر آتا ہے۔ عربی بولنے والوں کی تعداد پانچ کروڑ ہے۔

مغربی زبانوں میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، دوسرا نمبر جرمن کا بعدازاں علی الترتیب فرانسیسی، ہسپانوی و پرتگیزی زبانیں ہیں۔

یورپ کے ماہرین السنہ مدت سے اس فکر میں ہیں کہ تمام دنیا کیلئے ایک ایسی مشترکہ زبان ایجاد کیجائے جو مختلف اقوام کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن سکے چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر ایک زبان اسپرانٹو کے نام سے ایجاد کیگئی تھی لیکن وہ بین الاقوامی دنیا میں مقبول نہ ہوئی۔ اب آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اگر انگریزی زبان کو نحوی پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے تو باسانی تمام دنیا کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے پروفیسر صاحب کی تجویز یہ ہے کہ انگریزی زبان میں صرف ساڑھے آٹھ سو الفاظ رکھے جائیں تاکہ ہر شخص انھیں باسانی یاد کر

زہریلے کیڑوں کے کاٹنے اور ڈنک مارنے سے جو تکلیف اور خطرہ پیدا ہوجاتا ہے
اسے جڑی بوٹیوں کا حیرت انگیز مرہم زمبک بہت جلد دفع کردیتا ہے
مچھروں، چیونٹیوں، مکڑیوں، بچھوؤں وغیرہ کے کاٹنے پر زمبک لگا دیجئے فوراً آرام ہوجائیگا
یہ عجیب وغریب مرہم آپ کی جلد کو متعدی امراض کے خطرہ سے محفوظ رکھے گا۔ درد وتکلیف
جادو کی طرح اڑا دیتا ہے۔ زمبک ورم یا جلد کا رنگ تبدیل ہونے نہیں دیتا۔ یہ گوشت سے
تمام زہریلا مادہ خارج کرکے نئی کھال پیدا کردیتا ہے۔
جلسنے والی گرمی اور دھوپ۔ ملبن دار خارش۔ جلے کٹے زخموں، خراشوں، اگزیما
پھوڑوں، پھنسیوں، زہرباد، داد۔ کمزوری ٹانگوں، پاؤں کے آبلوں، سر کے گنج اور
بواسیر وغیرہ کا نہایت طاقتور اور مؤثر علاج زمبک ہے
زمبک کو ماہر فن دوا ساز کمیاب اور بیش قیمت بوٹیوں کے تیل سے سائنٹیفک طور پر
تیار کرتے ہیں۔ ہاتھ سے کبھی نہیں چھوا جاتا۔
تمام دوا فروش زمبک کی ڈبیہ ۱۰؍ اور ۱۲؍ کے حساب سے فروخت کرتے ہیں
میسرز اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کو لیمیٹیڈ انٹالی کلکتہ۔
حیوانی چربی سے پاک ہونے کی گارنٹی کیجاتی ہے
Zam-Buk
زمبک

جملہ حقوق محفوظ ہیں

زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم بی۔ اے

جلد ۶۰	مئی ۱۹۳۳ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی پرچہ ۸ آنہ
قیمت سالانہ ممالک غیر سے سالانہ ... شلنگ

قیمت سالانہ
ہندوستان کے لئے ... ششماہی ...

زمانہ

جلد ۶۰   مئی ۱۹۳۳ء   نمبر ۱

آئرلینڈ

(از بابو انت پرشاد نگم بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

قدیم آئرلینڈ آئرلینڈ کا رقبہ بتیس ہزار مربع میل سے کچھ کم ہے۔ اس لحاظ سے بمقابلہ سلطنت برطانیہ اس کی حیثیت سمندر میں ایک قطرے سے زیادہ نہیں۔ لیکن آئرلینڈ کی پولیٹکل تاریخ دنیا کی پست قوموں کے لئے ہمیشہ سبق آموز رہیگی اور ان کے دلوں میں معراج ترقی پر پہونچنے کے لئے ہمت و حوصلہ پیدا کرتی رہیگی۔ آئرلینڈ کی تہذیب قدیم ہے۔ سن عیسوی سے صدہا برس قبل اسمیں باقاعدہ حکومت تھی۔ کیلٹ قوم جو اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کی قدیم باشندہ تھی اسی کا ایک فرقہ جو گیل کے نام سے موسوم تھا آئرلینڈ میں آباد تھا۔ مختلف حصوں میں جو قبائل آباد تھے۔ ان کے سرداران حصوں پر حکومت کرتے تھے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہی نہیں بلکہ اکثر باہم برسرپیکار رہتے تھے مگر رعایا خوشحال تھی۔ کسی غیر ملکی قوت کے جبر و تشدد کا امکان ہی نہ تھا۔

انگریزی حکومت کی ابتدا ۱۱۷۰ء میں انگریزوں کی پہلی فوج کشی ہوئی جو آئرلینڈ کے دو سرداروں کی باہمی نااتفاقیوں کا نتیجہ تھی۔ بہرحال شہر ڈبلن کے گرد و نواح میں انگریزوں کے قدم مستقل طور سے جم گئے۔ یہ خطہ پیل کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں انگریزی قوانین نافذ ہوتے گئے اور انگریزی طرز حکومت کا اثر جمنے لگا۔ ۱۲۹۵ء میں یہاں ایک پارلیمنٹ بھی قائم کر دی گئی۔

جو انگریز پیل میں آباد ہوتے تھے وہ آئرلینڈ کے باشندوں سے ازدواج اور رابطۂ اتحاد قائم کرتے جاتے تھے۔ اس خلط ملط کا یہ نتیجہ ہونے لگا کہ پیل میں انگریزوں کی آبادی آئرش جذبات سے متاثر ہونے لگی۔ یہ لوگ آئرش زبان بولتے، آئرش پوشاک پہنتے اور گیل کے رسوم و رواج عمل میں لاتے تھے۔ انگریزی حکومت نے جب یہ دیکھا کہ فاتح قوم آئرلینڈ کی مفتوح قوم میں جذب ہوتی جارہی ہے اور کوئی امتیاز دونوں میں باقی نہیں رہتا۔ تو سنہ ۱۳۶۶ء میں ایک قانون نافذ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ انگریزوں کے لئے آئرلینڈ والوں سے ازدواج کرنا، اُن کی زبان بولنا یا پوشاک پہننا جرم ہے۔

آئرلینڈ کو انگریزی حکومت کا دست نگر بنانے کے لئے سنہ ۱۴۹۴ء میں یہ قانون پاس ہوا کہ تمام انگریزی قوانین آئرلینڈ پر حاوی ہونگے، اور آئرش پارلیمنٹ میں کوئی قانون بلا منظوری شاہ انگلستان پیش نہ ہوسکے گا۔ سنہ ۱۷۲۰ء میں یہ بھی قانون پاس کردیا گیا کہ انگریزی پارلیمنٹ کو آئرلینڈ کے متعلق جملہ قوانین کے پاس کرنیکا حق ہے۔ آئرلینڈ کے انتظامی اختیارات ایک وائسرائے کے سپرد کردیے گئے جو آئرش پارلیمنٹ کے سامنے نہیں بلکہ شاہ انگلستان کے سامنے جوابدہ تھا۔ اس طرح آئینی طور سے آئرلینڈ سلطنت برطانیہ کا جزو بن گیا جس کے اوپر حکومت کرنیکا پورا اختیار برطانوی پارلیمنٹ کو تھا۔ لیکن واقعی طور پر پیل کے باہر اب بھی آئرش لوگوں ہی کی حکومت تھی۔

السٹر اسی دوران میں آئرلینڈ کی پولیٹیکل فضا میں انتہائی اثر ڈالنے والے مسئلہ کی بنیاد پڑ رہی تھی ہنری ہشتم شاہ انگلستان کے عہد حکومت (سنہ ۱۵۰۹ء تا ۱۵۴۷ء) میں انگلستان نے پوپ سے رشتہ توڑ کر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا۔ لیکن آئرلینڈ قدیمی کیتھولک مذہب پر ثابت قدم رہا۔ جو کشمکش یورپ میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مذہب کی بنا پر ہوئی ہے اُس نے یورپ کی پالیٹکس میں کس قدر انقلابات پیدا کئے اس کا اندازہ یوروپین اقوام کی تاریخوں کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس مذہبی اختلاف میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی پولیٹیکل کشمکش کا سامان بھی موجود تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے شمالی آئرلینڈ کو مغلوب کرنا شروع کردیا۔ ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ میں انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ سے جا جاکر لوگ آئرلینڈ میں آباد ہونے لگے جیمس اول کے زمانہ میں یہ سلسلہ زیادہ تیز ہوا۔ آئرلینڈ کے شرفاء اور امراء شاہ انگلستان کے تشدد سے تنگ آ آکر براعظم کو بھاگنے لگے اور اُنکی جاگیریں ضبط ہو ہو کر انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ سے آئے ہوئے پروٹسٹنٹوں کو دی جانے لگیں۔ یہ لوگ وہاں مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ اس طرح شمالی آئرلینڈ میں ایک صوبہ ایسا بن گیا جسمیں رئیس اور زمیندار طبقہ زیادہ تر پروٹسٹنٹوں کا ہوگیا اور متوسط طبقہ کے لوگ بھی جو اپنے ہمسایوں اور رئیسوں کے ظلم نہ برداشت کرسکتے تھے رفتہ رفتہ جنوب کی طرف رجعت کرتے گئے۔ اور شمالی آئرلینڈ

کا یہ صوبہ السٹر کے نام سے ہمیشہ کے لئے ایک خار بنکر کھڑا ہوگیا۔ انگریزوں کے اس برتاؤ سے آئرش قوم کے دلوں میں انتقام کے جذبات پیدا کردیئے۔ اُن کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت بھر گئی۔ چارلس اول کے زمانہ میں جبکہ پارلیمنٹ اور بادشاہ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی آئرلینڈ نے بھی موقع غنیمت جانکر انگریزوں کے خلاف جہاد برپا کردیا۔ سیکڑوں انگریز تہ تیغ ہوئے۔ اور شہر ڈبلن کے علاوہ قریب قریب تمام آئرلینڈ میں انگریزی حکومت کو سخت نقصان پہونچا۔ جب کرامویل کا عروج ہوا وہ اس جرم کی سزا دینے کیلئے آئرلینڈ پہونچا اور وہاں اس سختی سے پیش آیا کہ آئرلینڈ والے اس کو آج تک بھول نہ سکے ہونگے۔ ایک قتل عام سا جاری کردیا گیا۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ وسیع جاگیریں مقامی زمینداروں سے چھین چھین کر انگریزی فوجی سرداروں کو دیدی گئیں۔ ان مصیبت زدہ لوگوں کو اپنا وطن چھوڑ دینا پڑا۔ اکثر امریکہ بھاگ گئے، کچھ مغرب کی طرف بڑھکر صوبہ کناٹ میں آباد ہوگئے۔ کاشتکاروں کو اپنے نئے زمینداروں کے جبر و تشدد کا سامنا کرنا پڑتا۔ غرضکہ ہر طبقہ پریشان تھا۔

گو آئرلینڈ عہد کرامویل کے بعد سر اُٹھانے کی ہمت نہ کرسکتا تھا لیکن بعد میں شاہان انگلستان کا کارویہ بہتر ہونے لگا۔ اس کی وجہ آئرلینڈ میں پروٹسٹنٹوں کی موجودگی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۷۲۰ع کے قانون سے انگریزی پارلیمنٹ نے اپنے لئے آئرلینڈ کے متعلق تمام اختیارات لیلئے تھے۔ لیکن اب انگریزی حکومت نے اپنے زاویۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرلی اور ۱۷۸۲ع میں آئرلینڈ کی پارلیمنٹ کو حسب مرضی قوانین بنانے کا اختیار دیدیا۔ مگر چونکہ وائسرائے اب بھی انگریزی کابینہ کا ممبر ہوتا تھا اس لئے عملی حکومت میں اس نئے قانون کا کوئی نمایاں اثر نہ ہوا۔ لیکن اصولاً ۱۷۸۲ع کا قانون آئرلینڈ کی پولیٹکل تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔

انگلینڈ اور آئرلینڈ کا اتحاد انقلاب فرانس نے مثل دیگر ممالک کے آئرلینڈ میں بھی مساوات اور آزادی کی روح پھونک دی۔ آزادی کی اس اُمنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۹۸ع میں ایک بار پھر بغاوت ہوگئی۔ اس ناکامیاب بغاوت کا یہ نتیجہ ہوا کہ انگریزی پارلیمنٹ نے ۱۸۰۰ع میں ایکٹ آف یونین پاس کیا۔ جزائر برطانیہ اور آئرلینڈ ایک متحدہ سلطنت ہوگئے۔ آئرش پارلیمنٹ توڑدی گئی، اور انگریزی دارالعوام میں سو ممبر اور دارالامرا میں اٹھائیس ممبر آئرلینڈ سے منتخب ہونا قرار پایا۔ غرضکہ آئرلینڈ اب پورے طور پر برطانیہ کا محتاج ہوگیا، صرف اس قدر اطمینان تھا کہ چند نمایندے اس کے بھی اس مجلس میں موجود رہا کریں گے جو حکومت کی پالیسی وضع کرینگی۔

مصائب کا زمانہ اس اتحاد کے مصر اثرات ظاہر ہونے لگے۔ دس آمد پر جو محاصل آئرش پارلیمنٹ نے عائد

کر رکھے تھے فری ٹریڈ کے اصولوں کا شکار ہوئے۔ آئرلینڈ کے بازاروں میں انگریزی مال آ کر فروخت ہونے لگا اور آئرش صنعت و حرفت کا نام و نشان مٹنے لگا۔ آئرلینڈ بھی ہندوستان کی طرح انگلینڈ کے تجار اور صناعوں کے لئے ایک مفید بازار بن گیا۔ آئرلینڈ والوں کی روزی کے ذرائع مفقود ہونے لگے۔ غریبوں کے لئے سوائے زمین کی پیداوار کے کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ امیروں کے لئے سوائے لگان کے کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ غذا کافی مقدار میں نہ ملتی تھی ۱۸۴۵ء کے اس قحط نے جو آلو کی فصل پر نازل ہوا آئرلینڈ کو تباہ کر دیا۔ آلو یہاں کی خاص پیداوار ہی نہیں بلکہ عوام کی خوراک کا ایک اہم جزو ہے۔ اس قحط کا شکار ہو کر لاکھوں آدمی مرگئے۔ اور ایک کثیر تعداد نے امریکہ میں پناہ لی۔ جو لوگ امریکہ گئے تھے ان کے سینہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور غصہ تھا۔ انگریزی سلطنت کا جھنڈا اُن کے دلوں میں غم و غصہ کا طوفان پیدا کرتا تھا۔ جو لوگ آئرلینڈ میں رہ گئے اُن کی قسمت کا خدا ہی مالک تھا۔ پروٹسٹنٹ رؤسا ان کو اپنے کھیتوں سے بیدھڑک بیدخل کر دیتے تھے۔ پارلیمنٹری انتخاب کے موقعوں پر سوائے اسکے کہ پروٹسٹنٹ زمینداروں کے حق میں ووٹ دیں اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کیتھولک والوں میں سے نہ کوئی پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا تھا نہ کوئی جج کی کرسی پر متمکن ہو سکتا تھا۔ میونسپلٹی کی ممبری تک ان کے لئے ممنوع تھی۔ غرضیکہ یہ جماعت اپنے ہی ملک میں ایک کمتر اور بے عزت جماعت بن گئی۔

آئینی جدوجہد کی ابتدا | بالآخر وطن پرستی اور خودداری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اہل دل ملکی ترقی کی تدابیر سوچنے لگے، اور رفتہ رفتہ یہ جدوجہد زمیندار اور کاشتکاروں کی کشمکش کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ کاشتکاروں کا طبقہ اور ان کے معاونین قوانین اراضی میں اصلاحات کا مطالبہ کرنے لگے کاشت کی مقررہ میعاد لگان میں غیر مناسب اضافہ کی موقوفی اور کاشتکاروں کو اپنی کاشت کے منتقل کرنے کا حق' ان کے مطالبات تھے۔ ان مطالبات میں برطانوی گورنمنٹ کی مخالفت کی جھلک تھی، اور اس جدوجہد کا پہلا رہنما ڈانیل او کانیل تھا۔ پارلیمنٹ میں اس نے ایک ہوم رول پارٹی بنائی جس کا نصب العین آئینی جدوجہد تھا۔ پارلیمنٹ کے پلیٹ فارم سے آئرش اصلاحات کا حاصل کرنا اس کا مدعا تھا۔ آئزک بٹ بھی اس پارٹی کا ایک سرغنہ تھا جس نے ۱۸۷۰ء میں آئرش ہوم رول بل پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا لیکن جب رائے لینے کا موقعہ آیا تب اس بل کی تائید میں تمام دارالعوام میں صرف آٹھ ممبروں نے ہاتھ اُٹھایا۔ چارلس اسٹوارٹ پارنل اس پارٹی کا مشہور لیڈر گذرا ہے۔ اسکی پارلیمنٹری قابلیت نے انگریزی مدبرین سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ اس نے پارلیمنٹ کے کام میں دقتیں پیدا کر کے اصلاحات حاصل کرنا اپنا نصب العین

قرار دیا۔ آئرش ممبروں کی وہ پارٹی جو اس کے ساتھ تھی ہمیشہ اس کے ساتھ ووٹ دیتی اور اس کی انگلی کے اشاروں پر کام کرتی تھی۔ چنانچہ اس پارٹی نے انگریزی پالیٹکس میں بھی ایک خاص اہمیت حاصل کرلی۔ لبرل اور کنسرویٹو جماعت خود اپنی ہستی کے لئے اس پارٹی کا سہارا ڈھونڈھنے لگے۔ جس جماعت کو یہ پارٹی مدد دیتی اسی کی کثرت ہونے کی وجہ سے حکومت کی باگ پر قبضہ کرسکتی تھی۔ اور اس امداد کے صلہ میں آئرلینڈ کے جذبات کے ساتھ رواداری کا سلوک اپنا فرض سمجھتی تھی۔ پارلیمنٹری پارٹی کا یہ حال تھا مگر اس کے علاوہ بھی لوگ تھے جو انگلینڈ سے بزور شمشیر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ تھے۔ فینین سوسائٹی اس آخرالذکر جماعت کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اسی کی ایک شاخ امریکہ میں بھی قائم تھی جہاں کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایک کثیر تعداد آئرلینڈ والوں کی آباد ہوچکی تھی جو برطانوی حکومت سے انتہائی نفرت رکھتے تھے۔ اس جماعت کا مقولہ تھا کہ انگریزوں کو کوئی دلیل بجز قوت کی دلیل کے اپیل نہیں کرتی۔ اور آئرلینڈ کو اپنے حصول مقاصد کے لئے انگلینڈ کی مشکلات کا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس جماعت نے چند ناکام کوششیں کیں۔ بالآخر ۱۸۷۹ء میں مائیکل ڈیویٹ نے ایک لینڈ لیگ قائم کی جس کی رہنمائی بالآخر پارنل نے قبول کرلی۔ آئرلینڈ میں اراضی کے قوانین و قواعد کی اصلاح اس لیگ کا مقصد تھا۔ اور جو لوگ اس لیگ کے بنائے ہوئے پروگرام کو نہ مانتے ان سے قطع تعلق کر لیا جاتا۔ لوگ اس کو ہر قسم کی مدد دینے سے گریز کرتے۔ اس کی ملازمت ترک کردیتے، اس کا کوئی کام مثلاً کاشتکاری اور معمولی خدمتگاری وغیرہ انجام پانا غیر ممکن ہوجاتا۔ سب سے پہلا شخص جو اس لیگ کے حملوں کا شکار ہوا کیپٹن بائکاٹ تھا۔ لیگ کے حکم کے مطابق یہ شخص کاشتکاروں کے لگان میں کمی کرنے پر تیار نہ ہوا لیگ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ملازموں نے ملازمت چھوڑ دی، وارنٹ قرقی کی تعمیل کے لئے پیر اسی میسر نہ ہوئے۔ کھیتوں کی فصل کاٹنے والے دستیاب نہ ہوئے، غلہ گھر تک لانا محال ہوگیا۔ بالآخر حضرت بائکاٹ کو اپنا نام ایک بڑی پولیٹیکل تحریک کو ہمیشہ کے لئے دیکر بھاگتے ہی بن پڑا۔ اس پولیٹیکل طرز عمل کا نام "بائیکاٹ" آپ ہی کی ذات کا نتیجہ ہے۔ اس لیگ کے کارنامے رفتہ رفتہ پریشان کن ثابت ہونے لگے اور گورنمنٹ نے ایسے اختیارات حاصل کئے کہ بلا مقدمہ چلائے کسی شخص کو گرفتار کرلے اور کسی مدت تک مقید رکھے۔ پارنل اور دیگر بہت سے لوگ گرفتار کئے گئے اور لینڈ لیگ کا خاتمہ کردیا گیا لیکن باوجود اس تشدد آمیز پالیسی کے جدوجہد بند نہیں ہوئی۔ بالآخر پارنل اور گورنمنٹ کے درمیان اس شرط پر صلح ہوئی کہ پارنل اور اُن کے ڈو رفیق رہا کر دیئے جائیں اور گورنمنٹ کے بقایا لگان کے مسئلہ کا مناسب حل تجویز کرنے پر یہ لوگ عدم ادائی لگان کی جدوجہد بند کردیں۔

پارنل اس دوران میں اپنے ایک دوست کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات کے سلسلہ میں بہت بدنام ہوا اور اس کی پولیٹیکل لیڈری ماند پڑ گئی۔ پارنل نے ۱۸۹۱ء میں وفات پائی، اور پارلیمنٹری جماعت کی آخری رہنمائی کا سہرا جان ریڈمنڈ کے سر باندھا گیا۔ لینڈ لیگ کو ختم کر دی گئی تھی، اور انتہا پسند جماعت کا ظاہرا جوش وخروش کسی قدر ٹھنڈا پڑتا معلوم ہوتا تھا لیکن اس سرگرم ایجی ٹیشن نے برطانوی مدبرین حکومت کے دلوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ چنانچہ مسٹر گلیڈ اسٹن وزیر اعظم برطانیہ نے ۱۸۸۶ء میں ایک آئرش ہوم رول بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جس کا منشا آئرلینڈ میں پارلیمنٹ قائم کرنا تھا جس کے سامنے آئرلینڈ کی وزارت جوابدہ ہو، لیکن بیرونی محاصل کے عاید کرنے کا اختیار حکومت برطانیہ کو تھا۔ انگلستان میں اس بل کی حمایت کی فضا پیدا نہیں ہوتی تھی۔ السٹر نے بھی اس کی مخالفت کی اور بل پاس نہ ہو سکا۔ گلیڈ اسٹن کی وزارت بھی ختم ہو گئی۔ جب جدید انتخاب پر گلیڈ اسٹن پھر وزیر اعظم مقرر ہوئے انھوں نے دوبارہ آئرش ہوم رول بل پیش کیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ آئرلینڈ کو برطانوی دارالعوام میں بھی نمائندگی دی گئی۔ لیکن آئرلینڈ کے نمایندوں کو دارالعوام میں صرف انھیں مسائل پر ووٹ دینے کا حق تھا جو آئرلینڈ کے متعلق ہوں۔ دارالعوام سے یہ بل پاس ہو گیا لیکن دارالامرا نے نامنظور کر دیا۔

۱۹۱۱ء میں دارالامرا کے اختیارات میں کمی ہو گئی۔ اب بلا لحاظ دارالامرا کی رائے کے اگر تین متواتر اجلاسوں میں کوئی قانون دارالعوام پاس کر دے تو وہ نفاذ پا سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں آئرش ہوم رول بل تیسری مرتبہ پارلیمنٹ میں پیش ہو کر منظور ہوا اور آخری مرتبہ ستمبر ۱۹۱۴ء میں دارالعوام سے منظور ہو کر اس نے قانون کی حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن اسی سال عالمگیر جنگ یورپ کی ابتدا ہو جانے کی وجہ سے۔ نیز السٹر کی پرزور مخالفت کی وجہ سے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اسکا نفاذ جنگ کے خاتمہ تک روک دیا جائے۔

انتہا پسند پارٹی پارلیمنٹری پلیٹ فارم پر آئرلینڈ کیلئے اصلاحات کا مختصر نقشہ اوپر لکھے ہوئے مضمون سے ظاہر ہے۔ لیکن دوسری پارٹی خاموش نہ تھی جس کا مقولہ تھا کہ انگلینڈ کو معقول کرنے کے لئے قوت کی دلیل بہترین ہوا کرتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وسط انیسویں صدی ہی میں فینین سوسائٹی قائم ہو چکی تھی اس کے ارکان یکے بعد دیگرے جیل خانوں کی سیر کرتے تھے۔ جو رہ جاتے وہ اپنا کام چھپ چھپ کر کرتے اور نوجوانوں میں حمیت قومی اور حب وطن کا جوش پیدا کرتے رہتے تھے۔ آرتھر گرفتھ اس جماعت کا سرگرم رکن تھا۔ وہ انجمن "گیلک لیگ" کا ممبر ہوا جس کا

جس کا منشا یہ تھا کہ آئرلینڈ کی مادری زبان کو ترقی دی جائے "کیلٹک لٹریری سوسائٹی" کا بھی وہ سرگرم رکن تھا۔ "آئرش ریپبلکن برادرہڈ" بھی جس کا منشا آئرلینڈ میں جمہوری حکومت قائم کرنا تھا ایک با اثر جماعت تھی اور آرتھر گرفتھ اس کا بھی سرگرم ممبر تھا گرفتھ نے ۱۹۰۱ء میں ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ اور ریپبلکن برادرہوڈ سے مستعفی ہو کر اپنا نصب العین یہ قرار دیا کہ انگلستان اور آئرلینڈ دونوں کی علحدہ علحدہ پارلیمنٹیں ہوں اور تاج برطانیہ کے ماتحت دونوں ملک مساوی الاختیار ہوں۔ اس قسم کی آزادی حاصل کرنے کیلئے جو طریقہ اس نے بتلایا تھا وہ وہی تھا جس پر بعد میں آئرلینڈ نے عمل کر کے آزادی حاصل کی۔ گرفتھ نے اس پالیسی کا اعلان اس سوسائٹی کے جلسہ میں کیا تھا جس کا نام "گیلیس کی سوسائٹی" تھا۔ لیکن جو نام عام طور پر اس سوسائٹی کا رائج ہوا وہ "شن فین" تھا۔ آئرلینڈ کی مادری زبان میں شن فین کے لفظی معنی ہیں "صرف ہمارے لئے"۔ گرفتھ کا مقولہ تھا کہ آئرلینڈ کو آزادی محض آئرلینڈ والوں کی متحدہ کوششوں سے مل سکتی ہے۔ یہ کوشش مخالفت مجہول کے طریقہ پر عمل میں آئیگی۔ محاصل اور لگان کا دینا بند کیا جائے۔ انتظامات حکومت رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ میں لے لیے جائیں۔ حکومت کی مشین سے نہ صرف کام نہ لیا جاوے بلکہ اس کو بیکار کر دیا جائے۔ گرفتھ گو اسلحہ کے استعمال کے خلاف نہ تھا لیکن وہ اسے عملی پالیٹکس کے دائرہ سے باہر سمجھتا تھا۔ اس جماعت کا دوسرا سرگرم ممبر ٹامس کلارک تھا جو فینین ہونے کے جرم میں بیس سال کی قید سخت کاٹ کر ۱۹۰۷ء میں رہا ہوا تھا۔ اس نے ڈبلن میں ایک دوکان کر لی تھی لیکن اس کے دل میں وطنیت کا جوش لہریں مارتا تھا۔ نوجوان لوگ اس کے گرد و پیش جمع ہوتے اور وہ ان کو وطن پر مٹنے کی تلقین کرتا تھا۔ میکڈرماٹ بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دورہ لگاتا اور قومی لڑائی کے لئے والنٹیر بھرتی کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح اس جماعت کو دیگر مستعد اور سرگرم کارکنان کا فخر حاصل تھا جن میں خاص طور پر قابل ذکر جان میکنل جیمس لارکن اور جیمس کنولی ہیں ۱۹۱۲ء میں جب ہوم رول بل دارالعوام میں پیش تھا اس وقت آلسٹر کے صوبہ نے اس کی مخالفت میں اپنی آواز بلند کی۔ یہ صوبہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں زیادہ تر پروٹسٹنٹوں کا ہے اور اس میں رؤسا و امرا کی ہستی کی بنیاد آئرلینڈ کے قدیم امرا کی جائدادوں کی ضبطی پر قائم ہے۔ چنانچہ بقیہ آئرلینڈ سے اس کو کوئی ہمدردی نہیں ہے اور اس کو آئرلینڈ کے قومی لیڈروں کے زیر حکومت رہنا اسی قدر نفرت آمیز ہے جتنا کہ کسی دیگر قوم کے ماتحت ہو کر رہنا۔ غرضکہ ہوم رول بل ان کے لئے موت و زندگی کا سوال ہو گیا۔ ان کو انگریزی پارلیمنٹ کی حکومت پسند تھی لیکن ڈبلن پارلیمنٹ ان کے لئے حقارت آمیز تھی۔ انھوں نے ہوم رول بل کے خلاف ایک

زبردست ایجی ٹیشن کا آغاز سر ایڈورڈ کارسن کی رہنمائی میں کیا۔ اور یہاں تک دھمکی دی کہ جس وقت ڈبلن میں پارلیمنٹ قائم ہوگی اس روز سے شہنشاہ جارج ہمارے بادشاہ کہلانے کے مستحق نہ ہوں گے۔ آلسٹر والوں نے ہوم رول بل کی مخالفت میں والنٹیر بھرتی کرنے اور کھلم کھلا جنگ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آلسٹر کی روش نے فدایانِ وطن کی آنکھیں کھول دیں۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اگر پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے قانون کی مخالفت میں والنٹیر بھرتی کرنا اور اسلحہ فراہم کرنا جرم نہیں ہے تو اس کی حمایت میں ایسا کرنا کب ممنوع ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہوم رول ایکٹ کے تحفظ کے لئے اس جماعت نے بھی والنٹیر بھرتی کرنا شروع کر دئے۔ ہزاروں نوجوانوں نے اپنے نام درج کرائے۔ شن فین پارٹی کا ستارہ بلند ہونے لگا۔ گو بظاہر یہ بھی ہوم رول ایکٹ کی حمایت میں تھی لیکن حقیقتاً اس جماعت کے لئے یہ ایک موقع غنیمت تھا کہ وہ کھلے میدان میں آکر فوجی قواعد سیکھے اور آنے والی بغاوت کے لئے تیار ہو سکے۔

جان رڈمنڈ نے جو پارلیمنٹری پارٹی کا سرغنہ تھا۔ اِس جماعت میں اپنے لئے نمائندگی حاصل کر لی لیکن کارکن جماعت کی منظوری کے بغیر اس نے والنٹیروں کی جماعت کی طرف سے جنگ یورپ میں برطانیہ کی امداد کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ والنٹیروں کی جماعت دو پارٹیوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک ریڈمنڈ کی رہنمائی میں برطانیہ کی اعانت پر آمادہ تھی، دوسری انگلینڈ کی مشکلات سے اپنی مطلب برآری کرنا چاہتی تھی۔

۱۹۱۶ء کی بغاوت آلسٹر میں ۱۹۱۶ء میں والنٹیروں کی انتہا پسند پارٹی نے ایک شورش برپا کر دی جرمنی نے امداد کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جو جہاز اسلحہ سے بھر کر آئرلینڈ کی اعانت کے لئے وہاں سے بھیجا گیا تھا وہ گرفتار ہو گیا اور سر راجر کیسمنٹ کو جو اس کے انچارج تھے بالآخر پھانسی دی گئی۔ ٹامس کلارک میکڈرماٹ جیمس کنولی وغیرہ لیڈروں کو پھانسی دی گئی۔ مائیکل کالنس اور آرتھر گرفتہ قید خانہ میں ڈال دیے گئے۔ آئرلینڈ کے موجودہ رہنمائے قوم یعنی ڈی ویلیرا بھی باغی فوج کی رجمنٹ کے سرگروہ تھے۔ آپ کو سزائے موت دی گئی لیکن بعد میں یہ سزا قید میں تبدیل کر دی گئی۔ صدہا آدمی محض شک پر گرفتار کر کے جیل خانوں میں ڈال دیے گئے۔ مارشل لا جاری کر دیا گیا۔ اس وقت تک آئرلینڈ میں گو انگلینڈ سے نفرت بھری ہوئی تھی مگر ملک اس حد تک تیار نہ تھا کہ اس کے خلاف مسلح جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائے لیکن ۱۹۱۶ء کی بغاوت فرو کرنے میں جس سختی کا برتاؤ آئرلینڈ کے ساتھ کیا گیا۔ اس نے سلگتی ہوئی آگ کو ایک دم بھڑکا دیا جن گوشوں میں بغاوت کی گرد بھی نہ پہونچی تھی وہاں بھی ایسی فضا تیار ہو گئی جو

آنیوالے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

فوج میں بھرتی کا قانون جنگ یورپ سرگرمی کے ساتھ جاری تھی۔ حکومت برطانیہ کو ہر کس وناکس کی امداد کی ضرورت تھی، وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ رعایا کو رضامند رکھکر اس مہم میں زیادہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ جبر وتشدد سے کام لیا جائے۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں عام معافی کا اعلان کیا گیا اور قیدی چھوٹ چھوٹ کر اپنے وطن کو واپس آئے لیکن کچھ نئے جوش وخروش کے ساتھ جیل خانہ کی آب وہوا نے ان کے دلوں میں ایک تازہ جوش پیدا کر دیا تھا۔ ان کو اپنی طاقت پر پہلے سے کہیں زیادہ بھروسہ ہو گیا تھا۔ پارلیمنٹری پارٹی کا اثر زائل ہو چکا تھا، شن فین پارٹی اب اہل وطن میں ہر دلعزیز ہونے لگی تھی۔ گورنمنٹ کی فوج میں بھرتی کی پالیسی نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ فوجی بھرتی کا قانون آئرلینڈ پر بھی عاید کر دیا جائے۔ آئرلینڈ نے متفقہ آواز سے اس کی مخالفت کی۔ ڈبلن کے لارڈ میئر نے ایک کانفرنس کو مدعو کیا جسمیں آئرلینڈ کی تمام پولیٹیکل پارٹیوں نے حصہ لیا۔ ڈی ویلیرا نے بھی شن فین پارٹی کی حیثیت سے شرکت کی۔ آپ کی صفائے قلب، سچائی اور دانشمندی نے تمام کانفرنس پر ایک سکہ سا جما لیا۔ اہل وطن کے لئے ایک عہد نامہ دیا گیا جس کے الفاظ کی ترتیب مسٹر ڈی ویلیرا کی دی ہوئی تھی۔ یہ طے ہوا کہ آئندہ اتوار کے روز یہ عہدنامہ ہر گرجا گھر میں ہر شخص اپنی زبان سے دُہراوئے۔ پادریوں کے جلسہ نے بھی اس عہدنامہ کو منظور کر لیا، چنانچہ بھرتی کے قانون کی مخالفت آئرلینڈ کی تمام پارٹیوں کا نصب العین ہو گیا۔ بھرتی کے قانون کی مخالفت کے لیئے ملک اس قدر تیار تھا کہ جب فیلڈ مارشل فرنچ نے آئرلینڈ کے ایک ہوٹل میں کسی سے پوچھا کہ بھرتی کے بارے میں ملک کی کیا حالت ہے تو اس نے جواب دیا کہ "حضور، ہم لوگ ستر آدمی اس مکان میں ہیں۔ ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ایشور کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے، آپ ہماری لاشیں لے سکتے ہیں لیکن آپ ہم سے اور کوئی امید نہ رکھیں"۔

آخری جدوجہد خوش قسمتی سے ان واقعات کے دوران ہی میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا، اور سنہ ۱۹۱۸ء میں عام انتخابات ہونے لگے۔ شن فین پارٹی نے اپنے امیدوار اس الکشن میں کھڑے کیئے۔ اور انگلینڈ سے پوری علحدگی کے اعلان سے انھوں نے الکشن میں حصہ لیا۔ آئرلینڈ کی ایکسو چھ ۱۰۶ نشستوں میں سے تہتر ۷۳ ممبر شن فین جماعت کے منتخب ہوئے۔ اس پارٹی کی عام مقبولیت کا اندازہ الکشن کی اس کامیابی سے کیا جاسکتا ہے۔ ان تہتر ۷۳ ممبروں نے بجائے پارلیمنٹ میں شریک ہونے کے اپنی علحدہ پارلیمنٹ ڈیل کے نام سے منعقد کی اور بجائے ویسٹ منسٹر جانے کے شہر ڈبلن میں اس کا اجلاس منعقد کیا۔ ڈیل نے خود مختاری

کا اعلان کر دیا۔ وزرا منتخب کئے اور ایک باقاعدہ گورنمنٹ قائم کرلی۔ اس کے خفیہ اجلاس ہونے لگے جب ایک ممبر گرفتار ہو جاتا تو دوسرا اُس کی جگہ پر کام کرنے لگتا۔ ڈیل نے چار لاکھ پاؤنڈ کے قرضہ کا اعلان کیا، اور باوجود خلاف قانون قرار دیے جانے کے وہ قرضہ وصول ہو گیا۔ گورنمنٹ اپنی بھرپور کوشش ڈیل کو توڑنے اور اس کی کارروائیوں کو خاک میں ملانے کے لئے کرنے لگی۔ اور ڈیل اپنی ساری قوت صرف اپنی ہستی کو قائم کرنے میں نہیں بلکہ برطانوی قوت کی جڑ کاٹنے میں صرف کرنے لگی۔ گرفتھ اور کالنس کا قول تھا کہ انگریزی پولیس کے سپاہی برطانوی حکومت کے آنکھ اور کان ہیں، انھیں کے ذریعہ سے ہماری کارروائیوں کو وہ دیکھتے اور ہمارے حالات سنتے ہیں۔ چنانچہ اس کا خاتمہ کرنے سے حکومت کی مشین بیکار ہو جائیگی۔ قومی والنٹیر پولیس والوں کو چُن چُن کر نشانۂ اجل بنانے لگے۔ گورنمنٹ انتقام لینے کی غرض سے پولیس اور فوج سے نہ صرف والنٹیروں ہی پر بلکہ امن پسند باشندوں پر بے انتہا ظلم کراتی تھی۔ ایک باقاعدہ جنگ جاری ہو گئی۔ حکومت نے پولیس اور موجودہ فوج کو کافی نہ سمجھ کر جنگ یورپ سے واپس شدہ پنشن یافتہ سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد آئرلینڈ کو زیر کرنے کے لئے بھرتی کی۔ یہ لوگ اپنی پوشاک کے رنگ کی وجہ سے "بلیک اینڈ ٹینس" کہلاتے تھے۔ بے رحمی میں ان کا ہم پلہ ہونا ناممکن تھا۔ موقعہ و بے موقعہ امن پسند باشندوں کے مکانات پر چھاپہ مارتے اور بیگناہوں پر جبر و تشدد کرتے تھے۔ سیکڑوں آدمی ان کی گولیوں کا نشانہ ہو گئے۔ ہزاروں کے مال و اسباب لوٹ لئے گئے۔ مٹی کا تیل چھڑک کر مکانوں میں آگ لگا دیتے اور ان سے نکلتے ہوئے بچوں بڈھوں عورتوں کو جان بچانے کی غرض سے بھاگتے ہوئے دیکھکر قہقہے اڑاتے تھے۔ نہتے آدمی قتل کر دیے جاتے تھے، سر بازار کوڑے لگائے جاتے تھے مجمع پر گولی چلانا معمولی بات تھی۔ مگر وطن پرستوں نے بھی ایک بے مثل نظام قائم کیا تھا۔ حکومت کی کارروائیوں کو معلوم کرنے اور جوابی کارروائیوں کے اجراء اور سہولت کے لئے انھوں نے ایسی مکمل خفیہ پولیس بنائی تھی جس کے حسن انتظام نے سرکاری افسروں کو حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ جملہ سرکاری احکام کی ان کو اطلاع رہتی تھی، افسروں کے تبادلے، سرکاری فوج کی نقل و حرکت اور پولیس کی تمام بندشوں سے ان کو ایسی مکمل آگاہی ہوتی تھی کہ گویا سرکاری دفتر ان کے گھروں میں ہے۔ جب کسی فوج کے دستہ کی کسی خاص سڑک سے آنے کی خبر معلوم ہوتی تو فوراً سڑک کے پُل بارود سے اُڑا دیے جاتے اور راستے مسدود کر دیے جاتے۔ دن میں سرکاری مسلح لاریوں کا چلنا محال ہو گیا تھا۔ سرکاری افسروں کے لئے کھلی سڑکوں پر گذرنا خطرناک تھا۔ یہ کارگذاریاں تھیں ان فدائیان وطن کی جو اپنے آپ کو گولی اور جیل سے بچا سکتے تھے۔ مگر جیل جانے والوں میں بھی سیکڑوں ہزاروں

ہوئی تھے جن سب کا سرغنہ خود ڈی ویلیرا تھا جس وقت حکومت نے بھرتی کے قانون کی مخالفت پر تشدد کی پالیسی جاری کی سب سے پہلے ڈی ویلیرا، آرتھر گرفتھ اور پلنکٹ وغیرہ شن فین لیڈروں ہی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ ۱۹۱۸ء کے عام انتخابات کے بعد غیر قانونی ڈیل نے اپنے پہلے جلسہ منعقدہ ۲۱ جنوری ۱۹۱۹ء میں ڈی ویلیرا کو پریسیڈنٹ اور آرتھر گرفتھ کو وائس پریسیڈنٹ منتخب کیا حالانکہ یہ دونوں جیل میں قیدیوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ قیدیوں کی رہائی کے لئے سیکڑوں پبلک جلسے ہوئے لیکن گورنمنٹ ٹس سے مس نہ ہوئی، بالآخر ڈی ویلیرا کے ایما پر ایک ایسا پلاٹ تیار کیا گیا کہ ڈی ویلیرا ۳ فروری ۱۹۱۹ء کو جیل سے بھاگ نکلا۔ عمال حکومت نے لاکھ پتہ لگانے کی کوشش کی لیکن باوجود دنیا کی بہترین خفیہ پولیس رکھتے ہوئے ڈی ویلیرا کا سراغ نہ لگا سکے۔ اس دوران میں ڈی ویلیرا دیگر شن فین لیڈروں سے ملتا، ان کو مشورے دیتا تھا کہ امریکن اور فرانسیسی اخباروں کے نمایندوں سے ملاقات کرتا رہا۔ مگر کسی کو یہ خبر نہ ہوئی کہ ڈی ویلیرا کہاں ہے۔ چند روز کے بعد ہی جب حکومت نے دوسرے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا، تو ڈی ویلیرا کھلے میدان نکلنے اور پلیٹ فارموں پر تقریریں کرنے لگا۔ جب جنگ یورپ کے بعد صلح کانفرنس ہو رہی تھی تو ڈی ویلیرا اس کوشش میں تھا کہ آئرلینڈ کے خود مختار نمایندے اس میں شریک ہوں۔ طول طویل خط و کتابت ہوتی رہی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ جون ۱۹۱۹ء میں ڈی ویلیرا نے یک بیک آئرلینڈ سے غائب ہو کر ایک بار پھر عمال حکومت کو حیرت میں ڈال دیا۔ بالآخر جب امریکہ کے نیویارک شہر سے ڈی ویلیرا کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تب یہ گتھی کھلی۔ امریکہ میں ڈی ویلیرا نے آئرلینڈ کے لئے کثیر رقمیں جمع کیں اور صدہا تقریریں کر کے امریکن پبلک کو اپنے مشن کے محاسن کا یقین دلایا۔ جس زمانہ میں ڈی ویلیرا امریکہ میں تھا اس وقت آئرش پبلک پر سرکاری تشدد زوروں سے ہو رہا تھا کوئی متنفس گرفتاری اور جیل کے خوف سے مطمئن نہ ہو سکتا تھا۔ کارک کے لارڈ میئر ٹرنس میکسونی نے اپنی بیجا گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے جیل کے اندر فاقہ سے گھل گھل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ جس وقت میکسونی وطن کے لئے اس انتہائی قربانی میں مصروف تھا۔ عوام الناس کی نگاہیں ہر سمت سے اس جیل خانہ کی طرف پڑتیں، اور خدائے پاک کی طرف رجوع ہو کر آئرلینڈ کی آزادی کی ملتجی ہوتی تھیں۔ ڈی ویلیرا نے امریکہ سے جو پیغام اس بہادر فنافی القوم کے دلیرانہ فعل پر بھیجا تھا اس کے ایک فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈی ویلیرا کے دل میں آزادی وطن پر شہید ہونے کا کتنا گہرا جوش تھا۔

"ہم اپنے ملک کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں اور آپکا مرنا بیکار نہ ہونے دیں گے۔"

جب سختیاں حد سے تجاوز کرنے لگیں اور ڈی ویلرا نے دیکھا کہ اب ان کی موجودگی آئرلینڈ میں ضروری ہے۔ وہ اسی طور سے خفیہ آئرلینڈ واپس آیا جس طرح کہ وہاں سے نکلا تھا۔ اس کے پہلے برطانوی گورنمنٹ نے آئرلینڈ کو راضی کرنے کے لئے ۱۹۲۰ء کا ہوم رول ایکٹ بھی پاس کر دیا تھا جس کے بموجب السٹر کے چھ ضلعوں کی ایک پارلیمنٹ اور بقیہ آئرلینڈ کی دوسری پارلیمنٹ ہونا قرار پائی تھی۔ ہر دو پارلیمنٹوں سے منتخب ہو کر چالیس ممبروں کی ایک فیڈرل کونسل ان اختیارات کو عمل میں لا سکتی تھی جو دونوں پارلیمنٹیں باتفاق رائے اس کے سپرد کریں۔ مگر محکمہ افواج اور امورات خارجیہ اب بھی برطانوی گورنمنٹ ہی کے ہاتھ میں تھے۔ السٹر نے اس قانون کے مطابق عملدرآمد شروع کر دیا اور اپنی پارلیمنٹ بنالی لیکن جنوبی آئرلینڈ اب بھی اپنی ریپبلکن پارلیمنٹ ڈیل ہی کی حکومت کو مانتا رہا۔ ان باتوں نے برطانوی حکومت کو مزید سختی پر آمادہ کیا اور جو طریقے آئرش ڈیل کی کارروائیوں کے بند کرنے کے لئے اوپر بیان کئے گئے ہیں استعمال میں آتے رہے۔

"بلیک اینڈ ٹینس" کے سیاہ کارناموں نے بالآخر مہذب دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچنا شروع کی مختلف سوسائٹیوں، انجمنوں اور اخباروں کے نمائندے اور کمیشن آئرلینڈ کی اصلی حالت کی تحقیقات کرنے کے لئے جانے اور اپنے تجربات اور مشاہدات اخباروں میں شائع کرنے لگے۔ ان میں سے ایک کمیشن کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"برطانوی حکومت آئرلینڈ کی اسی فیصدی آبادی پر قائم نہیں ہے۔ ماڈریٹ لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی حفاظت ان کو حاصل ہے وہ شن فین کی پالیسی کی بدولت ہے۔ امن صرف ان علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں سے انگریزی فوج اور پولیس ہٹالی گئی ہے۔"

ان تحقیقاتی کمیٹیوں کی رائے میں آئرلینڈ میں حکومت کے کارنامے تہذیب کے دائرے سے گذر چکے تھے۔ اور شن فین کی طاقت کو توڑنا ایک امر محال ہو گیا تھا۔ ملک کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کمیشنوں کا بیان تھا کہ شن فین پارٹی کا اثر زائل کرنے کے لئے صرف ایک ہی ترکیب ممکن ہے کہ ملک بھر میں قتل عام کا حکم دیدیا جائے۔ جب مہذب دنیا کے سامنے انگلینڈ کے کارنامے ان شکلوں میں پیش ہونے لگے اور انگلینڈ کو آئرلینڈ کی قوت برداشت اور طاقت مقابلہ کا یقین ہو گیا تب صلح جوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ جون ۱۹۲۱ء میں مسٹر لائڈ جارج وزیراعظم برطانیہ نے اس ڈی ویلرا کو گفتگوئے صلح کے لئے لندن میں دعوت دی جس کے لئے صرف پانچ سال قبل بغاوت کے الزام میں ماخوذ

سزائے موت کا حکم صادر کیا تھا۔ ۱۱- جولائی ۲۱ء کو التوائے جنگ کا عارضی عہدنامہ ہوگیا۔ صلح کی گفتگو نے کئی بار کروٹیں بدلیں۔ اکثر جنگ کی دوبارہ چھیڑ چھاڑ کا گمان ہوتا تھا۔ بالآخر آرتھر گرفتھ اور کالنس کی سرکردگی میں جو صلحنامہ آئرلینڈ نے انگلستان کے ساتھ کیا اس کی بنا پر ۱۶- جنوری ۱۹۲۲ء کو ڈبلن کا قلعہ پھر آئرلینڈ کو واپس ملا جو گذشتہ سات صدیوں سے انگلینڈ کی آئرش حکومت کا مرکز بنا ہوا تھا۔

افکار ٹیگور

(۱) تیرا بیان سادہ ہے، اے میرے مالک مگر ان کا نہیں، جو تیرے مداح ہیں۔
میں تیرے ستاروں کی صدا اور درختوں کے سکوت سے آشنا ہوں۔
مجھے معلوم ہے کہ میرا دل ایک خوشنما پھول کے مانند کھل جائیگا اور میری حیات کسی چشمۂ حیواں پر لبریز ہو چکی ہے
تیرے پُرکیف اور وجد آفریں نغمات میرے کاشانۂ دل میں طائران خوش الحان کی طرح سکونت پذیر ہوا چاہتے ہیں
...... اور میں ایک موسم خوشگوار کے انتظار میں ہوں۔!

(۲) رات تاریک ہے، اور تو نیند کی گہرائیوں میں غرق! جاگ اے دردِ محبت، کیونکہ میں تیرا دروازہ کھول لینے سے عاجز ہوں۔ اس باہر کھڑی ہوں۔
"وقت انتظار میں ہے، ستارے چشم براہ، ہوا ساکن اور سکوت میرے دل پر حاوی ہے۔
اٹھ! اے محبت کی دیوی! اٹھ!! مجھ بھکارن کی جھولی بھر دے، اور اک نغمِ موسیقی سے تمام رات کو پریشان کر دے"

(۳) میں اپنا مٹی کا چراغ اپنی جھونپڑی سے باہر لاکر پکاری، میرے بچو! آؤ میں تمہاری راہ کو روشن کر دوں، شاہراہ کو خاموش چھوڑ کر جب میں واپس لوٹی تو رات بھیانک اور سیاہ تھی۔ میں نے چلانا شروع کیا۔
مجھے اپنی ضیاؤں سے منور کر دے، اے شمعِ محبت! کیونکہ میرا مٹی کا چراغ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرد و غبار میں مل چکا ہے۔

(مرسلہ روزگار)

مرزا رسوا مرحوم کی نثر

(از مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

مرزا صاحب کا پہلا نقش ادبی افشائے راز ہے جسمیں اونھوں نے اپنی بپتی لکھی ہے اس کے بعد شریف زادہ اور امراؤ جان ان کتابوں نے خاص مقبولیت حاصل کی۔

مولانا عبد الماجد صاحب کے سحر نگار قلم نے ہندوستانی میں مرزا صاحب کے ناولوں پر ایک تبصرہ کیا ہے۔ اور بہترین اقتباسات پیش کئے ہیں، اب ضرورت نہیں کہ اُسکا ذکر کیا جائے خصوصاً امراؤ جان کی سرگذشت کا آخری حصہ جو مولانا نے نقل کیا ہے میں نے پڑھا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو گر پڑے۔ مرزا نے دو ایک افسانے ابتدا میں اپنے شوق سے لکھے باقی کتب فروشوں کے اصرار سے مجبور ہو کر۔

مرزا صاحب اکثر مفلس رہا کرتے تھے۔ امین آباد اور چوک کے کتب فروش اکثر گھیرے رہتے اُس زمانہ میں ناولوں کا بازار گرم تھا، عام طبیعتیں راغب تھیں کبھی کبھی معقول رقمیں پیشگی دے جاتے تھے، منت خوشامد کی کوئی حد نہ تھی۔ اس طرح مرزا قلم برداشتہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں لکھکر کچھ دیدیا کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کے اوقات میں مَیں نے ان کو دیکھا ہے کہ ان کا قلم بغیر تفکر کے نہایت روانی سے چلتا تھا۔ یہ تو افسانے ہیں علمی موضوعات پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے وہ کارنامے ہیں، رسالہ اشراق و رسالہ الحکم دیکھنے والے مرزا کے علم و فضل اور اُن کی قوت تحریر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

رسالہ معیار جب پہلے پہل نکلا ہے تو اُس کے دور اول میں مرزا صاحب کے مضامین مسلسل ہوتے تھے اُس وقت اس رسالہ کی اشاعت بہت کم تھی اور زمانہ بھی ہوگیا لہذا اُن کے بعض مضامین کو جو فلسفۂ شعر کے متعلق ہیں ناظرینِ زمانہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ مضامین مراسلہ کے عنوان سے معیار کے مختلف نمبروں میں شائع ہوئے تھے۔

مراسلہ مرزا رسوا مرحوم نمبر ۱

میرے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے یہ منشا ہوگا کہ علم شعر کی ان جزئیات کو جنھیں اُردو زبان کی شاعری ڈھونڈھ رہی ہے حتی الوسع بیان کر دوں۔ مگر سخت مشکل یہ ہے کہ ان اُمور کو سمجھنے کے لیے جنھیں میں ذکر کیا چاہتا ہوں مبادی اور مسائل علم نفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اور اس علم کی کوئی کتاب بالفعل زبان اُردو میں نہیں ہے۔ شیخ ابو علی سینا کا ایک رسالہ زبان فارسی میں میرے پاس تھا اور اُس کا ترجمہ بھی میں نے اُردو میں لکھا تھا اور تحقیقات جدیدہ کے موافق بعضے حواشی اور تعلیقات اُس پر زیادہ کر دیے تھے، وہ گم ہو گیا۔ شیخ کی کتاب شفا جلد طبیعات میں بھی اس علم کا بیان موافق تحقیقات قدیم کے ہے مگر وہ عام نظروں سے دُور ہے۔ میں نے ایک رسالہ خاص اس علم میں تصنیف کیا ہے مگر وہ چھپا نہیں اور اگر چھپے بھی تو اصطلاحات علمی کی فہم سے اکثر اذہان قاصر ہیں اسیلیے وہ بھی اس مطلب کے لئے مفید نہیں۔

اُمور مذکورہ بالا پر نظر کر کے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ایک مختصر اور عام فہم طریقے سے علم نفس کے بعض اصول کا ذکر کر دوں جس سے اُن مطالب کے سمجھنے میں سہولت ہو جنھیں میں بیان کیا چاہتا ہوں

دنیا میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں جب ہم اُن کی صفتوں کو جُدا جُدا کر کے ہر ایک پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی حاسہ کے ذریعہ سے شعور حاصل ہوا ہے۔ مثلاً گلاب کے پھول کا رنگ اور شکل خاص بذریعہ حاسۂ بصر کے اور خوشبو شامہ سے اور وزن کا ہلکا پن ہتھیلی پر رکھ کے اندازہ کرنے سے معلوم ہوا ہے۔ ایسی چیزوں کو جو بذریعہ کسی حاسہ کے معلوم ہوں محسوس کہتے ہیں۔ ذہن کے اُس فعل کو جس سے محسوس کا علم ہوا ہے احساس کہتے ہیں۔ احساس کی تعریف یہ ہوئی احساس مراد ہے اُس اثر کے شعور سے جو کہ نظام آلی پہ کسی مؤثر کی تاثیر سے حادث ہوتا ہے۔ مثلاً روشنی کے ذریعہ سے آنکھ پر جو اثر ہوتا ہے اُس سے مبصرات کا شعور ہوتا ہے۔ یا ہوا کے تموج اور تصادم سے کان پر جو اثر ہوتا ہے اُس سے مسموعات کا۔ اور بو دار جسموں کے اجزائے لطیف جو ہوا میں مل کر مشام تک پہونچتے ہیں اُس سے مشمومات۔ اور پانی میں حل ہو جانے والے جسموں سے ذائقہ پر جو اثر ہوتا ہے اُس سے مذوقات اور اجسام کے چھونے سے اُنکی نرمی یا سختی اور گرمی یا سردی کا جو شعور ہوتا ہے اُنھیں ملموسات کہتے ہیں۔ اجسام کی مزاحمت اور وزن کا علم بذریعہ عضلات کے ہوتا ہے۔ حرکت کا شعور بھی عضلات اور دوسرے حواسوں کی شرکت سے ہوتا ہے۔

احساس کی شرط یہ ہے کہ شئے محسوس اُس آلۂ جسم سے متصل ہو جس سے اُس کا تعلق ہے۔ مثلاً جب تک گلاب کے پھول سے روشنی کی شعاعیں آنکھ پر نہ پڑینگی اُس رنگ اور شکل کا شعور نہیں ہو سکتا ہے

یا جب تک اُسکی خوشبو کے اجزائے لطیف ہوا میں مل کر شام تک نہ پہونچیں گے، اُس کی خوشبو معلوم ہوگی۔ یا جب تک ہم اُس کو نہ چھوئیں گے اُس کی نرمی کا حال نہ کھلے گا۔ خلاصہ یہ کہ احساس کے لئے شے محسوس کا حاضر ہونا شرط ہے۔

مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شے کی صرف ایک ہی صفت کا ہمیں احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہمکو یاد آجاتی ہیں۔ اگرچہ وہ بالفعل غائب ہوں۔ مثلاً گلاب کے پھول کی خوشبو سے ہمکو اُس کی رنگت اور شکل یاد آجاتی ہے۔ یا مثلاً ایک قسم کے عطر کی خوشبو ہم نے پہلے کبھی سونگھی تھی، اب ایک مدت کے بعد جب ویسی ہی خوشبو ہماری ناک میں آئی تو ہم کو فوراً یاد آجاتا ہے کہ یہ اُس عطر کی خوشبو ہے۔

دونوں مثالوں سے واضح ہوگا کہ شئے حاضر نے شئے غائب کو یاد دلا دیا۔ مگر فرق یہ ہے کہ دوسری مثال میں ایک ہی حاسہ کے محسوس نے اُسی حاسہ کی ویسی ہی محسوس کو یاد دلایا اور پہلی مثال میں ایک حاسہ کے محسوس نے دوسرے حواس کے محسوسات کو یاد دلا دیا۔

ان صورتوں سے حکمائے دو قانون اخذ کیئے ہیں، اُن کو لزوم ذہنی کے قانون کہتے ہیں:۔

اول۔ قانون مماثلت۔ دو یا زیادہ چیزیں ایک دوسرے کے مثل جب مختلف وقتوں میں ملاحظہ ہونگی تو ایک دوسرے کو یاد دلا دیں گی۔

دوم۔ قانون مقارنت، دو یا زیادہ چیزیں جو ایک وقت میں ایک ہی ساتھ ملاحظہ ہونگی اگرچہ فی الحقیقت مماثل نہ ہوں ایک دوسرے کو یاد دلا دینگی۔

جب دو چیزیں ذہن میں ایک ساتھ حاضر ہوتی ہیں اُن میں ہم دو نسبتیں قائم کیا کرتے ہیں۔
اول۔ تماثل، یہ چیز مثل اُس چیز کے ہے۔
دوم۔ تباین، یہ چیز مثل اس چیز کے نہیں ہے۔
ہر ایک احساس کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں:۔

(۱) شعور محض (۲) اُس احساس سے خاص لذت یا الم کا حاصل ہونا۔ (۳) وہ احساس کسی خاص تحریک کا باعث ہو۔

مثلاً گلاب کے پھول کو دیکھنے سے ایک تو یہ علم ہوا کہ اس کا رنگ ایسا، شکل ایسی اور خوشبو ایسی ہے۔ یہ شعور محض ہے۔ دوسری یہ کہ گلاب کا رنگ اور شکل کے دیکھنے سے یا خوشبو کے سونگھنے سے ہم کو مسرت یعنی لذت حاصل ہوئی یا مثلاً اُس کا کانٹا چبھ جانے سے ہمیں الم ہوا۔ یا وہ لذت اس حد تک ہوئی کہ گلاب کے پھول کو توڑنیکا ہمیں شوق ہوا۔ چنانچہ ہم نے اُسکے توڑنے کا قصد کرکے اُسے توڑ لیا

اور کانٹے کے چبھ جانے سے جو الم ہوا تھا اس لئے اُس سے بچتے رہے

حکما نے ان میں سے ہر ایک حیثیت کا ایک جداگانہ نام رکھا ہے۔ اول کو شعور دوسرے کو وجدان تیسرے کو ارادہ کہتے ہیں۔

شعور کے کئی درجے قائم کئے ہیں جن کا ظہور انسان کے رشد اور بلوغ تک ہوتا ہے۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔

پہلے درجہ کا نام ادراک ہے۔ یعنی کسی چیز کے مجموعہ صفات کے احساسات سے اُس چیز کو شناخت کرنا۔

دوسرے تعمیم۔ یعنی چیزوں میں عموم اور خصوص کی نسبتوں کا قائم کرنا۔ صنف اور نوع اور جنس کا قرار دینا۔ مثلاً ایک خاص طرح کی شکل اور رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے گلاب ایک نام رکھ لیا۔ یا ایسی بہت سی چیزیں کہ اگرچہ اُن کی رنگت اور شکلوں میں اختلاف ہے مگر بعض اوضاع خاص کی وجہ سے ملتے جلتے ہوئے ہیں اس لیے اُن کو پھول کہنے لگے۔

تیسرے استدلال۔ جزئیات سے کلی اور کلیات سے جزئی پر خاص حکم لگانا مثلاً زید فانی ہے، عمر فانی ہے، بکر فانی ہے، خالد فانی ہے۔ لہذا انسان فانی ہے۔ یا مثلاً کل انسان فانی ہیں، زید انسان ہے لہذا زید فانی ہے۔

پہلی صورت کو استقرار اور دوسری کو قیاس کہتے ہیں۔

چوتھے تمثیل، ایک قسم کے مجموع صفات کو ذہناً ایک فرد میں تجویز کر لینا۔

یہ چار طبیعی درجے ذہن انسان کی ترقی کے ہیں، ان کے علاوہ توہمات۔ خواب۔ مشی النوم اور جنون یہ حالتیں غیر طبیعی ہیں۔

تمثیل کے معنے لغت میں نگاشتن پیکر کے ہیں، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جو صورتیں کبھی عندالذہن حاضر تھیں اُنکو پھر ذہن کے سامنے لانا دوسری نئی صورتیں جو عالم خارج میں موجود ہی نہوں اُن کو ایجاد کرنا۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ تمثیل خواہ مخواہ ایک جدید اصطلاح ایجاد کی گئی ہے، حقیقتاً یہ وہی ہے جس کو تخئیل کہتے ہیں، اور محاکات اور اختراع اسکی دو قسمیں ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تخئیل ایک شرط ذہن کی ہے جس کا بروز ابتدائے نشو و نما سے ہوتا ہے۔ اور جس پر وہ دو قانون تذکر اور تقابل کے قائم کئے گئے جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے۔ اور تمثیل کا ظہور ترقی ذہنی کا

آخری درجہ ہے جس سے اکثر اذہان بہت ہی کم بہرہ یاب ہوتے ہیں۔

اگر تمثیل کے اور اُس کی دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ لفظ شاعرانہ زیادہ کرکے ہم شاعرانہ تخیل شاعرانہ محاکات اور شاعرانہ اختراع کہیں تو ہمارے مطلب کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ محاکات وہ حالت ذہن کی ہے جبکہ وہ چیزیں جو کبھی عندالذہن حاضر تھیں اُن کی صورتیں جو خزانۂ حفظ میں موجود ہیں پھر ذہن کے سامنے آجائیں اُس کو استرجاع کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) غیر ارادی (۲) ارادی اور باعتبار اُن کے مدت تک ذہن کے سامنے حاضر رہنے کے استحضار کہتے ہیں اور یہ بھی یا ارادی ہے یا غیر ارادی۔ شاعرانہ محاکات کے لئے انتخاب کا سلیقہ ہونا چاہئیے۔ تاکہ جب الفاظ کے ذریعہ سے ان کا بیان کیا جائے، تو وہ عندالسامع مقبول ہو یا موجب کسی قبض و بسط کا ہو۔

قبض ایک حالت وجدانی ہے مشابہ الم کے جو مضرات سے اجتناب یا اُن کے دفع کرنے کی آمادگی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔

بسط ایک حالت مشابہ لذت کی ہے جو لذات سے متمتع ہونے کے شوق کا باعث ہوتی ہے۔

محاکات محض واقعہ نویس یا مورخ کے لئے زیادہ مفید ہے نہ کہ شاعر کے لئے اختراع صرف شاعر کا حصہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ بت تراش، مصوّر، طرّاح بھی شاعر کے شریک فی الصناعت ہیں مگر اُن کا ذکر ہمارے مقصود کے لئے مفید نہیں۔ اس لئے ہم نے اُن سے زیادہ تعرض نہ کیا۔ باعتبار حیثیات احساس کے جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے۔ تمثیل کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) وہ جن کا تعلق شعور سے ہے (۲) جن کا تعلق وجدان سے ہے (۳) جن کا تعلق ارادہ سے ہے۔ اور جب ان کے اجتماع کو عقل ایک فرد واحد میں تجویز کرتی ہے تو اس سے ایک مثالیہ کا ظہور ہوتا ہے جسے کمال کہتے ہیں۔

وہ ذات مقدس جسمیں یہ صفات کمالیہ پائے جاتے ہیں حق الحق، جمیل لذاتہ، خیر مطلق اور غایت الغایات ہے۔ ایاہ نعبد و ایاہ نستعین۔ مثالیہ اول یعنی حق موضوع فلسفۃ الوجود کا ہے۔ جمال موضوع علم ذوقیات کا ہے۔ خیر موضوع علم اخلاق کا۔ اور تصور باری تعالیٰ عزاسمہٗ موضوع الٰہیات کا ہے حقیقت نفس الامری سے وہ امر مراد ہے جس کی موجودگی کو عقل خارج میں تجویز کرتی ہے نہ صرف ذہن میں۔ بخلاف امر ذہنی کے جس کا وجود صرف ذہن میں ہے۔ خارج میں نہیں ہے۔ فافہم۔

جمیل[۱] سے مرغوب لذاتہ مقصود ہے نہ وہ جس کو ہم کسی غرض سے دوست رکھیں جسکے حصول کا وہ واسطہ ٹھہرے بلکہ اُسی کا حصول عین مراد ہو۔

---

[۱] غرض ادنیٰ اس سے بقائے شخصی مقصود ہے۔ غرض اعلیٰ جو بقائے نوع کے لئے مفید ہو۔

ممکن ہے کہ امر جمیل نافع بھی ہو، یعنی کسی غرض ادنیٰ یا اعلیٰ سے اُسکا حصول مطلوب ہو مگر جس حیثیت سے کہ وہ واسطہ کسی غرض کا ہے اس حد میں داخل نہیں۔ مرغوب لذاتہ کی ایک بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے مل سکتی ہے اس لئے کہ اُس سے اُن کی کوئی غرض شخصی نوعی نہیں ہوا کرتی۔ یہی کھیل کا شوق جو بچوں میں پایا جاتا ہے ترقی کرتے کرتے اُس حد تک پہونچ گیا ہے جس سے بت تراشی۔ مصوری۔ طراحی موسیقی۔ شعر ایسے ایسے فنون لطیفہ نکل آئے ہیں۔ بچوں کے کھیل اور کھلونے بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں، اور بوڑھوں نے اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لطافتیں پیدا کرلی ہیں۔ جنھیں حقیقت بیں کے نزدیک اصل دونوں کی ایک ہی ہے وہ امر جسے غرض یا اُس کی متقارب لفظ نفع سے تعبیر کرلے دونوں میں نہیں ہے۔ فنون لطیفہ کے مقابل وہ فن ہیں جن کو فنون نافعہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً فن میکانات (کلیں بنانے کا فن) کے ذریعہ سے وہ چیزیں بنائی گئی ہیں جو انسان کی بقا اور ترقی شخصی اور نوعی کے مفید ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جمال اور نفع دونوں صفتیں ایک ہی شے میں جمع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت جیبی گھڑی۔ ایسی چیزیں عند الذوق و نیز عند العقل مستحسن ہیں۔

ہر صاحب فن کی غرض یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے ایجاد میں دونوں صفتیں پائی جائیں۔ مگر ایسا نہ ہو کہ ایک کی رعایت سے دوسرا ناقص رہ جائے۔ ہر ایک صاحب فن کو اپنے خاص فن کی مراعات لازم ہے اگر اُس سے دوسرا مطلب بھی نکل آئے تو فہو المراد۔ مثلاً شاعر کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا شعر اصول سے درست ہو اُس میں کوئی ذاتی خوبی ہو۔ پھر اگر اُس سے کوئی نصیحت بھی نکلتی ہے۔ تو سبحان اللہ۔ ورنہ نصیحت گری کو ناصح مشفق کے حوالے کرے اور خود بزم شعرا میں اپنی عزت بچانے کے لئے شعر عمدہ کہے۔

تقسیم فنون کی باعتبار اُس آلہ اور مادہ کے جو اُن میں استعمال کئے جاتے ہیں یہ ہے:-

فنونِ لطیفہ میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق حس بصر سے ہے۔

(۱) بت تراشی (۲) طراحی (۳) مصوری۔ اِن فنون میں شکل اور رنگ سے کام لیا جاتا ہے

(۲) وہ فن جس کا تعلق حِسِ سمع سے ہے۔ موسیقی ہے۔ اس میں لحن و ایقاع سے کام لیتے ہیں۔

(۳) فنون ادبیہ کا تعلق تخئیل سے ہے۔ اور اس میں بذریعہ الفاظ کے کام لیتے ہیں۔ فنون ادبیہ کے لیے لفظ شعر بہت ہی مناسب ہوتا مگر از بسکہ اسکو اکثر کلام منظوم کے لیے بولتے ہیں لہذا خوف التباس سے ترک کیا۔

شعر کا اصل مقصود صرف یہ ہے کہ بذریعۂ الفاظ کے شعور و وجدان متاثر ہوکر موجب قبض و لبسط کے ہوں۔

لیکن فنون ادبیہ میں ضمناً اور اغراض عمدہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً حکایت ۔ توجیہ۔ استدلال موعظت اس صورت میں چاہیئے کہ مصنف ترتیب مقدمات میں ایسی لیاقت اور سلیقہ کو صرف کرے۔ جس سے اُس کی تصنیف اُن دونوں غرضوں کے لئے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہو۔ اگر کوئی مورخ کسی واقعہ تاریخی کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع یا ناظر کی تخئیل میں ہو بہو تصویریں کھنچ جائیں۔ یا کوئی حکیم کسی قانون فطرت کی توجیہ اس صورت سے کرے کہ ہر شے میں ہمیں اس کے آثار نظر آجائیں تو کہا جائیگا کہ وہ بیان اور توجیہ دونوں غرضوں (یعنی غرض علمی اور غرض شعری) کے لئے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہے۔ وہ علم جو بہت ہی خشک خیال کئے جاتے ہیں مثلاً ریاضی یا منطق اُن کے بیان میں بھی اگر سلیقہ شعری سے کام لیں تو سامع اور ناظر اس سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ غرض علمی بھی بخوبی حاصل ہوتی ہے بلکہ اُس میں ایک قسم کی مدد ملتی ہے۔

علوم ادبیہ میں بہ نسبت اور فنون لطیفہ کے وسعت بہت زیادہ ہے اس لئے کہ اُس میں سے ہر ایک ایک ہی حاسہ کے موضوع کے استعمال تک محدود ہے۔ رنگ شکل۔ آواز۔ فنون ادبیہ جملہ احساسات بلکہ جمیع وجدانیات اور عقلیات کے استعمال پر بشرطیکہ وہ بذریعہ لفظ و عبارت کے ادا ہو سکیں قادر ہیں۔ اگرچہ ادیب مصور کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا نہ خوش آیند سُر کانوں تک پہونچا سکتا ہے۔ لیکن وہ الفاظ کے ذریعہ سے ہر چیز کی صورت صفحۂ تخئیل پر کھینچ سکتا ہے نہ صرف ایک رخ سے بلکہ مختلف رخوں سے اور یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ تر پایدار ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی اصل موسیقی کا مزا پیدا کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ ایسی حالت میں کسی اشکال تاریخی یا مسئلہ حکمی کا ثبوت اور حل بھی دیا جائیگا جو اُسکی غرض خاص ہے۔

اگرچہ شاعر بھی واقعات کی ہو بہو تصویریں کھینچنے میں محاکات سے بہت کام لیتا ہے لیکن اُس کے حُسن کا تعلق خاص اختراع سے ہے بخلاف مورخ کے جس کا تعلق محاکات سے ہے جب شاعر محاکات سے کام لیتا ہے اُس وقت بھی اختراع سے باز نہیں رہتا اس لیے کہ شاعر کی نظر اکثر مرغوب لذاتہ اور جمیل کی طرف رہتی ہے لہذا اُسکو انتخاب کرنا ہوتا ہے مثلاً جب اُسے کسی واقعہ

کی تفصیل بیان کرتا ہے تو وہ عدالت کے گواہوں کی طرح ہر جزئی کے ذکر کا پابند نہ رہیگا بلکہ صرف اُن امور کو انتخاب کرے گا جو اُسکے مطلوب کے لئے مفید ہوں۔

اس صورت میں مکروہات کے ذکر سے قطعاً احتراز کریگا اور دوسرے ایسے امور کو بھی ترک کردیگا جن کو وہ غیر مفید یا مضر خیال کرتا ہے۔

مکروہات سے وہ امور مراد ہیں جن کا ذکر بسط و قبض دونوں کے لئے مفید نہیں۔ اس میں کیا شک نہیں کہ ایسے امور موجب ایک طرح کے انقباض کے ہوتے ہیں۔ مگر شدت انقباض کی وجہ سے قوت توجہ اُن کی طرف اس قدر مبذول ہو جاتی ہے کہ اور امور سے متاثر ہونے کے قابل نہیں رہتی، اس صورت میں بیجا صرف قوت کا ہوتا ہے۔ اور اگر اس امر میں کوئی اور خوبی خلقی یا ذہنی نہیں ہوتی تو گویا مفت تضیع اوقات ہے۔

ہم اس موقع پر ایک بہت ہی سہل قانون امور مکروہ سے احتراز کرنے کے لئے تحریر کئے دیتے ہیں اگر اُسے یاد رکھیں گے تو شعرا اپنے مقصود میں عمدہ ہوگا۔ وہ قانون یہ ہے۔ ہر ایک شعر کے ماحصل پر غور کرکے دریافت کریں کہ اُس سے کس قسم کی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس تصویر کے اجزا یا لزومات قریبہ میں کوئی امر مکروہ شامل ہے تو اس کو نظری کردینا چاہیئے۔ ہم اس مقصود کو ذوق کے ایک شعر سے سمجھائے دیتے ہیں ؎

وا درے شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک	استخواں میرے ہما کس مزے سے کھائے ہی

اس شعر کو بطور مذکور ملاحظہ کرنے سے ایک تصویر ذہنی ایسی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک امر مکروہ شامل ہے۔ یعنی انسان کی ہڈیوں کا نمکیں ہونا اور ایک جانور کا اُسے کھانا۔ عمدہ تخیل نہیں ہے۔ یا کسی اور شاعر کا بہت ہی مشہور مطلع اور شاید اکثر صاحبوں کو پسند بھی ہے ؎

شغل اگر چاہتے ہو جی کے بہلنے کے لئے	دل میں آ بیٹھو کلیجہ میرا ملنے کے لئے

اس کے ماحصل میں ایک تصویر ذہنی بنتی ہے جو بعید القیاس مضحک اور مکروہ ہے۔ دل میں ایک شخص کا آبیٹھنا اور ہاتھ بڑھا کر کلیجہ کو ملنا ایک مہمل سی بات ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس شعر میں مخاطب معشوق مجازی ہے معشوق حقیقی اس سے منزہ ہے۔ کہ کسی کے دل میں بیٹھکر اس کے کلیجہ کو مسلے۔

یا غالب کا ایک شعر فارسی کا:۔

داغم ز سوز دل نہ خجل وارم ز خلق	بوئے کہ تن ز سوختن استخوان دہد

چیزوں کے جلنے سے جو رائحہ کا پیدا ہونا جو شاعر کو خلق سے تعلق رکھتا ہے واقعی ایک مکروہ امر ہے۔ اور اسی مضمون کو غالب نے اُردو میں بھی کہا ہے:-

داغ دل گر نظر نہیں آتا   بو بھی لے چارہ گر نہیں آتی

داغِ دل کی بو میں رائحہ ضرور ہو گی، صرف داغ دل کا ذکر کیا کم تھا کہ اُس کے جلنے اور اُس سے بو کے پیدا ہونے کا بیان مشرح کیا گیا ہے۔ اور اس موقع پر بو کا استعمال اُسی امر مکروہ پر دلالت واضح ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ امور صرف مجازاً کہے گئے ہیں اس کی اصلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تو اُس کا یہ جواب دیا جائے گا۔ کہ مجاز کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ حقیقت اُس کے ذریعہ سے ذہن نشین ہو کیونکہ مجاز میں اکثر امور عقلی کو محسوسات کے ذریعہ سے جو اقرب الی الفہم ہیں بیان کرتے ہیں مثلاً علم کو جو ایک امر عقلی ہے سمع کہنا وغیرہ۔ اگرچہ وہ مجازات جو اشعار مرقومۂ بالا میں شامل ہیں اپنی حد میں درست ہیں لیکن اُن کی تخئیل مکروہ ہے اس سے اُس کا لطف معدوم ہو جاتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس قسم کے بے شمار شعر متقدمین اور متاخرین کے کلام میں پائے جاتے ہیں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اسی طرح اکثر اغلاط لفظی بھی اُن کے کلام میں پائے جاتے از بسکہ زمانۂ دراز سے مشرقی شاعری کو درستی الفاظ کا لحاظ رہا ہے لہذا معنویت کی باریکیوں کی طرف غور کرنے کی فرصت نہیں ملی۔

شعر پر نظر کرنے کے دو رُخ ہیں۔ ایک آزادیِ لفظ، دوسرے آزادیِ معنیٰ، جس زمانہ میں الفاظ کی باریکیوں کی طرف زیادہ نظر کی جاتی ہے۔ توجہ اُسی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے معنویت کا خیال جاتا رہتا ہے۔ اور جب معنویت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو لفظی باریکیاں ترک ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں میں نسبت عکسی ہے۔ ایک کی افراط۔ دوسرے کی تفریط کا موجب ہوتی ہے۔ اکثر ایسے شاعر جو مضمون عمدہ کہتے ہیں اُن کے الفاظ میں وہ سلاست اور نزاکت نہیں ہوتی جو ان شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جن کو مضمون کی جدت اور ندرت کا چنداں لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ صرف لطفِ زبان کے دلدادہ ہیں اور یہ بھی ایک امر قابل لحاظ تھا کہ جو شاعر خلاق مضمون ہیں۔ اُن کو طرز ادائے مقصود میں بڑی دقت پڑتی ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک جدید خیال کے لیئے ایک جدید لفظ چاہیئے۔ اُن کو زبان مروجہ میں تصرفات کرنا ہوتے ہیں اور اس صورت میں اُن کا کلام موافق روزمرہ عوام کے نہیں رہ سکتا۔ لہذا اکثر اشخاص جن کی نظر سطحی ہے اُن کو ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔

شیکسپیر شاعر جس کو سعدی انگلستان کہنا چاہیئے اُس کے کلام میں اکیس ہزار الفاظ استعمال ہوئے، اور ملٹن نے سات ہزار لفظیں استعمال کی ہیں، اہل صناعت کا یہ خیال ہے کہ شیکسپیر کا دائرۂ خیال بہ نسبت ملٹن کے سہ چند تھا۔ ہمارے ہندوستان میں میر کی سلاست مشہور ہے۔ مگر پہلے دیوان کی پہلی غزل میں فرماتے ہیں۔

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

ذرا ہنگامہ گرم کن کو دیکھیئے اور اُردو زبان کو۔ مگر کرتے کیا اس مضمون کو اور کسی طرح ادا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

مگر ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ غزل میں زیادہ تر سلاست ہی مناسب ہے۔ اس لئے کہ اُس کا موضوع سنجیدہ نہیں ہوتا۔ قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ میں خیالات اور اُن کے ساتھ ہی زبان کو وسعت دینا چاہیئے۔

علم طب کا ایک مسئلہ ہے اعتدال حقیقی کا وجود خارج میں محال ہے۔ وہی امر یہاں بھی صادق آتا ہے۔

وزن اور قافیہ کی پابندی شاعر کے لیے کم نہ تھی کہ اُس پر ردیف بڑھائی گئی پھر اور لفظی جھگڑے نکالے گئے۔ بیچارہ جدید مضمون کہاں سے پیدا کرے۔ لفظی جھگڑوں کے بڑھانے سے مضامین کا دائرہ تنگ ہوتا جائیگا۔ ہندوستان میں سو برس اُدھر کی شاعری آجکل کی شاعری سے اچھی تھی۔ متوسطین نے جھگڑے حد سے زیادہ بڑھا دیئے اس لئے مزا جاتا رہا۔ مگر اس زمانہ میں پھر رجوع معنویت کی طرف ہے۔ اس لئے مجھکو ان مراسلات کے لکھنے کی جرأت ہوئی۔ ان مراسلات میں بعض امور ایسے پائے جائیں گے۔ جن سے معاصرین نابلد ہیں اور اس سے ممکن ہے کہ اکثر صاحبوں کو تعریض کا موقع ہاتھ آئے۔

مثلاً اس مراسلہ میں مسلم الثبوت اُستادوں کے بعض شعر جو نظری کر دئیے گئے ہیں ممکن ہے کہ بعض طبیعتوں پر گراں گذرے لیکن یہ ایک اوچھی بات ہے چاہیئے کہ معشر کلام کی طرف رجوع کریں اور اصل مطلب کو سمجھیں جو زیادہ تر مفید اور مستحسن ہے۔ ان لفظوں پر میں اپنے پہلے مراسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ آئندہ اُن اُمور کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرونگا جس سے میدان شاعری کا تنگ اور تاریک ہوتا جاتا ہے اور اُسکے وسعت کے اسباب بھی عرض کرونگا۔

کلام مومن[1]

(از سید مقبول حسین، بی۔ اے۔ احمد پوری)

نہ دے تیغ زباں کیونکر شکستِ رنگ کو طعنے
کہ صفہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا

کلام مومن پر ابتک جتنی تنقیدیں دیکھنے میں آئی ہیں وہ اس بات پر ضرور متفق ہیں کہ وہ صاحب طرز ہیں، اور یہ کہ انھوں نے اپنے لئے غزل کا میدان علیحدہ تجویز کیا۔ "روشِ عام پر کبھی چلنا پسند نہیں کیا"۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جو انھیں روشِ عام سے علیحدہ کرتی ہے۔

کسی ادیب کی وہ خصوصیت جس کی وجہ سے وہ صاحب طرز کہلائے۔ عموماً اس کے احساسات میں پنہاں ہوتی ہے، جو اس کی طبیعت کا خمیر اور کیرکٹر کے اجزا و عناصر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ درد صوفی تھے، میر رقیق القلب تھے، غالب فلسفی تھے، شبلی نقاد تھے، حالی ریفارمر تھے، اور اقبال بہی خواہِ ملت، یہ اس بنا پر کہ درد کے کلام میں تصوف ہے، میر میں رقت، غالب میں تخئیل و متانت شبلی میں تنقید، حالی میں ریفارم، اور اقبال میں جذبۂ ملی، یہ خصوصیتیں کیرکٹر کا معیار ہیں۔ اور یہی اسکا عکس و آئینہ، اس طرح کسی شاعر کے کلام کی وہ نوعیت جو اسے شاہراہ عام سے الگ کرے اسکے کیرکٹر کی

[1] حکیم مومن خاں (۱۲۱۵ھ تا ۱۲۶۸ھ۔ مطابق ۱۸۰۱ء تا ۱۸۵۱ء) انکے والد کا نام حکیم غلام نبی تھا۔ انکے دادا حکیم نامدار خاں اصل نجبائے کشمیر سے تھے سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں کشمیر سے آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے شاہ عالم کے زمانے میں چند مواضع جاگیر میں پائے جب انگریزی حکومت ہوئی تو انکی پنشن مقرر ہو گئی جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا فن طب ان کا آبائی پیشہ تھا۔ عربی فارسی میں وہ مہارت تامہ رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی کمال حاصل کیا ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ امیروں رئیسوں کی دربارداری سے سخت نفرت تھی انکی تصانیف میں ایک کلیات ہے جس میں ایک دیوان و چھ مثنویاں ہیں۔ شاعری کی ہر صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے انکے دیوان کی ترتیب انکے مشہور شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کی۔ مشاہیر ادب میں تسلیم دہلوی امیر اللہ تسلیم اور مولنا حسرت موہانی انکی طرز کے پیرو ہیں۔"
(انتخاب از تاریخ ادب اردو مصنفہ بابو رام سکسینہ صاحب، و مترجمہ مرزا عسکری صاحب)
مومن خاں کا حلیہ یہ تھا (چالیس سال کی عمر تصور کیجئے) "کشیدہ قامت، سرخ سفید رنگ جس میں سبزی جھلکتی تھی (بقیہ صفحہ ۲۹۷ پر)"

کسوٹی ہے۔ اور اس اعتبار سے کسی شاعر کے کلام پر تنقید و تبصرہ کرنا اس کے مخصوص انداز کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ اسکے کیرکٹر و کردار کی تہ تک پہونچنے کی کوشش بھی کرنا ہے۔

آدمی کی رفتار و گفتار اس کے شعار انسانیت کا معیار ہے، رفتار کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں مثلاً رقص رفتار کی ایک حالت ہے، موسیقی گفتار کی ایک کیفیت نظم کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے غزل نظم کا شباب ہے، اس کے لغوی معنی اس کی دلیل ہیں۔ یعنی یہ کہ فلسفہ، تصوف، حکمت، معرفت اور نعت وغیرہ کو تغزل سے کوئی نسبت نہیں ہے، شعرائے لکھنؤ کی مجازی شاعری کو اسی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ کہ غزل کا تعلق عشق مجازی سے ہے۔ نہ کہ عشق حقیقی سے اور چونکہ عشق مجازی "شباب کا جنون" ہے۔ اس لئے جوانی ہی ایسا وقت ہے جبکہ شاعر کے جذبات تغزل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ مومن خاں کا شباب حقیقی معنی میں شباب تھا۔ کیونکہ اس عہد میں نہ تو وہ مولوی تھے، نہ فلسفی۔ نہ صوفی۔ نہ زندہ۔ انھوں نے نیکی و بدی کی مدح و ذم نہیں کی، نہ تخئیل کی گتھیاں سلجھائیں۔ ہم ان کو کسی سبزہ آغاز ترک شیراز کے لب لعلین پر اشکہائے خونیں بہاتے ہوئے نہیں پاتے، نہ وہ شراب ناب کے نشے میں چور نظر آتے ہیں۔ وہ تو اپنے شباب کے کنھیا تھے۔ اُن کا عشق خدا کی اس مخلوق سے تھا جس سے عشق ہونا چاہئے۔ یہ مانا کہ وہ عشق حقیقی نہ تھا مگر نیچرل ضرور تھا اور حقیقت کو نیچر سے بیر نہیں۔

اُن کی شاعری میں ان کے معشوق کی حیثیت ایک یوسف کی ہے جس کے لئے وہ زلیخا ہیں۔ اور سوائے ان کے تمام دنیا رقیب، ناصح کو وہ نادان سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اگر ناصح انکے یوسف کو دیکھ لے تو بیخودی میں اپنے "ہاتھ کاٹ ڈالے"۔ ان کا عشق رادھا کا عشق ہے جسکی نظر میں کنھیا کی رفتار و گفتار پر بھی نظر غیر لگ جانیکا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے انکی شاعری میں اشارے ہیں، کنائے ہیں، فقرے ہیں، آوازے ہیں، طعن و طنز کی چشمکیں ہیں، اور آداب، کورنشات، تسلیمات وغیرہ کے پردے میں چلی کٹی باتیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، اسکے علاوہ نہیں معلوم کیا کچھ ہے، اس طرح انکے کلام میں کہیں تو آن بان ہے اور کہیں آن ہی آن،

اس انداز کو بظاہر طنز کہا جائے گا۔ واقعی یہ طنز ہے مگر طنز کی نئی قسمیں ہیں۔ مومن کے شاعرانہ

بقیہ صفحہ - بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی سوتواں ناک، پتلے پتلے ہونٹھ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی انگلیاں، گھونگر والے بال لمبے لمبے کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے۔

طنزوں میں عجیب نرالاپن ہے، عجیب شان یا رعنائی ہے جس کے لئے کوئی لفظ نہیں ملتا لیکن اس کو اگر طنز ملیح کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ مومن کے طنز میں ایک طرح کی ملاحت ہے، جسکے مختلف پہلو ہیں، اور چونکہ اس کا انحصار جذبات پر ہے اس لئے ہر نشتر کسی نہ کسی احساس کا آئینہ ہوگا۔ اور اس احساس میں رشک کی حرارت کا ہونا لازمی ہے۔ طنز یہ ملاحت کے نشتروں کی مختلف شکلیں کلام مومن سے بطور تمثیل ذیل کے اشعار میں ملیں گی۔ مثلاً

(۱) "رجعت کنایہ":-

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بیوفائی کی،

لاش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ — میں ہوں کشتہ تیرے تجاہل کا

(۲) "رجعت مبالغہ":-

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر — لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

(۳) "ندرتِ ادا":-

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا — غیر لیجائے ہے پیام مرا
قتل ہو کر ہم بچے آزار سے — عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے

(۴) "کیفیت ادا":-

چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا،
گر دعا کرتا ہوں مومن وصل کی — ہاتھ باندھے ہے وہ حجتِ زنار سے،

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا،

اسی طرح کی اور بہت سی شکلیں ہیں جن کا الگ نام تجویز کرنا مشکل ہوگا۔ بہرحال ہر شکل میں در پردہ اشارے کنائے ضرور ہیں۔ جو کہیں تو بالکل "طعن عریان" ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں:-

اور ایسا کوئی کیا بے سر و سامان ہوگا — کہ مجھے زہر بھی دیجئے گا تو احسان ہوگا
کہہ سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل — تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آسان ہوگا

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا — دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیمان ہوگا
دوستی اس صنمِ آفتِ ایمان سے کرے — مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایمان ہوگا

کہیں یہ کنائے کیف مایوسی ہیں۔ اس کیف کی مثال سورداس کا یہ شعر ہے ؎

آسئے تھے موہن گھوم گئے آنگن　　　میں بیرن رہی سوئے
سورداس پربھو اب جو ملو گے　　　راکھونگی نین سموئے

ظاہر ہے کہ اس شعر میں کوئی کنایہ نہیں مومن کے یہ اشعار کنایہ کی جھلک بھی رکھتے ہیں ؎

وصل کی شب شام سے میں سو گیا　　　جاگنا ہجران کا بلا ہو گیا
ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ　　　آکے میری نعش پہ وہ رو گیا

کنایوں کا تنقیدی پہلو ذیل کے شعر میں بطور مثال ملاحظہ ہو ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں　　　اے ہم نشیں نزاکت آواز دیکھنا

اکثر جگہ یہ کنائے "آوازے" ہو جاتے ہیں مثلاً ؎

گر نہ کھیلیں جان پر جی ہار دیں　　　عشق بازی سیکھے اغیار سے

جان پر کھیلنے اور محض زبان سے کہکر "جی ہارنے" میں کتنا بڑا فرق ہے۔

کہیں کہیں یہ اشارے خوشامد اور حسن طلب کا پہلو بھی لئے ہوتے ہیں۔ حسن طلب کا یہ انداز بچوں کے رشک میں بہت پایا جاتا ہے اس لئے اُن سے کہتے ہیں کہ دیکھو یہ چیز لے لو اگر تم نہ لوگے تو ہم اس کو (یعنی کسی دوسرے کو) دیدیں گے۔ واسوخت کی بنیاد رشک کے اسی پہلو پر ہے، مگر واسوخت میں عموماً جلی کٹی ہی سنائی جاتی ہے، یہاں اسکا رنگ ہی اور ہے، یعنی تعریف کرکے دل بڑھایا ہے مثال کے طور پر سورداس جی کا یہ مشہور شعر غور طلب ہے ؎

باہیں چھوڑائے جات ہو نربل جان کے موہیں
ہردے سوں جب جایئے سبل بدونگی تو ہیں

مومن خاں اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُن کا مخاطب دل ہے یعنی ؎

جو پھر جائے اس بے وفا سے تو جانوں　　　کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

کنایوں میں شکایت کرنا عام بات ہے، کیونکہ طنز و تعریض کا مقصد ہی شکایت ہوتا ہے مگر مومن خاں کے کلام میں شکایت کی جھلکیں ایک خاص کیفیت لئے ہوئے ہیں مثلاً ؎

دھیان ہے غیر کے تحمل کا　　　ہوش دیکھا ترے تغافل کا

اور کہیں کہیں شکایت کے پیرایہ میں رقیب کی غیبت بھی کی گئی ہے مثلاً ؎

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

گویا لفظ "شوخ" بھلے مانسوں کے لئے استعمال کرنا ان کی ہتک کرنا ہے کیونکہ یہ ایک بازاری لفظ ہے۔

جیسا اوپر ظاہر کیا گیا، واسوخت کی بنیاد شکایت پر ہے۔ اور شکایت بھی کیسی ؟ جلی کٹی باتوں میں، ذیل کے اشعار میں یہ بات اس قدر زیادتی کے ساتھ ہے کہ مومن کے عام انداز یعنی "طنز ملیح" کی ملاحت بھی رخصت ہو گئی ہے، اور طنز و طعن کا دہکتا انگارہ باقی رہ گیا ہے، مثلاً ؎

اب اور سے لو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

دل دیکھئے اک اور لالہ رو کو پھر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بیقراری کھینچیگی تو لوٹ جائیں گے ہم

بتخانۂ چین ہو گو تیرا گھر، مومن ہیں تو اب نہ آئیں گے ہم

آخری دو شعر عرفی کے طرز کے ہیں اور ان سے شاعر کی خودداری کا اظہار ہوتا ہے، عرفی میں کنایہ کی چشمک زیادہ نہیں، وہاں تو دو ٹوک جواب ہے مثلاً یہ شعر ؎

ہمرہِ غیر ومی گوئی بیا عرفی تو ہم لطف فرمودی برو کین پا را رفتارنیست

جہاں کہیں یہ کنائے محض اظہارِ واقعہ کی صورت میں ظاہر کئے گئے ہیں زبان و بیان کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی ہے جیسے یہ اشعار ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

رسم پر خصم جان غیر نہ ہو سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطر مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا

متانت و سنجیدگی کے اعتبار سے مومن کا رنگ غالب سے ملتا ہے مگر غالب کا تتبع انھوں نے بالکل نہیں کیا۔ مومن کے کلام کی ایک خصوصیت اور بھی ہے وہ یہ کہ مومن نے باوجود اس طنز و تشنیع کے ارباب شریعت مثلاً زاہد، واعظ، شیخ، موذن، اور اسی طرح دیگر مذہبی ارکان کو اپنا تختۂ مشق نہیں بنایا۔ اس اعتبار سے ان کا کلام عالمانہ ہے چنانچہ ذیل کے اشعار اس رنگ کے شاہد ہیں، مومن اپنے تخلص کی ذومعنی اس طرح نبھا گئے ہیں کہ اردو کا شاید ہی کوئی دوسرا شاعر یہ خوبی

پیدا کرسکا ہو مثلاً ؎

دوستی اُس صنم آفتِ ایمان سے کرے مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایمان ہوگا

واقعی مومن یا مسلمان کو بتوں سے محبت کرکے اپنے ایمان کو ڈانواں ڈول کرنے کی کیا ضرورت ہے،

دوسرا شعر۔ بتخانہ میں ہو گر تیرا گھر مومن ہیں تو اب نہ آئینگے ہم

سچ ہے مومن کو بتخانے میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اسی طرح یہ شعر ؎

کیوں سُنے عرض معترض مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا

اخلاق کے اس دلچسپ پہلو کے علاوہ ان کے کلام میں صرف خودداری کا پہلو ہے جو رشک سے بری نہیں، تصوف اور موعظت کا ذکر بالکل نہیں۔ اپنے عشق کو وہ مجازی خود تسلیم کرتے ہیں یعنی ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے۔

اس وضعداری کو انھوں نے ہمیشہ قائم رکھا، کیونکہ جیسا انکا ابتدائی کلام ہے ویسا ہی آخری، انھوں نے تصوف کو کبھی ہاتھ ہی نہیں لگایا۔

جذبات سے قطع نظر زبان و بیان میں بھی وہ غالب کی طرح وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔ غالب کا کلام منتخب ہے اگر مومن کے کلام کا بھی انتخاب کیا جائے تو شاید وہ زبان کے اعتبار سے غالب کے مقابلے میں پیچھے نہ رہیں۔ کیونکہ غالب کی طرح وہ بھی دریا کو کوزے میں بھرتے ہیں اور طویل گفتگو کو چند الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں، اور لطف یہ کہ زبان کی سنجیدگی بھی پوری طرح سے قائم رہتی ہے، بہر حال کلام مومن میں زبان کی حسب ذیل خصوصیتیں موجود ہیں۔

(۱) "محاورہ بندی" مثلاً ؎

چل الگ ہٹ مجھے نہ دکھلا مُنھ اے شبِ ہجر تیرا کالا مُنھ

شبِ غم کا بیان کیا کیجئے ہے بڑی بات اور چھوٹا مُنھ

جب کہا یار نے دکھا صورت ہنس کے بولا کہ دیکھ اپنا مُنھ

کس کو خونِ جگر پلائے گا، ساغرِ مے کو کیوں لگایا مُنھ

گھر میں بیٹھے تھے کچھ اُداس سے وہ ق بولے بس دیکھتے ہی میرا مُنھ

ہم بھی غمگین سے ہیں آج، کہیں صبح اُٹھے تھے دیکھ تیرا مُنھ

سنگِ اسود نہیں ہے سنگِ بتاں بوسہ مومن طلب کرے کیا مُنھ

(۲) "زبان ہم آہنگ بیان" مثلاً یہ پوری غزل جس کا مطلع یہ ہے، ؎

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے ‌‌‌‌ فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

خصوصاً یہ اشعار تو نہایت پاکیزہ ہیں یعنی ؎

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں ‌‌‌‌ اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم ‌‌‌‌ لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھسے بھی ناداں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس ‌‌‌‌ ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

(۳) "زبان ہم آہنگ جذبات" یعنی روانی جذبات مثلاً ؎

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی ‌‌‌‌ رہ گئی بات بیقراری کی

شکوۂ دشمنی کریں کس سے، ‌‌‌‌ واں شکایت ہے دوستداری کی

یاس دیکھو کہ غیر سے کہدی، ‌‌‌‌ بات اپنی امیدواری کی

کیا مسلماں ہوئے کہ اے مومن ‌‌‌‌ حاصل اس بت سے شرمساری کی

(۴) "تشبیہات و استعارے" مثلاً ؎

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا ‌‌‌‌ دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

بجھ گئی اک آہ میں شمع حیات ‌‌‌‌ مجھکو دم سرد نے ٹھنڈا کیا

غیر عیادت سے برا مانتے، ‌‌‌‌ قتل کیا آ کے اچھا کیا

جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے ‌‌‌‌ راز میرا صبر نے افشا کیا

دشمن مومن ہی رہے بت سدا ‌‌‌‌ مجھسے میرے نام نے کیا کیا کیا

مومن کی بلند پروازی خیالات کی بلند پروازی نہیں، بلکہ جذبات و استعارات کی ہے، اگر جذبات نہ ہوتے تو ان کا کلام لکھنوی شعرا کے مشابہ ہوتا۔

اگر مومن کے انداز میں رنگ تصوف یا فلسفیانہ خیالات کی آمیزش ہوتی تو ان کا رنگ شعرائے دہلی سے ملتا جلتا نظر آتا۔ لیکن مومن نہ تو داغ ہیں نہ امیر، نہ درد ہیں نہ غالب، گو داغ اور امیر کی طرح انکین مجاز ہے، کلام درد کی طرح انکے جذبات رواں ہیں، اور غالب کا فارسی رنگ بھی ان پر غالب ہے، پھر بھی وہ سب سے الگ ہیں، انکا "عشق" بھی نیچرل ہے نہ کہ "بازاری"۔ اپنے عشق کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں، ع

"عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں"

اور اخلاقاً اس قسم کے عشق سے انکو خوف بھی ہے، جیسا کہ وہ دوسرے مصرعے سے ظاہر کرتے ہیں یعنی۔ ع

"زندگی پر وہ در نہ ہو جائے"

اگر ان کا عشق بازاری ہوتا تو ان میں خودداری نہ ہوتی، اور معشوقہ فرہاد یعنی شیریں کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر نہ کرتے کہ ؎

شوخ بازاری تھی شیریں بھی مگر — ورنہ فرق خسرو و فرہاد کیا

مومن کے خلاف غالب نے فرہاد کے عشق کو قصور وار ٹھیرایا ہے اور کہا ہے کہ فرہاد کا عشق کامل نہ تھا کیونکہ

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ — بیچارہ پائے بند رسوم و قیود تھا

غالب اور مومن کے یہ دو اشعار ترازو کے دو پلّے ہیں، ایک میں فرہاد کا عشق وزن کیا گیا ہے، دوسرے میں شیریں کا حسن، فرہاد کی یہ کمزوری ننگ عشق نہیں، لیکن بقول مومن شیریں تو معشوق بنانے کے قابل ہی نہیں، غالب حقیقت کو حقیقی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور مومن مجاز کو حقیقت کی طرف لانا چاہتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ جس سیڑھی پر غالب کا پچھلا قدم ہے اس پر مومن کا اگلا قدم، غالب اور مومن کے جذبات کا اگر مقابلہ کیا جائے تو اکثر جگہ یہ اختلاف ظاہر ہوگا مثلاً ذیل کے اشعار ؎

غالبؔ:- قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مومنؔ:- کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا،

غالبؔ:- کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مومنؔ:- کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں — گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے

مومن خاں نے قصیدہ، مثنوی، واسوخت، رباعی، مرثیہ، معمہ، سہرا، تاریخ وغیرہ بھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، یہ ان کی ہمہ گیری کی دلیل ہے، تاریخیں تو مخصوص طور پر خوب ہوتی ہیں۔ خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تاریخ وفات جو تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک مجمل مرثیہ ہے۔ واقعی ایسا فقیہ کامل کے وفات پر تو شریعت و ہدایت کی تعلیم ہند میں بہت کمزور ہوگئی بقول شاعر ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے — فقر و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اگر غزل کے لغوی معنی "سخن بازناں" کے ہیں تو مومن خاں اس مفہوم کو رنگ تغزل سے بخوبی نبھا گئے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس اعتبار سے اگر اردو زبان میں کسی نے غزل لکھی ہے تو صرف مومن نے،

مومن خود دار و صداقت شعار ہونیکے ساتھ رنگین مزاج بھی تھے، اور انکے مزاج کی رنگینی صرف شاعری تک محدود نہ تھی، ان کا دل کسی سبز خط معشوق پر نہیں آیا اس لئے انکے عشق کو، "بازاری" کہنا ظلم ہے، انھوں نے شریعت پر کوئی چشمک نہیں کی، اس لئے ان کے کلام کو "بدعت" کہنا

منصب ہے۔ اور چونکہ انکا انداز عالمانہ تھا اس لئے ان کے اشعار کو بے معنی کہنا نادانی ہے اور ان کے کلام میں عیوب تلاش کرنا خود اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے،

مومن کا کلام کلی جذبات سے بھی خالی نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں بسنت بھی ہے اور بہار بھی، ہولی بھی ہے اور نوروز بھی، در اصل خود داری کے اعتبار سے اگر وہ عرفی ہیں تو نزاکت زبان کے لحاظ سے شور داس، عشق مجازی کے اکسائے ہوئے جذبات کی تنقید میں بھی انھیں ید طولیٰ حاصل تھا، باعتبار عبرت دنیا کو وہ "زال بیسوا" نہیں کہتے، اور باعتبار تصوف خدا سے عشق کا دعویٰ کرنا ان کے نزدیک "چھوٹا منہ بڑی بات ہے"، اس لئے انھوں نے صرف یہ کہدیا کہ خدایا ؎

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیرے خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

اور نعت میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ صرف یہ شعر ہے کہ ؎

مرا جوہر ہو سرتا پا صفائے مہر پیغمبرؐ
مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا

مومن کے کلام میں تغزل کے سوائے کچھ اور تلاش کرنا سعیِ حاصل ہے، کیونکہ جس طرح میر صاحب کے نشتر جذبات کے نشتر ہیں، مومن کے طنزیہ کنائے حقیقی تغزل کے نشتر ہیں، اور نشتر نہ تو خار خیلاں ہو سکتا ہے نہ تریاق عراق ؎

جل سمندر کے پان سے پیاس نہ کا ہوں جائے
بادل دوارا جل وہی برشا سے جو آئے
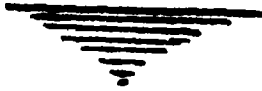
تصویر اور رسالے

(از مولوی ظہیر الدین اظہر صاحب)

آجکل ملک کے گوشہ گوشہ سے اردو رسائل واخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ اور اگر موقت الشیوع رسائل کی کثرت ہی کسی زبان کی ترقی کا سبب ہو سکتی ہے تو بہی خواہان اُردو کو مسرت ہونی چاہئے لیکن افسوس ہے کہ عام اُردو رسائل کی روش کچھ زیادہ مستحسن نہیں۔ کثرت تعداد کے ساتھ تجارت میں باہمی مقابلہ کا سوال پیدا ہوگیا۔ اور ہر رسالے کی یہ کوشش ہونے لگی کہ زیادہ سے زیادہ خریدار بہم پہونچائے۔ اگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اعلیٰ درجہ کا مفید لٹریچر پیش کرنے میں ایک رسالہ دوسرے رسالے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتا تو اس سے بہتر کیا بات تھی۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ذوق سلیم رکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ عام طور پر تو دنیا کے لوگ ظاہر پرست ہوتے ہیں شاید اسی لئے توسیع اشاعت کیلئے رسالوں کو بظاہر نظر فریب بنانے میں اتنا غلو کیا گیا کہ حسن معنوی کا لحاظ نہ رہا۔ کتابت وطباعت اور کاغذ کی عمدگی کے ساتھ ساتھ آرائش وزیبائش میں مختلف جدتیں کی گئیں۔ ٹائٹل اور تصویروں کی رنگینی اور دلکشی ہی زیبائش کا جزو لاینفک قرار پائیں چنانچہ بعض ان ماہانہ رسالوں کے علاوہ جن کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت قریب قریب تمام رسالے باتصویر شائع ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں اسکی گنجایش نہیں کہ تصویر کی ابتدائی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی جائے یا اس امر پر بحث کیجائے کہ رسالوں میں تصویروں کا رواج کب سے اور کیوں ہوا اس کے لئے ضمناً یہ تذکرہ کرنا کافی ہوگا کہ مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل غازی آباد کو خیر خواہ ہند بابت اکتوبر ۱۸۴۷ء جلد دوم کا ایک نمبر دستیاب ہوا ہے جس کے متعلق موصوف نے ایک مضمون جنوری ۱۹۳۳ء کے ہندوستانی میں شائع کرایا ہے۔ غالباً یہ رسالہ اُردو کا اولین ادبی ماہانہ رسالہ تھا جو مصور شائع ہوا۔ اُردو رسائل کے دور جدید کا آغاز اسی صدی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دور میں اوّل اوّل مخزن و زمانہ اُردو رسائل میں ایک یا دو تصویریں شائع کیجاتی تھیں جو عام طور پر مشاہیر کی ہوتی تھیں مگر چند سال گذشتہ کے بعض پنجابی رسائل نے کثرت سے ہر قسم کی تصویریں شائع کرنا شروع کردیں جسکے بدولت آج ۱۹۳۳ء میں یہ حال ہے۔ کہ تصویر رسالے کا لازمی جزو تصور کیجانے لگی ہے

ہمیں اس مضمون میں صرف اسقدر دیکھنا ہے کہ دور حاضرہ میں ہمارے ادبی رسائل کس قسم کی تصویریں شائع کر رہے ہیں اور در اصل تصویروں کی اشاعت ہونی چاہیئے یا نہیں، اور اگر ہونی چاہیئے تو کس قسم کی تصویروں کی۔

مصوری اور شاعری مقاصد کے اعتبار سے بالکل متحد ہیں جن خیالات اور جذبات کے ماتحت ایک شاعر اپنے خیالات وجذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ مصور انہیں جذبات کو مو قلم کی مدد سے نقش دلفریب کی صورت دیتا ہے۔ تخئیل دونوں میں قدر مشترک ہے۔ فطرت انسانی کو شاعری اور مصوری سے جو لگاؤ ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اس لحاظ سے کوئی باذاق شخص تصویروں کی اشاعت کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ غور طلب امر ہے کہ کس قسم کی تصویریں شائع کی جائیں۔

حالی کے زمانہ سے ابتک غزل اور عشقیہ شاعری پر جسقدر اور جس قسم کی تنقیدیں ہو چکیں اور ہو رہی ہیں انکا اعادہ یہاں پر بے محل اور طوالت کا باعث ہوگا۔ بہر نوع ملک کے گوشہ گوشہ سے سنجیدہ اور متین نظم ونثر کے لئے صدائے احتجاج بلند کی جا رہی ہے بعض حضرات نے تو اس قدر افراط وتفریط سے کام لیا اور غزل گو شعرا پر اس قدر بیجا اتہامات تھوپے کہ خدا کی پناہ۔ غزلیہ شاعری کو شہوت پرستی سے تعبیر کیا اور کسی غزل گو شاعر کو امرد پرست کہا۔ کسی کو راجہ اندر کا خطاب دیا اور کسی کو حضرت لوطؑ کی نافرمان امت سے منسوب کیا۔ غرض جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ اور مخرب اخلاق اور حیا سوز اشعار کی مخالفت کے جوش میں سرے سے غزل ہی کے مٹا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ خدانخواستہ میں اس بات کا حامی نہیں کہ خواہ مخواہ اس قسم کے اشعار لکھے جائیں جو ایک لڑکی اپنی ماں ایک بھائی اپنی بہن، اور ایک بیٹا اپنے باپ کے سامنے نہ پڑھ سکے اس قسم کے اشعار سے ہمارے شعرا کو صرف احتراز ہی نہیں بلکہ دلی نفرت کرنی چاہئے خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اہل الرائے اور مصلح اہل قلم کی مساعی مشکور ہوئیں۔ اور موجودہ زمانے میں ہمارے اکثر شعرا نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے متین اور سنجیدہ پہلو تلاش کئے اور نوے فیصدی شعرا اس منحوس وبا کے حملے سے محفوظ ہو گئے خدا کرے۔ باقی دس فیصدی شعرا بھی اس مہلک اور خطرناک مرض سے جلد شفایاب ہوں۔

لیکن احتساب کی کمی نے ہمارے رسائل کو اپنی ذمہ داریوں سے قطعی غافل کر دیا ہے۔

ادھر تو متبذل و رکیک ادب کے خلاف ہمارے اہل قلم کا یہ جہاد اور ادھر شاعری کی سگی بہن مصوری کی یہ درگت کہ اکثر رسالوں میں ایک دو فحش اور نیم عریاں تصویریں خاص خاص عنوانات کے ساتھ ضرور مل جاتی ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ سنجیدہ اور متین ادب کے علمبردار اہل قلم حضرات اسطرف کیوں متوجہ نہیں

ہوتے ہ اگر شاعری کی بدمذاقی اور فحاشی کی کچھ اصلاح ہوئی تو مصوری جو بعض علمائے تردیک شاعری سے زیادہ سریع الاثر چیز ہے اخلاق کو تباہ کر رہی ہے۔ خرابی اخلاق کے متعلق جو خطرات شاعری سے تھے وہی امکانات موجودہ مصوری سے ہیں۔ ایک شاعر کے اس شعر پر کہ ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ	دیکھا مجھے تو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

چاروں طرف سے شعر کی عدم متانت پر شور مچ رہا ہے۔ لیکن اس قسم کی تصویر کی اشاعت پر جس میں انگڑائی کے ساتھ ساتھ سینہ کا ابھار بھی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا! اگر داغ کے یہاں یہ شعر نکل آتا ہے۔ ؎

اللہ رے حجاب بدگمانی تیری	بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

تو داغ مرحوم کے پورے دیوان کو مجموعہ خرافات کہا جاتا ہے لیکن اگر کسی رسالے میں اسی شعر کے لگ بھگ بالکل عریاں تصویر مع ایک شاندار عنوان یا نظم کے شائع ہوتی ہے تو شاہکار ہے۔ غالب جیسا متین اور سنجیدہ شاعر اگر ایک کیفیت کی تصویر یوں کھینچتا ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے	کہا جو اس نے مرے ہاتھ پیر داب تو دے

تو اس کی ساری متانت اور سنجیدگی خاک میں ملادی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی رسالہ ایک نوجوان حسین، خاتون کی تصویر جس نے اپنے عاشق کے گلے میں باہیں ڈال رکھی ہوں شائع کرتا ہے تو کچھ نہیں۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں بخیال طوالت ترک کیجاتی ہیں۔

بعض رسائل اکٹریسوں اور طوائفوں کی تصویروں سے اپنے صفحات کو زینت دیتے ہیں جن رسالوں کا موضوع سائے فلم ہو ان میں اکٹریسوں کی ہیجان انگیز تصویریں شائع کیجائیں تو کوئی بات نہیں لیکن علمی اور ادبی رسالوں میں ایسی تصویروں کو جگہ دینے کی کیا تک ہے میں نہیں سمجھ سکا مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ حال ہی میں ایک نئے رسالے میں جس کے ایڈیٹر صاحب ماشاء اللہ ایم اے ہیں ہنسا بائی کی تصویر شائع ہوئی ہے یہ وہی ہنسا بائی ہیں جن کے متعلق پچھلے دنوں دہلی کی عدالت میں مقدمہ بھی چلا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ تصویر جس انداز سے کھنچوائی گئی ہے۔ اس کو اردوے جدید میں "دعوتِ شباب" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خدا معلوم ایڈیٹر صاحب کو اپنے ذوق حسن پرستی کی نمائش کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ بعض ایڈیٹر صاحبان کی پستی مذاق کا تو یہ عالم ہے کہ انھیں یورپ کے فحش اور نیم عریاں تصویر کارڈوں کے بلاک بنوا کر شائع کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ بعض رسائل ایسے بھی ہیں کہ وہ اس قسم کی فحش اور عریاں تصویریں شائع نہیں کرتے بلکہ ان میں ایک حد تک سنجیدگی ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے انکے یا ایڈیٹر صاحب کی فن تصویر

سے عدم واقفیت کی بنا پر ان میں بھی کبھی غلط اور عنوان سے غیر متعلق تصویریں شائع ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ مخرب اخلاق اور حیا سوز تو نہیں ہوتیں مگر مذاق سلیم ضرور مجروح ہو جاتا ہے مثال کے طور پر ایک تصویر کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ ماہ فروری ۱۹۳۳ء کے ایک رسالہ میں ایک تصویر بعنوان "مرحوم شوہر کے مزار پر" شائع ہوئی ہے۔ اگر تصویر کے ساتھ عنوان نہ ہوتا تو غالباً دیکھنے والوں کی توجہ مصور کے خیال کیطرف منعطف نہ ہو سکتی تھی۔ ایک نوجوان حسین عورت انتہائی رنج و غم کی حالت میں گردن جھکائے کھڑی ہے اس کے سامنے پتھر کی جالی ہے جس سے شاید مزار کا کٹہرہ دکھانا مقصود ہے۔ عورت سر سے پاؤں تک زیورات سے لدی ہوئی ہے اور اپنی آرایش اور زیبایش کے لحاظ سے بیوہ نہیں دلہن معلوم ہوتی ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک متوسط الحال ماں باپ کی لڑکی اور شوہر کی بیوی جو آج ہی عقد کے بعد رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر آئی ہو اس سے زیادہ آراستہ نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کا دستور ہے کہ شوہر کے انتقال کے بعد فوراً اسی وقت زیورات، رنگین لباس، غرضکہ جملہ سامان آرایش عورت سے علحدہ کر دیا جاتا ہے تا وقتیکہ وہ عقد ثانی نہ کرے بعض جماعتوں میں مذہباً اور بعض میں رواجاً اسے کسی طرح کے سنگار یا آرایش کرنیکا حق حاصل نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا امور کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تصویر کو کس طرح صحیح کہا جا سکتا ہے؟ ایک بیوہ کا اس طرح آراستہ ہو کر شوہر کی قبر پر جانا قطعی خلاف فطرت اور کم از کم ہندوستانی رواج کے خلاف تو ضرور ہے۔ اس تصویر کا فطرت اور ملکی رسم و رواج کے خلاف ہونا اس بدنصیب بیوہ کی طرف سے ہمدردانہ جذبات کو بالکل فنا کر دیتا ہے اور دیکھنے والوں کا دماغ تصویر کے اغلاط کیطرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر اسی تصویر میں اس بیوہ کو سوگ کے لباس میں پیش کیا جاتا تو یقیناً تصویر کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اگرچہ اس غلطی کی تمام تر ذمہ داری مصور پر عائد ہوتی ہے مگر ایڈیٹر صاحب بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ اس قدر غلط تصویر کو اپنے رسالہ میں کیوں جگہ دی اور سب پر مستزاد یہ کہ "مرحوم شوہر کے مزار پر" کے عنوان سے ایک نظم بھی شائع کر دی جسکے مضمون سے تصویر کو کچھ یونہی سا تعلق ہے۔ بہر حال اس قسم کی غلط اور فحش تصویروں کے انسداد کی کوشش کرنی چاہئے اور مہذب اور شایستہ تصویریں شائع کرنی چاہئیں ورنہ ان بظاہر نظر فریب اور دلکش رسالوں سے وہ رسالے جو سادہ اور غیر مصور شائع ہوتے ہیں بدرجہا بہتر ہیں۔

ادبی رسالوں میں جو تصویریں شائع ہوں اُنسے ادب کو بھی تو کوئی واسطہ ہو۔ سیاسی، مذہبی، یا ادبی مشاہیر کے فوٹو شائع ہونے چاہئیں۔ یا پھر ایسی تصویریں شائع کیجائیں جنمیں کسی نفیس اور پاکیزہ خیال کی نقاشی کی گئی ہو، یا مناظر قدرت کا عکس ہو، اور اگر نقوش حسن و عشق کی اشاعت ہی منظور ہو تو پھر عشق و ہوس میں کوئی امتیاز ہونا چاہیئے۔

اشک حسرت

(از سید محبوب حسین اجمیری)

دنیا میں سکوت نیم شبی طاری تھا، ذرہ ذرہ محو خواب تھا، اور میں اپنے غم آلود جذبات کے آغوش میں ساکت، یکایک خیالات میں تلاطم ہوا، کتاب زندگی کے ورق کھل گئے، اور مجھے اپنا حسین و معصوم عہد طفلی یاد آگیا جب لوگ میری ضدیں پوری کرتے تھے، شاہوں کا عزل و نصب میرا کھیل تھا، لکڑی کے گھوڑے کو میں سرپٹ بھگایا کرتا تھا۔ ہاں میں مجسم شادمانی تھا۔ مگر آہ اب نہ وہ دن ہیں نہ وہ راتیں۔ میرے لبوں کا تبسم غائب ہوگیا، سینہ چاک ہے، غموں کی یورش ہے، میری شہنشاہی ختم ہوگئی، اب میری دلکش دنیائے تصور پر کس کی حکومت ہے، میرے خیالات پر کس کا قبضہ ہے میری تیرہ و تار زندگی مہیب اور خوفناک مرحلوں سے گذر رہی ہے، میری روح کسی کی جستجو میں پریشان ہے۔ میں تکلیفوں کے خون آلودہ آستانہ پر جبیں سائی میں مصروف ہوں۔ میرے دل کی بے پایاں گہرائیوں میں کسی کی طلب ہے، میری آنکھوں سے جوئے خون جاری ہے، جگر میں ناسور ہے۔

برکھا رت آئی اور چلی گئی، سردیاں آئیں اور گذر گئیں، گرمی شروع ہو کر ختم ہوگئی، رات دن میں اور دن رات میں بدلتا رہا، مگر یہ محبت کیش کسی کی یاد کی مالا جپتا ہی رہا ہے، کسی تغافل شعار کی مفارقت میں گل بداماں ہے، اب بھی رات کے پرسکون لمحات میں یہ وفا شعار گڑگڑا کر التجا کیا کرتا ہے، اے کاش اب بھی کوئی اسکی طرف متوجہ ہو کہ اسکی کاوشوں کی داد دے اور مجبور و مہجور کا خیال کرے، آہ یہ حرماں نصیب کسی کے نغمۂ شیریں کے لئے ہمہ تن منتظر ہے۔

جذبات کا غلبہ ہوا اور آنکھوں سے چند دُرِ ناسفتہ دامن پر گر گر کر غائب ہوگئے لیکن پھر بھی سکون خاطر نصیب نہ ہوا کیونکہ ان شفاف موتیوں میں بھی تیرا عکس موجود نہ تھا اے کاش سے

یہی آنسو کے قطرے گوہر مقصود بن جاتے
جو آجاتا تمہارا عکس میرے دیدۂ تر میں

تنقید کتب

بھگوت گیتا کے اُپدیش

یہ کتاب شریمد بھگوت گیتا کی بنیاد پر رادھا سوامی ست سنگ بھاویال باغ آگرہ کے صاحب جی مہاراج رائے بہادر سری یت آنند سروپ صاحب نے اپنے ست سنگی بھائیوں اور دیگر پریمیوں کیلئے تصنیف فرمائی ہے۔ خود شریمد بھگوت گیتا پر تنقید یا تبصرہ کرنا تو انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بھگوان کرشن کا یہ اپدیش جو ارجن کو کورکشتر کے میدان جنگ میں دیا گیا تھا۔ "مہابھارت" کے "بھیشم پرب" (باب) کا ایک حصہ ہے جسے بیاس جی نے تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح بصورت مکالمہ تحریر فرمایا تھا۔ گیتا کی تصنیف کی یہ مدت اس لئے معین کی گئی ہے کہ یہ اپنشدوں کے بعد کی تصنیف ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اسمیں اپنشدوں کی سطریں بجنسہ نقل ہیں۔ سانکھیہ و یوگ فلاسفی کا بھی اس میں مفصل ذکر آیا ہے جو پتنجلی منی سے منسوب ہیں جن کا زمانہ تقریباً دو سو برس قبل از مسیح تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہندو اوتاروں میں سری رامچندر جی اور سری کرشن جی کو وشنو کا مکمل اوتار مانا جاتا ہے۔ رامچندر جی وشنو جی کے مظہر جمالی ہیں۔ اور کرشن جی مظہر جلالی ہیں گیتا میں جو کچھ مواعظ حسنہ درج ہیں۔ ان کا ہندوؤں میں خاص احترام کیا جاتا ہے۔

گیتا کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ کائنات میں دو قوتیں کار فرما ہیں۔ جن میں ایک فانی ہے اور دوسری لافانی۔ تمام موجودات فانی ہے اور تغیر و تبدل سے آزاد آتما لافانی ہے۔ ان دونوں سے افضل ایک تیسری طاقت ہے جو سب جگہ حاضر و ناظر اور جاری و ساری ہے۔ تین لوک کی پرورش اسی طاقت عظمیٰ کا کام ہے جسے پرشوتم کہتے ہیں۔ اسی سے واصل ہونا روحانی ترقی کی منزل اعلےٰ ہے۔ اگرچہ کرشن بھگتی پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن گیتا میں رہبانیت یا ترک فعل کو پسند نہیں کیا گیا۔ فرمایا ہے کہ:-

"یگیہ کرموں کے ذریعہ سے انسان دیوتاؤں کو خوش کر کے دنیوی سامان حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن دیوتاؤں کی پرستش کرنیوالوں کی صرف دیوتاؤں کے دنیا میں رسائی ہوتی ہے۔ اور کچھ مدت کے لئے بعد میں ان کو اسی دنیا میں پھر واپس آنا پڑتا ہے اور سانکھیہ درشن کی تعلیم کے بموجب گیان کے ذریعے

انسان کی آتما مادی آلودگیوں سے منزہ ہو کر انسان موت و حیات کے چکر سے چھوٹ جاتا ہے ۔۔
...... انسان کے لئے فعل یعنی کرم کا تیاگ ناممکن ہے۔ فعل کے بغیر انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔"
بھگوت گیتا کے تیسرے ادھیائے میں جو مندرجہ ذیل نصیحت کی گئی ہے وہ انسان کے لئے بہترین درس عمل اور خضر راہ ہدایت ہے فرمایا:۔

"اے ارجن! تینوں لوک میں کون ایسا کام ہے جو مجھے کرنا لازمی ہو؟ یا ایسی کون سی چیز ہے جسکے حصول کی کوشش مجھ پر واجب ہو؟ لیکن بایں ہمہ میں کرم کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں اگر کرم کرنے میں سستی دکھاؤں تو میری دیکھا دیکھی سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائینگے جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تینوں لوک بہت جلد نشٹ ہو جائینگے۔" وغیرہ (شلوک ۲۲-۲۳ و ۲۴)

اچھوتوں کے متعلق بھی گیتا کا فیصلہ ناطق ہے۔ تاریخی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو موجودہ رسم و رواج کی بنیاد منوسمرتی پر قائم ہے جس میں ورن آشرم کی بنیاد "جنم" پر قائم کی گئی ہے۔ منو جی بقول محققین دو سو برس قبل مسیح گذرے ہیں۔ گیتا منوسمرتی سے پانچ سو برس پیشتر لکھی جا چکی تھی۔ بہر حال گیتا میں ورن آشرم کی بنیاد بجائے جنم کے "کرم" پر رکھی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"دنیا میں گن اور کرم کے فرق کی بنیاد پر میں نے چار ورن رچے ہیں" (ادھیائے ۴ شلوک ۱۳)

"برہمنوں، کشتریوں، ویشیوں، اور شودروں کے جو الگ الگ کرم" (فرائض) قائم کئے گئے ہیں۔ وہ خود ان کے سوبھاؤں کے گنوں کے حساب سے مقرر کئے گئے ہیں" (ادھیائے ۱۸ شلوک ۴۱)

مندرجہ بالا شلوکوں سے صاف ظاہر ہے کہ ہر شخص کو افعال و اعمال کی وجہ سے اخلاقی درجہ ملتا ہے۔
ہمارے نزدیک صاحب جی مہاراج نے یہ کتاب لکھ کر اردو ہندی داں اصحاب پر احسان عظیم کیا ہے۔ اسکی زبان میں صفائی اور سلاست کا کافی خیال رکھا گیا ہے۔ حتی کہ معمولی سمجھ بوجھ کا شخص بھی کتاب کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کاغذ سفید قیمتی، کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ اسٹور کیپر رادھا سوامی سنٹرل ست سنگ دیال باغ آگرہ

تخت طاؤس

مصنفہ مولوی محمد عبداللطیف خاں صاحب گشتہ۔ قادری منشی فاضل (آنرز ان پرشین) مطبوعہ لاہور رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز، کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ

قیمت ہہر (مجلد مع نام بحروف طلائی)

کتاب کے نام سے تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب دولت مغلیہ کے پانچویں شہنشاہ شاہجہاں کے شہرۂ آفاق "تخت طاؤس" کے تاریخی حالات ہیں لیکن فی الحقیقت فاضل و محقق مصنف نے اس میں مختلف حواشی کے ذریعہ دریا کو اس طرح کوزہ میں بند کر دیا ہے کہ کتاب نہ صرف عہد شاہجہانی بلکہ سلطنت مغلیہ کے متعلق واقعات و اشخاص کی ایک مکمل تواریخ بنگئی ہے۔ فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسمیں بہت کچھ دماغ سوزی اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔

شروع کتاب میں چالیس صفحات پر مشتمل سید ظہیر الدین احمد علوی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل مین پوری کا لکھا ہوا "تعارف و تبصرہ" بھی ہے۔ جسکے ابتدائی پندرہ صفحات میں مصنف کتاب کے حالات زندگی اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا حال بیان کیا گیا ہے بقیہ صفحات میں کتاب پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ جس میں کتاب کی تمام خوبیاں مفصل بیان کر دیگئی ہیں۔ ہمکو افسوس ہے کہ اس تنقید میں بعض بعض مقامات پر اس قدر مبالغہ اور غلو سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے پروپگنڈا کی بو آتی ہے۔ اس کتاب کا ایک دوسرا نقص یہ ہے کہ اس کا طرز تحریر غیر ضروری حد تک عالمانہ ہے۔ یعنی جس چیز کو سلاست زبان کہتے ہیں وہ اس میں مفقود ہے۔ اکثر مقامات پر صاحب تبصرہ اور خود لائق مصنف نے ایسے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ استعمال کئے ہیں جو مذاق سلیم کو گراں گذرتے ہیں۔ وہی مفہوم جو ان فارسی و عربی کے الفاظ یا اصطلاحات سے ادا کیا گیا ہے۔ اردو کے معمولی اور عام الفاظ سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ نمونۃً ہم یہاں پر اس کتاب کے چند الفاظ درج کرتے ہیں تاکہ اگر مناسب سمجھا جائے تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو جائے۔

(۱) سُرر جمع سریر بمعنی تخت۔ (۲) صخور جمع صخرہ بمعنی پتھر، چٹان، اسی سلسلہ میں انگریزی اصطلاح (Igneous Rocks) کا ترجمہ ناری الاصل صخور" کیا گیا ہے۔ (۳) مجوف (کھوکھلا) (۴) طواویس جمع طاؤس بمعنی مور پرندہ (۵) احتکاک بمعنی رگڑ (Friction) (۶) نفط بمعنی مٹی کا تیل۔ (۷) احیاض جمع حوض بمعنی معروف (۸) حبشی اللون حلب متحجر بمعنی پتھر کا کوئلہ اگر زیادہ ضرورت تھی تو لفظ "زغال" استعمال کیا جا سکتا تھا جو فی زمانہ مستعمل ہو چلا ہے۔ (۹) ازہار جمع زہرہ بمعنی پھول (۱۰) دنی القدرت بمعنی تھوڑی سی یا قلیل۔ (۱۱) اتخاذ بمعنی خلاصہ عربی ماخذ سے نکلا ہے۔ (۱۲) صلد بمعنی ٹھوس انگریزی (Solid) (۱۳) اقمشۂ نفیسہ بمعنی عمدہ عمدہ چیزیں۔ (۱۴) عطایا و نوال بمعنی بخشش و سخاوت۔ (۱۵) مخطط بمعنی خط کشیدہ (Under-lined)

مگر اس کے باوجود کتاب خوب ہے۔ اور ایک بہت بڑی تاریخی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس قابل ہے کہ کتب خانوں میں رکھی جائے۔

معاشیات، مقصد اور منہاج [1]

یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پی ایچ ڈی۔ پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ان عالمانہ تقریروں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ الہ آباد کی دوسری ادبی کانفرنس میں پڑھی تھیں اب یہ اکیڈیمی ہی کیطرف سے ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں معاشی زندگی کی تشکیل کے امکانات، رجحانات اور لوازمات کا ایک نظری خاکہ پیش کیا ہے۔ تمدن کے ہر دوسرے شعبہ کی طرح معیشت انسانی پر نظر ڈالنے کے تین مختلف طریقے ممکن ہیں۔ یعنی (۱) مابعد الطبیعی نقطۂ نظر۔ (۲) علوم طبیعی کا نقطۂ نظر۔ اور (۳) علوم تمدنی کا نقطۂ نظر گویا معیشت کا علم یا تو معیاری علم ہو سکتا ہے۔ یا ترتیبی۔ یا افہامی۔ اور یہی تین شکلیں اس علم نے اختیار بھی کی ہیں۔ اور فاضل مصنف نے انھیں تینوں نقطہائے نظر سے معاشیات پر بحث کی ہے۔

فاضل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا تبحر علمی محتاج تشریح نہیں ہے، اس کتاب کی خوبیوں کے متعلق صرف اسکے مصنف کا نام کافی ہے حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس تصنیف سے زبان اُردو پر احسان عظیم کیا ہے۔ آپ نے حتی المقدور اسکو عام فہم اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس کا مفہوم ادق ہے، جس کی وجہ سے بعض مقامات پر طرز بیان خشک اور عام طبقہ کی فہم سے کسی قدر بالا ہو گیا ہے۔ بہرحال اردو ادب میں اس کتاب سے ایک قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

گلدستۂ محاورات اُردو [2]

مصنفہ مولوی عابد حسین خاں صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول منشی گنج شہر الہ آباد۔

سوا دو سو صفحے [۲۲۵] کی یہ ایک چھوٹی سی کتاب ایک کوزہ ہے جس میں اردو محاورات کا دریا بحسن و خوبی بند کر دیا گیا ہے۔ اس میں کل ۲۳ ابواب ہیں جن کی ترتیب بحساب حروف تہجی کیگئی ہے لائق مصنف نے اس میں دو ہزار کے قریب اردو محاورے درج کرکے ان کے معنی کی تشریح کی ہے اور ثبوت میں اساتذہ

---

[1] قیمت عہر ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد

[2] قیمت ۱۲ار ملنے کا پتہ:۔ خدیجہ خاں صاحب ۲۳۴۔ پرانی منڈی الہ آباد۔

کے کلام سے سند بھی پیش کی ہے اور حسب ضرورت نثر کے فقرے درج کر کے محاورہ کا محل استعمال بھی بتایا ہے۔ مندرجہ ذیل نمونوں سے کتاب کی خوبیوں پر کافی روشنی پڑیگی:-

اجارہ کرنا۔ ذمہ لینا ؎

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو وہ سن کے بلالیں یہ اجارہ نہیں لیتے

فقرہ:۔ محنت کرنا ہمارا کام ہے مگر محمود ہم تمہارے پاس کرانے کا اجارہ نہیں لیتے۔

ٹھیک بنانا:۔ سزا دینا۔ گوشمالی کرنا ؎

اے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

فقرہ:۔ محبوب اگر تم نے شرارت نہ چھوڑی تو میں تمھیں ٹھیک بنا کر چھوڑوں گا۔

جان جوکھوں:۔ جان کا خطرہ ؎

اٹھا آ عشق میں کیوں اے دلِ ناداں جوکھون ہے ابھی تو ماں جوکھوں ہی پھر آگے جان جوکھوں ہے
(ذوق)

فقرہ:۔ ایسے پرانے اور اندھیرے کنویں میں گھسنا جان جوکھوں ہے۔

الغرض فاضل مؤلف نے اشعار کے انتخاب میں حتی الامکان غور و فکر اور محنت سے کام لیا ہے اور ایسے شعر درج کئے ہیں جو زبان اور خیال دونوں لحاظ سے موزوں ہیں۔ فقرے بھی آسان اور روزمرہ کی زندگی سے متعلق لکھے ہیں اگرچہ یہ کتاب برائے استفادہ طلباء مرتب کی گئی ہے لیکن اس سے عوام بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

سرکار دو عالم ؐ

یہ کتاب مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے سیرت محمدیؐ پر شائع کی ہے چھوٹی تقطیع کے ۱۳۹ صفحے ہیں جنمیں رسول عربی کی زندگی کے تمام حالات، شمائل و خصائل، معاشرت، اقوال و افعال، غزوات و دیگر حالات مجملاً سب آگئے ہیں۔ شروع میں عرب، باشندگان عرب، مذاہب و معاشرت عرب پر بھی مختصراً بحث کی گئی ہے۔ طرز ادا دلچسپ اور موثر ہے۔ جس سے ہر قوم و مذہب کا معمولی لکھا پڑھا

سالہ قیمت ۸ ر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

آدمی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ زیادہ زور رسول عربی کی پرائیویٹ زندگی اور اخلاق پر دیا گیا ہے۔
اس کتاب میں ایک ذراسی کمی یہ رہ گئی ہے کہ کتاب کے صفحہ ۱ سطر میں لکھا ہے "نقشہ میں دیکھو" حالانکہ کتاب میں کوئی نقشہ نہیں ہے۔

سالنامہ رسالہ کارواں لاہور ۳۳ء

محلہ چابک سواران لاہور سے پروفیسر تاثیر ایم۔ اے کی ادارت میں ۱۴۲ صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ نکلتا ہے۔

پنجاب کو عموماً اور لاہور کو خصوصاً اگر رسالوں اور اخباروں کا گھر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آئے دن نت نئے رسالے اور اخبار نکلتے رہتے ہیں۔ ان رسالوں میں کارواں بھی ہے جو سال بھر میں صرف ایک مرتبہ بصورت سالنامہ شائع ہوا کرے گا۔

محاسن ظاہری یعنی لکھائی چھپائی آرائش و زیبائش اور کاغذ کے اعتبار سے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سالنامہ کارواں لاہور سے زیادہ "حسین و جمیل" رسالہ اس سال ہندوستان میں کوئی دوسرا شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن مضامین کے اعتبار سے ہم کو اسے دیکھکر بہت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ اس میں ڈھائی ڈھائی اور تین تین سطروں کی عبارتوں کو بھی "مضامین" میں شمار کر لیا گیا ہے۔ دراصل صفحہ ۵۷ پر ایک "مضمون" زیر عنوان "بچہ کی موت پر" صرف نصف سطر کا ہے۔

اس رسالہ کے بعض مضامین نظم و نثر بہت گرانقدر اور قابل تعریف ہیں۔ مثلاً "جاوید نامہ" "پہلا صفر" "جدید ہندوستانی مصوری" "جدید تھیٹر اور ڈرامہ" "اردو شاعری کا مستقبل اور رکاوٹیں" "قصہ چہار درویش" عبدالحلیم شرر" وغیرہ لیکن اسکے ساتھ ہی ہمکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے بعض مضامین نظم و نثر بہت ہی معمولی قسم کے درج کر دئے گئے ہیں۔ مثلاً ہمکو تعجب ہے کہ نظم "دعائے صحرا" کو اس پرچے میں کیوں جگہ دیدی گئی۔ اگرچہ اس کے پہلے دو شعر تو بہت اچھے اور صاف ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ نظم بہت کمزور ہے۔ البتہ اسی شاعر کی دوسری نظم "تین نغمے" نہایت بلند پایہ نظم ہے۔ اس رسالہ کے مضامین کی ترتیب میں تناسب کا بھی خیال نہیں رکھا گیا مثلاً صرف مصوری اور متعلقات آنحضرت صلعم سے زیادہ مضامین درج کر دئے گئے ہیں۔

بہرحال جہاں گل ہوتے ہیں وہاں خار بھی ہوتے ہیں۔ اور گل و خار دونوں ملکر زینت چمن کی تکمیل کرتے ہیں۔ کارواں کا یہ سالنامہ اس قابل ہے کہ ہر شخص اس کا مطالعہ کرے اور کتبخانوں میں رکھا جائے۔

قیمت ع۸ر ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب رسالہ کارواں چابک سواران لاہور۔

سرما نمبر بزم خیال شیلانگ

یہ رسالہ لیاقت علی صاحب صدیقی عاشق شرقی کی ادارت میں گورنمنٹ آسام کے صدر مقام شیلانگ سے ۱۴۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ جو مختلف قسم کے ۴۳ مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ بعض مضامین گراں پایہ ہیں۔ ملا رموزی کا "غصہ" بہت پر لطف ہے۔ جو رسالہ عالمگیر سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر مضامین بھی دوسرے رسالوں سے ماخوذ ہیں۔ انتخاب اچھا ہے اگرچہ ترتیب مضامین پر مولویت کا رنگ غالب ہے کاغذ معمولی، لکھائی چھپائی بھی کچھ اچھی نہیں لیکن آسام جیسے دور افتادہ مقام میں یہ بھی غنیمت ہے رسالہ کا عام چندہ تین روپیہ سالانہ، اور اس خاص پرچہ کی قیمت غالباً عہر ہے جو بہت زیادہ ہے۔ رسالہ مصور ہے۔

سالنامہ ۳۳ء سدا بہار لاہور

یہ علمی ادبی و تاریخی مضامین سے معمور رسالہ مسٹر گمبیر داس چوپڑہ کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ رسالہ کے دو حصے ہیں ایک ادبی، اور دوسرا فلمی جسکے مدیر کے شرما صاحب ہیں اول حصہ میں ۸۰ مضامین نظم و نثر ہیں۔ اور فلمی حصہ آٹھ دلچسپ مضامین پر مشتمل ہے۔ رسالہ بعض قابل قدر مضامین اور نظموں، اور جاذب نظر و قابل تعریف تصویروں کا حامل ہے۔ ترتیب مضامین بھی اچھی ہے۔ کاغذ عمدہ، طباعت و کتابت نفیس ہے۔ عام چندہ سالانہ دو روپیہ پندرہ آنہ، اور سالنامہ کی قیمت ۱۲/ ہے۔ رسالہ ہر طرح سے قابل قدر ہے۔

اقبال (وزیرآباد پنجاب)

اس نام کا ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت قاضی محمد رمضان صاحب تبسم قریشی و زیر سرپرستی نواب احمد یار خاں دولتانہ ۲۰×۳۰/۸ کی تقطیع پر جنوری ۱۹۳۳ء سے ۲½ جزو پر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ترتیب مضامین اکثر پنجابی رسالوں سے اچھی ہے، مارچ نمبر میں "نیکی کا بدلہ" فسانہ بہت دلچسپ اور پر اثر ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ٹائیٹل سادہ۔ قیمت سالانہ عہ

یادِ رفتگاں

جام صاحب نوانگر

لفٹنٹ کرنل مہاراجہ شری رنجیت سنگھ معروف بہ جام صاحب والی ریاست نوانگر کاٹھیاواڑ۔ جی، سی، ایس، آئی۔ جی، بی، ای۔ کے، سی، ایس، آئی جن کے انتقال سے رؤسارِ ہند کی جماعت کو ایک غیر معمولی صدمہ پہونچا ہے۔ ماہ ستمبر ۱۸۷۲ء میں بمقام سرودر کاٹھیاواڑ پیدا ہوئے تھے۔ آپ جیون سنگھ جی کے دوسرے صاحبزادہ تھے۔ انہیں ان کے عم بزرگوار سرو بھے سنگھ جی جام صاحب نوانگر نے تبنٰی کر کے اپنا ولیعہد بنا لیا تھا۔ آپ کی گدی نشینی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ بات یہ ہے کہ سرو بھے سنگھ جی جام نوانگر کی تیرہ یا چودہ رانیاں تھیں لیکن ان میں کسی کے بطن سے بھی کوئی اولاد زندہ نہیں بچی۔ راجپوت رانیوں کے علاوہ سرو بھے سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں جام نگر کے ایک مسلمان خاندان کی چار حسین و جمیل بہنوں سے بھی شادی کر لی تھی لیکن ان میں سے کسی کے لڑکے کو ریاست کی گدی نشینی کا قانونی حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۸۵۶ء میں مسلمان بیویوں میں سے سب سے بڑی بیوی کے بطن سے ایک لڑکا کالوجی یا کالو بھائی نامی پیدا ہوا جسے ۱۸۷۶ء میں ریاست کا جائز ولیعہد تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں کالوجی کے بھی ایک لڑکا لاکھوجی پیدا ہوا۔ مگر ۱۸۸۴ء میں کالوجی معتوب ہو کر ولیعہدی سے محروم کر دیا گیا۔ اور اس کے خلاف اپنے والد مہاراجہ صاحب کے خلاف سازش کرنے کا الزام عائد کیا گیا جسکی علت میں کالوجی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اور اب ریاست نوانگر پھر بغیر کسی ولیعہد کے رہ گئی، کیونکہ باپ کے ساتھ اس کا بیٹا لاکھوجی بھی معتوب ہو گیا۔

اس کے بعد سرو بھے سنگھ جی نے ایک بچہ تبنٰی کیا جو دو سال بعد فوت ہو گیا۔ بالآخر مہاراجہ کی نظر انتخاب رنجیت سنگھ جی پر پڑی۔ اور حکومت ہند سے اُن کی نسبت او۔ ولیعہدی کی منظوری حاصل کی گئی۔ لیکن یہ منظوری اس شرط سے ملی کہ اگر جام صاحب کی کسی راجپوت رانی سے کوئی مہاکمار

پیدا ہو تو ریاست کا جائز مالک وہی قرار پائیگا۔ بہر نوع اس کے بعد رنجیت سنگھ جی کو راجکمار کالج راجکوٹ میں تعلیم کی غرض سے بھیجا۔ ادھر ۱۸۸۲ء میں جام صاحب کی دوسری مسلمان بیوی سے ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام جسونت سنگھ رکھا گیا۔ چنانچہ اس کے لئے بھی وراثت کا جھگڑا شروع ہوگیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا نے معاملہ کی تحقیقات کے بعد جسونت سنگھ کو ولیعہد تسلیم بھی کرلیا۔ چنانچہ یہ ۱۸۹۵ء میں ریاست نوانگر کی گدی پر بیٹھا اور رنجیت سنگھ مرحوم کے لئے ریاست کے خزانہ سے دس ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ منظور کیا گیا۔ یہ معاملہ پارلیمنٹ تک پہونچا مگر وزیر ہند نے جسونت سنگھ ہی کو برقرار رکھا۔ ریاست نوانگر کاٹھیاواڑ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کا رقبہ ۳۰۹۱ مربع میل اور آبادی پانچ لاکھ ہے۔ ریاست کی طرف سے چونسٹھ ہزار چھبیس روپیہ کا خراج مہاراجہ گیکواڑ بڑودہ کو اور پچاس ہزار تین سو بارہ روپیہ برٹش گورنمنٹ کو دیا جاتا ہے۔

اس اثنا میں رنجیت سنگھ نے راجکمار کالج راجکوٹ میں کرکٹ کھیلنا شروع کردیا تھا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر وہ مارچ ۱۸۸۸ء میں کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے اور یہاں انھوں نے کرکٹ کی دنیا میں "رنجی" کے نام سے غیر معمولی شہرت حاصل کرلی۔ اور اس میدان میں "جہان پہلوان" (World Champion) کہلائے۔

کیمبرج پہونچکر تعلیم کے علاوہ رنجیت سنگھ جی خاص انہماک کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہوگئے اور بڑے بڑے ماہرین فن اور پیشہ ور کھلاڑیوں سے داد تحسین لی۔ کرکٹ کے ساتھ ٹینس کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ اور ۱۸۹۰ء میں انھوں نے ای۔ رینشا کو شکست دی جو اس زمانہ میں چوٹی کا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ بہر حال ۱۸۹۳ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کرکٹ کا بہت اچھا کھلاڑی تسلیم کرلیا گیا۔ اور وہ اپنا پہلا میچ "بنٹلین ٹیم" کی طرف سے "پلیرز ٹیم" کے خلاف کھیلے جس میں اُنھوں نے فن کرکٹ بازی کا وہ کمال دکھایا کہ آئندہ سال انگلستان کے اضلاع نے ان کو اپنی طرف سے کھیلنے کی دعوت دی۔

رنجیت سنگھ جی نے سسکس ٹیم میں شامل ہو کر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں ان کا سب سے پہلا بڑا کرکٹ موسم شروع ہوا۔ اور سسکس کی ٹیم نے ۱۸۹۵ء لغایتہ ۱۹۰۲ء جتنے میچ کھیلے ان سب میں سب سے زیادہ رن رنجیت سنگھ جی کے تھے۔ ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۰ء میں وہ کرکٹ میں "آل انگلینڈ چمپیئن" (انگلستان بھر میں چوٹی کا کھلاڑی) ہوگئے۔ اور ایک فصل میں ۳۰۰۰ رن کئے جن کا اوسط فی میچ ۵۹٫۹۱ رہا تھا۔ رنجیت سنگھ یا "رنجی" کے کھیل کی خوبی یہ تھی کہ وہ نہایت تیز اور چابکدست ہونے کے ساتھ نہایت سکون و سکوت سے کھیلتے تھے جس میں نمود و نمائش کا کوئی رنگ نہ ہوتا تھا۔ جب تک گیند

اُن کے سامنے آکر نہ پڑتا تھا اُس وقت تک وہ خاموش اور ساکن کھڑے رہتے تھے لیکن گیند کا پڑنا تھا کہ ان کا بیٹ بجلی کی طرح چمکا اور گیند کا پتہ نہ لگا۔ کرکٹ کی دنیا میں "رنجی" پہلے شخص تھے جنھوں نے ایک فصل میں تین ہزار رن کئے۔ اور مسلسل تین سال تک یہ کمال دکھاتے رہے۔ یارک شائر کے خلاف ایک میچ ہوا جس میں اُنھوں نے ایک ہی دن میں دو مرتبہ (اننگ) سو سو سے زیادہ رن کئے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں وہ سسکس ٹیم کے کپتان ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں تمام انگلستان کے بہترین کھلاڑیوں میں سے منتخب کر کے ایک ٹیم بنائی گئی جس کا نام "آل انگلینڈ اسٹوڈ ارٹس ٹیم" رکھا گیا۔ یہ ٹیم سنہ ۱۸۹۷-۹۸ء میں آسٹریلیا میں جا کر کھیلی۔ اس میں "رنجی" بھی تھے۔ سنہ ۱۸۹۹ء کے موسم خزاں میں وہ ایک ٹیم کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کو لے گئے۔ دوسرے سال یعنی سنہ ۱۹۰۰ء میں انھوں نے ایک فصل میں پانچ مرتبہ "دو دو سو" رن کئے۔ "رنجی" فی الحقیقت کرکٹ کی دنیا کے "شہنشاہ" تھے۔ مادر ہند نے ایسا شاندار اور نامور کرکٹ باز آج تک پیدا نہیں کیا۔ بڑے بڑے مشہور انگریز ماہرین کرکٹ کا فتوی ہے کہ ایسا "بیٹ" ایسا فیلڈر اور ایسا کپتان کبھی پیدا نہیں ہوا۔ یعنی "رنجی" تینوں خصوصیات میں لاثانی تھے۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ لنچ کے وقت پیشہ ور اور شوقین کرکٹ باز علحدہ علحدہ کھانا کھاتے تھے لیکن رنجیت سنگھ نے سب سے پہلے یہ رسم توڑی۔ آپ نے فن کرکٹ بازی پر ایک مستند کتاب چھوڑی ہے جس کا نام "جوبلی بک آف کرکٹ" ہے۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں بمقام برائٹن سسکس اور لنکا شائر کے درمیان ایک میچ ہوا جس میں لنکا شائر کی طرف سے "رنجی" نے ۲۰۷ رن کئے اور پھر بھی "آؤٹ" نہیں ہوئے۔

گدی نشینی | مہاراجہ جسونت سنگھ نے جام نوانگر ہو کر آٹھ سال تک حکومت کی۔ مگر وہ لاولد تھے اس لئے ان کی وفات کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے رنجیت سنگھ جی کے حق میں فیصلہ کیا جسے لارڈ منٹو نے منظور کر لیا۔ اور مارچ سنہ ۱۹۰۷ء میں کرکٹ کی دنیا کا "شہنشاہ رنجی" گدی نشین ہو کر جام صاحب نوانگر کہلایا۔ جس چیز نے ان کی گدی نشینی میں مدد دی، وہ ان کی کرکٹ میں ہر دلعزیزی تھی کیونکہ انگلستان میں اسکول کا کوئی لڑکا ایسا نہ ہوگا جو "رنجی" کا نام احترام کے ساتھ نہیں لے گا۔

خدمات | ایک فرمانروا کی حیثیت سے جام صاحب انتہا درجہ کے مطلق العنان تھے۔ اور ان کی سختی بعض اوقات اس حد تک پہونچ جاتی تھی کہ اُن کی رعایا اس کو "ظلم و ستم" سے تعبیر کرنے لگتی تھی۔ بایں ہمہ وہ حد درجہ کے جفاکش اور محنتی فرمانروا تھے۔ وہ دن کے بارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک کام کر کے امور ریاست کو انجام دیتے تھے، اور کوئی بات اپنے عہدیداروں پر نہ چھوڑتے تھے۔

بعض اوقات روزانہ عرضیوں کی تعداد پچاس تک پہونچ جاتی تھی اور وہ سب کا مناسب فیصلہ کرکے اُٹھتے تھے۔ فرصت کے اوقات کرکٹ، فٹ بال، شکار وغیرہ تفریحات میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی ریاست میں کرکٹ کی دو ٹیمیں تھیں جن میں دو آدمی پیشہ ور کرکٹ باز ملازم تھے۔

جام مرحوم نے اپنی ریاست کو بہت کچھ ترقی دی خصوصاً بندر گاہ بیڑی کی ترقی کے باعث تو بمبئی والے چلا اُٹھے تھے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی تجارت میں معتد بہ کمی ہو گئی۔ جام صاحب نے ریاست میں بعض اصلاحات بھی کیں۔ لیکن آزاد سیاسی نظامات کے وہ سخت مخالف تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ یا اس کے ایجنٹ ریاستوں کے نظم ونسق میں کسی قسم کا دخل دیں، چنانچہ اسی بارہ میں کئی مرتبہ اُن کی گورنمنٹ سے بحث بھی ہو چکی تھی۔

گذشتہ جنگ میں انھوں نے گورنمنٹ کو فوجی امداد دی اور خود بھی میدان جنگ میں گئے۔ ولایت میں آپ نے اپنے محل کو زخمیوں کا اسپتال بنا دیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں آپ کو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب عطا ہوا۔ اور ۱۹۱۸ء میں آپ کو "مہاراجہ" بنا دیا گیا۔ اور بعدہٗ آپ کو جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ اور جی بی۔ ای۔ کے خطابات بھی ملے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ نے جنیوا میں ہندوستان کی نمائندگی کا حق ادا کیا اور اس کے بعد ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں بھی یہی خدمت انجام دی۔

چند سال سے جام صاحب مرحوم انگریزی تجارت کو فروغ دینے کے بڑے حامی تھے جس کو اہل ملک بے اطمینانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کی تہہ یہ تھی کہ جام صاحب اپنی ریاست کے بندر گاہ بیڑی کو فروغ دینا چاہتے تھے اور غیر ممالک سے مال درآمد کرکے چونگی (کسٹم) کے ذریعہ اپنی ریاست کی آمدنی بڑھانا چاہتے تھے۔

جام صاحب مرحوم بھی ایوان والیان ریاستہائے ہند کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے ۳۳-۱۹۳۲ء میں آپ ہی نواب صاحب بھوپال کے بعد ایوان مذکور کے چانسلر منتخب ہوئے تھے آپ آل انڈیا فیڈریشن کی تحریک کے بھی سخت خلاف تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر دیسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہو گئیں تو والیان ریاست کی شان فرمانروائی جاتی رہیگی۔ انھوں نے فیڈریشن کے خلاف اپنے اثر سے کام لیا اس قدر پروپیگنڈا کیا کہ کاٹھیاوار کی چودہ ریاستیں اُن کی ہمخیال

ہوگئیں چنانچہ اُن کی وفات سے ایک ہفتہ پہلے جب لارڈ ویلنگڈن کی زیرِ صدارت ایوانِ والیانِ ریاست کا اجلاس ہوا تو جام صاحب نے بحیثیت چانسلر اس وفد کے کام کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے جو تیسری گول میز کانفرنس میں ریاستوں کی طرف سے شریک ہوا تھا فیڈریشن کی اسکیم کے خلاف بھی اپنے ذاتی خیالات کا اظہار فرمایا۔ مگر والسرائے نے مداخلت کرکے روک دیا۔ اور فرمایا کہ ریاستی وفد کی رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے بجائے آپ فیڈریشن کے خطرات پر اپنے ذاتی خیالات کا اظہار فرمانے لگے جس کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ اس پر جام صاحب مرحوم بیٹھ گئے، اور رپورٹ بھی نہ پڑھی۔

عادات وخصائل جام صاحب اپنے عادات وخصائل کے لحاظ سے آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ آپ بیحد مہذب اور خلیق آدمی تھے۔ تقریر اس قدر فصیح وبلیغ کرتے تھے کہ سامعین مسحور ہو جاتے تھے۔ جس سوسائٹی میں شریک ہو جاتے تھے اس کی روحِ رواں بن جاتے تھے۔ جواہرات کا آپ کو بہت شوق تھا اور اُن کی شناخت میں آپ اس قدر نظر رکھتے تھے کہ بڑے بڑے جوہری آپ کا لوہا مانتے تھے۔ جواہرات کا ادنیٰ سا عیب بھی آپ سے نظرانداز نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ جو قیمت آپ تجویز کرتے تھے وہ بالکل ٹھیک ہوتی تھی۔ آپ کا اخلاق اور آپ کی مہمان نوازی بھی ضرب المثل تھی۔ اور شکار پارٹیاں دینے میں بیحد مشہور ہوگئے تھے۔ چند ہفتے ہوئے کہ آپ کے یہاں مہاراجہ صاحب جیپور مہمان تھے جنھیں آپ نے خود شکار کھلایا۔ انگلستان کے مشہور ادیب مسٹر اے۔ جی۔ گارڈنر نے آپ کی نسبت اب سے سترہ برس پیشتر یہ لکھا تھا:-

"چھوٹی سی ریاست کے راجہ مگر ایک بڑے کھیل کے بادشاہ ہیں۔۔۔۔ ہمارے زمانہ میں کرکٹ کے میدان میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے عمدہ کھیل کی مثال ان کے کھیل سے دی جا سکے ان کے کھیل میں حیرت انگیز اور غیر معمولی فقدانِ نمائش ہے، وہ مشرقی سکون اور مشرقی تیزی کے معجون مرکب ہیں۔ ان میں چیتے جیسا سکون اور چیتے ہی جیسی اچانک جھپٹ ہے۔ اُدھر سے بولر وکٹ کی طرف آ رہا ہے اور ادھر یہ بالکل بے حس وحرکت کھڑے ہیں۔ گیند کے ہاتھ سے چھوٹنے تک وہ بت بنے رہتے ہیں، اور جب تک گیند اُن کے قریب نہیں پہونچ جاتا وہ حرکت نہیں کرتے۔ پس اس کے بعد بغیر کسی نمائش یا تصنع کے ان کا بیٹ بجلی کی طرح چمکتا ہے اور گیند پر ضرب پڑ جاتی ہے، با ینہمہ ان کے جسم کی پوزیشن میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ان کے پاؤں اور بیٹ جہاں پہلے تھے وہیں بدستور نظر آتے ہیں۔ الغرض اس کے سوائے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ عین وقت پر کلی

کی طرح اچانک بیٹ چمکا اور ضرب پڑ گئی۔ اگر عمدہ کرکٹ کے یہی معنی ہیں کہ کم از کم محنت سے زیادہ سے زیادہ نتائج برآمد ہوں تو یقیناً جام صاحب اپنی نظیر آپ ہیں۔

کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ انگلستان جیسے ملک میں جہاں کے لوگ کرکٹ کے دیوانے ہیں، اور ایک سے ایک اعلیٰ ماہر فن موجود ہے وہاں ایک ہندوستانی بزور بازو گوے سبقت لے جاتا ہے۔ اور لاکھوں کروڑوں انگریز اس کے معترف و مداح ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو ہر دلعزیزی برطانوی قوم کے تمام طبقات میں "رنجی" کو حاصل ہوئی وہ اب تک کسی دوسرے کو میسر نہیں ہوئی۔ مسٹر گارڈنر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر ہندوستان نے اس بات کی کوشش کی ہوتی کہ جو لوگ دور دراز فاصلہ پر اس کی قسمت کی باگ ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں وہ اس کی آواز سنیں اور سمجھیں، تو اس کو تبسم بلب و بیٹ بدست جام سے زیادہ کامیاب مشنری نہیں مل سکتا تھا۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے ہندوستانی آتے ہیں، جن میں جید عالم، متبحر فاضل، بے نظیر مقرر، اور اعلیٰ کردار کے گوکھلے، بنرجی اور ٹیگور بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نہ ان کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے نہ کوئی اُن کی بات سنتا ہے۔ مگر جام صاحب نے مشرق کو لاکر ہمارے خوش وقت جمہور کے قلوب میں بٹھا دیا ہے اور سکھا دیا ہے کہ مشرق والے بھی آدمی ہیں اور لطف و کرم کے مستحق"۔

الغرض ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

وفات دہلی میں ایوان والیان ریاست کے اجلاس میں شریک ہو کر آپ چلے تو آپ کو خفیف سا نزلہ زکام ہو گیا جس نے بڑھتے بڑھتے کھانسی اور حلق کی سوزش کی صورت اختیار کر لی۔ یکم اپریل یوم شنبہ کی شب کو آپ کی نبض ضعیف ہونے لگی، بالآخر سرسام کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہذیان ہو گیا۔ اسی حالت میں آپ بیہوش ہو گئے اور ۲۔ اپریل کو بروز اتوار ۵ بجے صبح کے انتقال فرمایا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ کل ہماری باری ہے۔

آپ نے شادی نہیں کی تھی اس لئے لاولد فوت ہوئے۔ اب آپکے جانشین آپکے بھتیجے راجکمار دگیجے سنگھ جی ہوئے ہیں۔ آپ کی وفات پر اعلیٰحضرت ملک معظم، ہزاکسلنسی وائسرائے اور تمام والیان ریاست اور رؤسا ملک نے اور ہندوستان اور انگلستان کے بیشمار معززین نے اظہار غم و ملال کیا ہم بھی اس سانحہ پر اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

مشاہیر زمانہ

ہز اکسیلنسی نواب سر احمد سعید خاں بہادر آف چھتاری
گورنر صوبۂ متحدہ

ہز اکسیلنسی کپتان سر نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری بلند شہر کے ایک مشہور مسلم لال خانی راجپوت خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ ۱۸۸۸ء میں ضلع رہتک میں پیدا ہوئے اور قصبہ باغپت ضلع میرٹھ میں پرورش پائی۔ آپ کے سر سے والدین کا سایہ بچپن ہی میں اُٹھ گیا تھا اس لئے آپ کے دادا نواب محمد محمود علی خاں صاحب نے آپ کو چھتاری بلا لیا تھا۔ اُس وقت آپ کی عمر آٹھ برس کی تھی، چنانچہ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور چونکہ آپ کے خاندان کو دینیات سے خاص شوق تھا اس لئے سب سے پہلے آپ نے قرآن شریف حفظ کیا۔ بعد ازاں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں جا کر تکمیل تعلیم کی۔

۱۹۱۵ء میں آپ کو "نواب" کا ذاتی خطاب دیا گیا لیکن ۱۹۱۹ء میں یہ خطاب خاندانی ہو گیا۔ جنگ عظیم میں آپ نے حکومت کی جو امداد کی اس کے صلہ میں آپ کو "ایم۔ بی۔ ای" کا خطاب ہوا۔ بعدہٗ ۱۹۲۱ء میں آپ سی۔ آئی۔ ای۔ ہو گئے۔

کچھ عرصہ تک تو آپ ریاست و زمینداری کے کاموں میں منہمک رہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور تمدنی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے آپ نے بلند شہر میں ایک مسلم اسکول قائم کیا جو اب زیادہ تر آپ ہی کی فیاضی کی بدولت چل رہا ہے۔ آپ نے راجپوت مسلمانوں کی تمدنی اصلاح میں بڑی جدوجہد کی۔ اور اسی سلسلہ میں ریفارم کانفرنس، اور آل انڈیا مسلم راجپوت فیڈریشن کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اسی دوران میں آپ کی ہر دلعزیزی میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ آپ نے سیاسیات کے میدان میں بھی ملکی خدمت انجام دینا شروع کر دی جنگ عظیم کے بعد جب مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے ماتحت کونسلیں بنیں تو ۱۹۲۰ء میں آپ بھی صوبجات متحدہ کی قانونی کونسل میں منتخب شدہ ممبر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپ کے حلقۂ انتخاب میں آپ کی خدمات اس قدر مقبول عام ہوئیں

کر ۱۹۲۳ء میں جب دوبارہ الکشن ہوا تو آپ بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔ آپ مختلف کمیٹیوں اور اجلاسوں میں بحیثیت ایک غیر سرکاری رکن کے ممتاز حصہ لیتے رہے۔ کونسل میں اول دن ہی سے آپ کی ہر دلعزیزی اور قابلیت کا اعتراف کیا گیا۔ اور جب سر ہارکورٹ بٹلر گورنر صوبہ متحدہ نے مسٹر سی۔ وائی چنتامنی اڈیٹر لیڈر الہ آباد کو قلمدان وزارت سپرد کیا تو مسٹر چنتامنی نے نواب صاحب کو کونسل کے سکریٹری کا عہدہ پیش کیا، مگر آپ نے اس وقت اپنے تئیں جونیر خیال کرکے اس کو قبول کرنا مناسب نہ سمجھا اس ادنیٰ واقعہ سے آپ کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعی آپ جس خدمت کو قبول کرتے ہیں اس کو محض اعزاز کے خیال سے قبول نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے استحقاق اور اہلیت پیدا کرنا ضروری خیال فرماتے ہیں۔ بہرحال تین چار سال بعد جب ۱۹۲۴ء میں پھر وزارت کا عہدہ خالی ہوا تو قرعۂ فال آپ ہی کے نام نکلا۔ اور ہز اکسیلنسی سر ولیم میرس کی نظر انتخاب نے آپ ہی کو چن لیا اور آپ وزیر ہو گئے۔ وزارت میں آپ اپنے پیشرو وزراء کی پالیسی برقرار رکھتے اور کونسل کی رائے کا ہر موقعہ پر احترام کرتے رہے۔

۱۹۲۶ء میں آپ اگزیکٹیو کونسل کے ممبر منتخب کئے گئے اور جب ۱۹۲۸ء میں سر الگزنڈر موڈیمن گورنر صوبہ کا اچانک انتقال ہو گیا تو قانون نافذہ کی رو سے صوبہ کی عنان حکومت آپ ہی کے ہاتھ میں آگئی اور آپ دو ماہ تک اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے اور اعلیحضرت ملک معظم نے آپ کے خدمات حسنہ کے اعتراف میں آپ کو ۱۹۲۸ء میں کے سی آئی ای کا خطاب عطا فرمایا اور ۱۹۳۲ء میں کے سی۔ آئی۔ ای بنا دیئے گئے۔

اوائل ۱۹۳۱ء میں آپ آنریبل سر فضل حسین کی جگہ اگزیکٹیو کونسل گورنر جنرل ہند کے ممبر مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے بھی آپ نے دو ماہ تک اپنی اہم ذمہ داریوں کو نہایت لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔ اول اور دوم گول میز کانفرنس لندن کے مباحثات میں بھی آپ زمینداران صوبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک رہے اور تیسری لندن کانفرنس میں بھی آپ جانیوالے تھے لیکن بعض اہم پبلک کاموں کے باعث شریک نہ ہو سکے

آپ کے عہدۂ ہوم ممبری میں دو مرتبہ توسیع ہوئی۔ آخری توسیع مئی سنہ حال تک کے لئے ہوئی تھی لیکن پچھلے ماہ ہز اکسیلنسی سر مالکم ہیلی گورنر صوبہ متحدہ کو وزرائے سلطنت نے اصلاحات ہند کے متعلق مشورہ کرنے کی غرض سے لندن طلب کیا۔ چنانچہ آپ کے تشریف لے جانے پر اعلیحضرت ملک معظم نے صوبہ کی عنان حکومت آپ ہی کے سپرد کی۔ اس سے پہلے بھی اسی قسم کا موقعہ پیش آیا تھا لیکن

اس وقت آپ کو موقعہ نہیں دیا گیا تھا جس سے تمام اہل ملک میں ایک طرح کی ناخوشی پھیل گئی تھی مگر اس دفعہ حق بحقدار کے مسئلہ پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ صوبہ میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک آپ کے تقرر کو نظر استحسان سے دیکھا گیا ہے۔ جیساکہ آپ نے خود حال ہی میں ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا۔ آپ کا تقرر تمام ہندوستانیوں کی عزت افزائی ہے۔ صوبے کی قانونی کونسل میں بھی ہر فرقے کے سربرآوردہ ممبروں نے آپ کے تقرر پر اظہار مسرت کیا ہے اور سرکاری و غیر سرکاری سبھی نمایندوں نے آپ کے دل و دماغ کے اوصاف حمیدہ کا اعتراف کیا ہے۔ ہم بلامبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ مسند گورنری پر آپ کے تقرر سے تمام اہل صوبہ کو سچی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کی ذات والا صفات ہندوستانی اخلاق اور مشرقی تہذیب کا بہترین نمونہ ہے، ہر طبقہ سے آپ کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے ہیں۔ آپ راجپوت نومسلم ہیں اور آپ کے خاندان کا اعلیٰ ترین راجپوتوں میں شمار ہے اور آپ اپنے قدیم خاندانی اعزا کیسا جو ابتک ہندو ہیں اُسی خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں۔ درحقیقت آپ کا اخلاق اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ذات۔ فرقہ۔ مذہب و نسل کے امتیازات بیجا کا کوئی دخل نہیں ہے اپنے سیاسی مخالفین سے بھی آپ ہمیشہ ہمدردی اور دلجوئی سے پیش آتے رہتے ہیں۔ کونسل میں بھی سوراج پارٹی کے لیڈر ہمیشہ آپ کے حسن سلوک کے معترف رہے۔ آپ نے اپریل گذشتہ میں قانونی کونسل میں سوراج پارٹی کے لیڈر مسٹر گوبند ولبھ پنتھ کی عدم موجودگی پر علانیہ اظہار افسوس فرمایا تھا بقول مسٹر چنتامنی آپ اپنے سخت سے سخت نکتہ چینوں کو بھی ہنسکر ہی جواب دیتے ہیں۔ آپ کی مہمان نوازی بھی مشہور خاص و عام ہے۔ آپ ایک علم دوست رئیس ہیں اور غرور و تمکنت کا نام و نشان بھی آپ کے مزاج میں نہیں ہے۔ زمانہ کو بھی عرصہ دراز سے آپ کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

عالمِ نسواں

موجودہ زمانہ کی ہندوستانی لڑکیاں بھی زندگی کے کسی شعبہ میں لڑکوں سے کم نہیں رہنا چاہتی ہیں۔ ہماری خاتونیں جدوجہد حیات میں اپنا پورا حصہ لینا چاہتی ہیں۔ چنانچہ ۲ اپریل کو سنٹرل ہندو اسکول بنارس کے ودیالم منڈل کے زیر اہتمام لڑکیوں کے لئے تیراکی کا ایک مخصوص مقابلہ ہوا جس میں مندرجہ ذیل دو لڑکیاں کامیاب ہوئیں۔ پہلا انعام سنٹرل ہندو گرلس اسکول بنارس کی کماری ساوتری دیوی کو ملا جن کی عمر ابھی صرف تیرہ سال کی ہے دوسرا انعام کماری جانتی دیوی (عمر ۹ سال) کو جو سناتن دھرم کنیا پاٹ شالہ بنارس میں تعلیم پا رہی ہے۔ دونوں لڑکیوں نے دریائے گنگا کو تیر کر کے پار کیا، اور دونوں کو مسز پنا لال پرائز اور راجہ سر موتی چند کے عطیہ تمغے انعام میں ملے۔

گرانٹ میڈیکل کالج بمبئی کی طالبہ مسز کملا راجواڑی نے ڈاکٹری کے گذشتہ امتحان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں سب سے زیادہ نمبر پائے ہیں۔ آپ کو دو وظیفے اور دو بیش قرار انعامات ملے ہیں۔

خانصاحب صاحبزادہ مجید الدین صابری رئیس میرٹھ نے صوبے کی خاتونوں میں ادبی شوق کو ترقی دینے کی غرض سے لیڈی ہیلی صاحبہ اور مسز مارش صاحبہ کے نام سے دو طلائی تمغے ان خاتونوں کو بطور انعام دینے کا اعلان کیا تھا جو ہندوستانی زبان میں کسی موضوع پر بہترین مضمون لکھیں۔ چنانچہ لیڈی ہیلی میڈل شریمتی رامیشوری دیوی مصرا کھیری کو اور مسز مارش میڈل مس اختر جہاں لائق علی طالبہ مسلم کالج نسواں علیگڈھ کو ملا ہے جنہوں نے اس موضوع پر کہ "عورتیں ہندوستان کی ترقی میں کس طرح مدد دے سکتی ہیں" بہترین مضمون لکھے ہیں۔

مس لا میٹھ الہ آباد نے عورتوں کو ہندی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے متعلق بہت سی سہولتیں دی

بھی ہیں۔ حال میں آپ نے ہندی کی شاعرہ خاتونوں کی ایک خاص کانفرنس الہ آباد میں منعقد کی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک مخصوص مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں صرف عورتوں نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ یہ کوی سمیلن ۱۶۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو صوبہ متوسط کی شریمتی سوبھدرا دیوی چوہان صاحبہ کی زیر صدارت ودیا پیٹھ ہال الہ آباد میں ہوا تھا جس میں تقریباً چالیس خاتونوں نے شرکت فرما کر داد سخن دی۔ مندرجہ ذیل خاتونوں کا کلام بہت پسند کیا گیا۔

مسز ودیاوتی تخلص "کوکل" کو کئی تمغے دیئے گئے۔ مسز راج رانی چوہان جھانسی کو بھی ایک تمغہ ملا۔ شریمتی تورن دیوی لکھنوی المتخلص بہ "للی" شریمتی وشنو کماری دیوی کانپور، شریمتی راجکماری دیوی جھانسی کی نظمیں بھی خاص طور پر قابل داد تھیں۔ شریمتی کوکل کی نظم "آنسو" اس قدر رقت انگیز تھی کہ تمام حاضرین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مسز قیمتی اہلیہ محترمہ خان بہادر شیخ محمد قیمتی ڈپٹی کمشنر اوناؤ نے گلگلھا میں ایک گرلس اسکول کا افتتاح فرمایا جو رانی صاحبہ گلگلھا نے حال ہی میں قائم کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک ایوننگ پارٹی بھی دی گئی جس میں متعدد معزز خواتین شریک تھیں۔

شریمتی رادھا پیاری ماتھر جو مسٹر کنور بہادر سنگھ ایٹہ کی اہلیہ محترمہ ہیں آنریری مجسٹریٹ مقرر کی گئی ہیں

۴۔ اپریل کو خواتین صوبہ دہلی کا چھٹا سالانہ اجلاس زیر صدارت لیڈی نوئیس منعقد ہوا منجملہ دیگر خواتین کے مسز گپتا، مسز کلارڈ، مسز مازمدار، مسز سوہن لال، مسز شراف، مسز بسنت لال، ڈاکٹر پٹیل، مس ایف سی مارٹن، مس ونسنٹ، مس ینگ اور مس شرما بھی شریک تھیں۔ کونسل مذکور کی اگزیکٹو کمیٹی نے ممبروں اور مہمانوں کی چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ بعد ازاں مس پلے آنریری سکریٹری نے سالانہ رپورٹ پڑھکر سنائی۔ گونگوں بہروں کے اسکول کی رپورٹ مس مارٹن نے پڑھی۔ ڈاکٹر پٹیل نے کونسل کی آئندہ سرگرمیوں کے متعلق بہت سی تجویزیں پیش کیں۔ مس شرما نے روح پرور نغموں سے اور مس پلے نے بین بجا کر غذائے روحانی کا سامان بہم پہونچایا۔

جب سے چین و جاپان کے درمیان جنگ شروع ہوئی ہے جاپانی جرنیلوں کی بیویوں نے اپنے خانگی مصارف میں بیحد تخفیف کرکے فوج کے لئے ایک امدادی فنڈ جمع کیا ہے۔ اس فنڈ میں بارہ ہزار عورتوں نے چندہ دیا جس میں سے تینتیس ۳۳ ہزار ین (جاپانی سکہ) کی قسط دیجا چکی ہے۔

امسال لیڈی ایولین کابولڈ نے جو ایک انگریز امیرزادی اور نومسلمہ ہیں فریضۂ حج ادا کیا۔ آپ پہلی انگریز خاتون ہیں جن کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔

آبشار

(از جناب علی اشرف صاحب ایڈیٹر روزنامہ صبح دکن حیدرآباد)

آستینوں میں چھپائے ہوئے برقِ مہتاب — ہوں میں اِک نور کا پیکر کہ بہ شکلِ سیماب
ہر طرف بڑھ کے لٹاتا ہوا دُرِ نایاب — پھیلتا جاتا ہوں دُنیا پہ میں مانندِ سحاب

یہ روانی ہے کہ ہے اشک فشانی میری
موجِ مضطر کا تماشا ہے کہانی میری

میں کہیں نغمۂ پُر درد سنانے نکلا — مضطرب ہو کے کہیں شور مچانے نکلا
کہیں دامانِ تجلّی کو اُٹھانے نکلا — حُسنِ بے پردہ کو سو حشر دکھانے نکلا

آپ منظور ہوں میں آپ ہی میں ناظر ہوں
آپ مسحور ہوں میں آپ ہی میں ساحر ہوں

ہوں کبھی وقفِ بلندی کبھی صرفِ پستی — جنبشِ بربادی و رفعت بھی ہے کتنی مستی
دیکھنے والا جو دیکھے مرے دل کی بستی — پائے اِس رنگِ تغیر میں نمودِ ہستی

ہے اجل دیکھ کے حیرت میں تماشائے حیات
ایک آفت ہے قیامت ہے سراپائے حیات

آہ! یہ رنگِ تغیر کا تماشا کیا ہے — جس طرف دیکھئے اک کھیل نیا ہوتا ہے
کس کے جلوے ہیں یہ سب کون یہ دریردہ ہے — آخر اس جلوہ نمائی کا بھی کیا منشا ہے

کچھ نہیں پاتا تو اپنے ہی میں کھو جاتا ہوں
اور اِس کیفِ تجسس ہی میں سو جاتا ہوں

شادی و غم

(از جناب سید اعظم حسین اعظم)

عندلیبِ بوستاں کنجِ قفس کی ہو گئی ۔۔۔ بھولی بھالی عشرتی چودہ برس کی ہو گئی
جوشِ عہدِ بیخودی انگڑائیاں لینے لگا ۔۔۔ پاسِ رسوائی مگر درسِ حیا دینے لگا
عقل کی ہر گام پر جذبات سے ہوتی ہے جنگ ۔۔۔ اب وہ بچپن کی چہلیں ہیں نہ وہ طفلانہ رنگ
دل میں بجلی کی تڑپ اس پر بھی شرمائی ہوئی ۔۔۔ اب سہیلی تک سے ملتی ہے تو گھبرائی ہوئی
کھیل کے بدلے عدیم الفرصتی رہنے لگی ۔۔۔ کام دھندے میں اب اُلجھی عشرتی رہنے لگی
باخبر سود و زیاں سے طبع سادہ ہو گئی ۔۔۔ گھر کی ہر اک چیز سے الفت زیادہ ہو گئی
دفعتہً سب کے خیالوں میں تغیر آ گیا ۔۔۔ عشرتی مانجھے بٹھائی جائے یہ طے پا گیا
لیکے گلشن سے صبا تہنیتِ شادی بڑھی ۔۔۔ خانۂ عشرت کی مہمانوں سے آبادی بڑھی
کٹ گئے حسرت کے دن، عشرت کی برات آ ہی گئی ۔۔۔ آخر اک وقتِ معین پر برات آ ہی گئی
مطربہ کرنے لگی اک سو ترنم ریزیاں ۔۔۔ زلف میں کیں تازہ آرائش نے عنبر بیزیاں
فرطِ شادی سے کھلی جاتی تھی ہر دل کی کلی ۔۔۔ بج رہا تھا گوشے گوشے میں عجب سازِ خوشی
رات بھر یہ جشن تھا دن بھر یہی تھی دھوم دھام ۔۔۔ دفعتہً لٹکائے زلفیں آ گئی لیلیٰ شام
رخصتی کی ہر طرف تیاریاں ہونے لگیں ۔۔۔ عشرتی سے مل کے سب ہمجولیاں رونے لگیں
دل کو برمانے لگی بابل کے گلنے کی صدا ۔۔۔ گھر کا گھر عشرت کدے سے بن گیا ماتم کدا
دیدنی ہے مادرِ ناشاد کی بیچارگی ۔۔۔ یوں سراسیمہ ہے گویا لٹ گئی یکبارگی
کس قدر تکلیف دہ ہے قلبِ دختر کے لئے ۔۔۔ چھوٹنا ماں باپ سے اور زندگی بھر کیلئے

دل میں دردِ ہجر لب پر آہِ آتشبار ہے　　سوختی ہے ماں سے چھٹ کر زندگی دشوار ہے
ایسی حسرت کی گھٹا اُس پر کبھی چھائی نہ تھی　　قلب تھا بے چین لیکن تابِ گویائی نہ تھی
غل ہوا باہر عروس اندر سے آنا چاہیئے　　دیر ہو جائے گی اب ڈولہ اٹھانا چاہیئے
اُٹھتے ہی ڈولہ ہر اک تصویرِ حرماں ہو گیا　　ایک کے جلنے سے گھر آباد. ویراں ہو گیا

ایک گھر آباد ہے تو ایک گھر برباد ہے　　اے رواجِ دہر تو بھی کس قدر جلاد ہے
چھوڑنا اپنوں کو. کرنا غیر سے گہری نباہ　　روحِ شاعر مانگتی ہے اس عقوبت سے پناہ
مسکراتی ہے مگر فطرت کہ تو ناداں ہے　　مدتوں سے خوگرِ رنج والم انسان ہے

عشرتی ماں باپ سے چھوٹی اگر تو کیا ہوا
ایسے کتنے غم ہیں انساں جنکو ہے بھولا ہوا

رشحاتِ نگم

(از جناب ڈپٹی لال نگم ایم۔ اے)

کام کرنے میں تھے اگرچہ فرد　　حوصلہ مند اور جیالے مرد
مرتے دم تک بھی کچھ نہ کام ہوا　　کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

سنو ہندوالو! یہ دنیا کی ریت　　کہ پردیسیوں کو نہیں ہوتی پیت
بھلا اُن کو ہو تم سے الفت بھی کیوں　　مثل ہے کہ جوگی ہوئے کسکے میت

پارہ ہائے جگر

(از حضرت جگر مرادآبادی۔ بی۔اے)

دل ہو گیا غرقِ بادۂ ناب — تصویرِ جہاں نظر میں ہے خواب
بیگانۂ اصل ہو چلا ہوں — بیدادِ خرد کی اب نہیں تاب
کچھ گل ہیں کچھ آرزوئے گل ہیں — پنہاں ہیں اذیتوں کے اسباب
ہوش و خرد و شعور و ادراک — ڈالے ہیں حقیقتوں پہ جلباب
رفتہ رفتہ پہونچ رہے گی — اپنے مرکز پہ روح بیتاب
کھلتے گئے غم سے جس قدر ہم — ہوتی گئی کشتِ روح سیراب
نکہت سے سحر ہوئی معطر — پھولوں پہ تھا کس کا بسترِ خواب
بالیدہ ہو روح جن سے ملکر — ایسے ہیں عزیز دوست کمیاب

ہوں بندۂ بندۂ محبت
جنت ہے جگر خلوصِ احباب

غم نے بیہوش کر دیا مجھ کو — خود فراموش کر دیا مجھ کو
وہ دلِ دردمند کی آواز — ہمہ تن گوش کر دیا مجھ کو
گل رنگیں کہ ساغرِ مے ہے — مست و مدہوش کر دیا مجھ کو
خانہ آباد اے سحابِ بہار — سر بسر جوش کر دیا مجھ کو
آؤ اے جلوۂ بہارِ ازل — تو نے مے نوش کر دیا مجھ کو

اب کہاں وہ نشاط و شوقِ جگر
دل نے غم کوش کر دیا مجھ کو

علمی خبریں اور نوٹ

صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کے علمی ذوق کی کیفیت ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوسکتی ہے جو تعلیم کے متعلق گذشتہ مردم شماری کے سلسلے میں حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں صوبہ میں خواندہ آدمیوں کا اوسط ۳۴ فی مربع میل، سنہ ۱۹۲۱ء میں ۳۷ فی مربع میل اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۴۰ فی مربع میل تھا۔ تعداد کے حساب سے خواندہ اشخاص کا شمار سنہ ۱۹۱۱ء میں ۱۶ لاکھ ساڑھے اٹھارہ ہزار، سنہ ۱۹۲۱ء میں ۱۶ لاکھ ۸۰ ہزار آٹھ سو ستر اور سنہ ۱۹۳۱ء میں بائیس لاکھ ۵۹ ہزار چھ سو اڑتیس تھا۔ یعنی ابھی تک خواندہ اشخاص کا اوسط صوبہ کی مجموعی آبادی سے پانچ فیصدی سے بھی کم ہے۔

ان میں کتنے مرد اور کتنی عورتیں خواندہ ہیں اس کا جواب یہ ہے:۔

سال	خواندہ مردوں کی تعداد	اوسط فی مربع میل	خواندہ عورتوں کی تعداد	اوسط فی مربع میل
سنہ ۱۹۱۱ء	۱۵۰۵۹۴۵	۶۱	۱۱۲۵۲۰	۵
سنہ ۱۹۲۱ء	۱۵۵۶۶۲۶	۶۵	۱۳۲۲۴۶	۶
سنہ ۱۹۳۱ء	۲۰۴۳۴۱۰	۸۰	۲۱۶۲۲۰	۱۰

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری عشرہ میں زیادہ ترقی ہوئی۔ لیکن ابھی تک دیگر مہذب ممالک کے مقابلے میں ہماری خواندہ آبادی کا اوسط افسوسناک حد تک کم ہے ملک کے دیگر صوبجات اور ریاستوں میں پڑھے لکھے آدمیوں کا اس سے بھی کم اوسط ہے۔

مختلف اضلاع کی خواندہ آبادی کا اوسط فی مربع میل یہ ہے:۔

بنارس	۱۹۲	ڈیرہ دون	۱۹۰	گڈھوال	۱۷۳	المو ڑہ	۱۶۷
نینی تال	۱۵۹	جالون	۱۴۵	آگرہ	۱۴۳	متھرا	۱۴۰

کانپور	۱۳۹	جھانسی	۱۳۷	ریاست ٹیہری گڑھوال	۱۳۲	غازیپور	۱۳۰
ریاست بنارس	۱۲۶	بلیا	۱۲۴	لکھنؤ	۱۲۳	الہ آباد	۱۱۸
فتحپور	۱۱۸	علیگڈھ	۱۱۵	میرٹھ	۱۰۹		

تعلیم نسواں کے لحاظ سے ڈیرہ دون کا نمبر اول ہے یعنی (۴۵) اس کے بعد علی الترتیب یہ اضلاع ہیں:۔ لکھنؤ (۲۷)، آگرہ (۲۶)، بنارس (۲۶)، نینی تال (۲۶)، الہ آباد (۲۰)، میرٹھ (۱۹)، متھرا (۱۷)، فرخ آباد (۱۷)، جھانسی (۱۶)، بجنور (۱۶)

گورنمنٹ رپورٹ میں خواندہ اشخاص کی تعداد بہ لحاظ مذاہب بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے ہم اس کو بھی درج ذیل کرتے ہیں

نام مذہب	مرد سنہ ۱۹۲۱ء	مرد سنہ ۱۹۳۱ء	عورت سنہ ۱۹۲۱ء	عورت سنہ ۱۹۳۱ء
ہندو سناتن دھرم	۶۴	۹۴	۶	۱۴
آریا	۲۹۳	۳۲۷	۹۳	۸۴
جین	۵۶۸	۵۹۰	۷۷	۱۲۸
سکھ	۳۲۷	۳۷۵	۵۶	۳۷
مسلم	۶۴	۹۷	۸	۱۶
عیسائی	۳۱۰	۳۲۷	۲۰۹	۲۱۴

مختلف ذاتوں اور فرقوں کی تعلیمی حالت دیکھی جائے تو تمام ذاتوں میں کایستھوں کا نمبر اول ہے یعنی ان میں ستر فیصدی مرد اور انیس فیصدی لڑکیاں خواندہ ہیں، دوسرا نمبر ویش قوم اور تیسرا نمبر سیدوں کا ہے۔ ان کے بعد علی الترتیب حسب ذیل تناسب ہے:۔ برہمن۔ مغل۔ سنار۔ کلوار۔ شیخ۔ راجپوت۔ ہریجن (اچھوت)

اردو کے قدیم محسن نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظم کے چند خود نوشت حالات زمانہ کے کسی پچھلے نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب ناظرین زمانہ یہ سنکر خوش ہونگے کہ آپکا مکمل مجموعہ کلام ردیف وار صوت تغزل کے تاریخی نام سے دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن

کے اہتمام سے شائع ہو رہا ہے قیمت صرف عہ روپیہ مقرر کی گئی ہے شائقین ادارہ اشاعت مذکور سے طلب فرمائیں

اس سال کے آغاز میں اس صوبے کے چار نوجوان مصنفوں نے جن میں ایک ۔ لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں "انگارے" نام سے اپنے دس قصوں کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان میں چند افسانے ضرور ایسے تھے جن میں موجودہ زمانہ کی ریاکاریوں پر روشنی ڈالنے اور مروجہ رسم و رواج کی اندرونی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے نام نہاد اعلیٰ طبقے کی روزمرہ معاشرت کے نقائص کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ گو اس مجموعہ کا طرز بیان اکثر مقامات پر سوقیانہ تھا جو مذاق سلیم کو کھٹکتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نوجوانان عالم نے دنیا میں جو علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اسی کا ایک ادنیٰ کرشمہ اس کتاب کی اشاعت ہے۔ اسلامی بزرگوں اور مولوی صاحبان نے اس کو اپنے تقدس و احترام پر زبردست حملہ خیال کر کے اس پر لعن طعن میں کوئی کسر باقی نہ رکھی اس طرح اس چھوٹی سی کتاب کے خلاف ایک طوفان عظیم برپا ہو گیا جس نے ایوان کونسل میں ایک ہلچل سی برپا کر دی۔ ہمارے صوبے کے اخباروں میں بیسیوں مضامین اس کے خلاف شائع ہوئے۔ اکثر مقامات میں خاص جلسوں میں اس پر اظہار نفرت و حقارت کیا گیا اور گورنمنٹ سے اسے ضبط کرنے کی استدعا کی گئی جو بالآخر منظور و مقبول ہوئی۔ ۱۵۔ مارچ گذشتہ کے سرکاری گزٹ میں "انگارے" کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا ہے۔ گو اس کے پبلشر صاحب اس کی تمام جلدوں کو پہلے ہی نذر آتش کر چکے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اخلاق اور روحانیت کے علمبردار اور مذہب کے احترام و تقدس کے دعویدار حضرات نے اپنے طبقوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے کبتک آنکھ بند کئے رہیں گے کوئی شبہ نہیں کہ انگارے کے لائق مصنفین کا طرز بیان شروع سے آخر تک مزاحیہ اور ظریفانہ تھا انھوں نے بڑی ہستیوں کا بھی مضحکہ اڑایا تھا۔ یہ دونوں باتیں ادبی نقطۂ خیال سے آرٹ کے حدود کے اندر ہیں لیکن ہمارے نوجوان مصنفین نے اکثر مقامات پر خواہ مخواہ رکیک فقرے اور خلاف تہذیب جملے استعمال کر کے جو ٹکسال باہر ہیں اپنے تئیں مفت میں ہدف ملامت بنایا لیکن مسلم پریس میں جس انداز سے اس کتاب پر نکتہ چینی ہوئی ہے اس سے زمانۂ حال کی مروجہ تنگ خیالی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ زمانہ حال کے مولوی صاحبان کچھ ہی کیوں نہ کہیں سوسائٹی کے ہر طبقے میں ریاکاری کے نقائص داخل ہو گئے ہیں۔ ہماری رائے میں ان نقائص کے باضابطہ علاج کی ضرورت ہے آپ ان نقائص کے نمایاں کرنے والوں کو مردود و ملعون کرنے یا ان کی تحریرات و تصانیف کو سرکاری اثرات سے کام لیکر ضبط کرا دینے سے ملک و مذہب کا کوئی بھلا نہیں کر سکتے ہیں۔

خط و کتابت

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ایم۔اے۔ پی۔ایچ ڈی۔ الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد)

بخدمت ایڈیٹر صاحب رسالہ "زمانہ" کانپور۔

جناب من،

میں شکر گذار ہونگا اگر آپ یہ چند سطریں اپنے گراں بہا رسالے کی اگلی اشاعت میں درج فرمادیں گے۔

مارچ ۱۹۳۳ء کے رسالہ زمانہ (ص ۹۸-۱۶۳) میں جناب سلیم جعفر صاحب کا قابل قدر مضمون "نستعلیق ٹائپ" شائع ہوا ہے اور اسمیں میرے تجویز کئے ہوئے ٹھپوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کے متعلق مجھے صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ۔

(۱) صفحہ ۱۴۴ پر (۳-ف) کی دوسری سطر میں جو شکل حرف کاف کی دکھائی گئی ہے اُسے میری تجویز سے اصلا تعلق نہیں۔ کاف کی یہ شکل نستعلیق کمیٹی حیدرآباد کے صاحب صدر نے تجویز فرمائی تھی جو فن خوشنویسی کے ماہر ہیں۔ دارالطبع سرکار عالی نے ایک ہی دن میں اس کا ٹھپہ تیار کرکے اسی کے مطابق چند لفظ چھاپے جو دوسرے ہی دن کے اجلاس میں پیش کئے گئے۔ مگر اس نئی شکل کو کمیٹی نے پسند نہیں کیا۔ میری رائے میں کاف کے مرکز کی وضع کو بدلنا چنداں ضروری نہیں۔

(۲) اُسی صفحہ پر (۳-ب) کی دوسری اور چوتھی سطر میں جو لفظ لکھے ہیں وہ کہنے کو تو میری تجویز کے مطابق ہیں لیکن صورت حال یہ ہے:-

ستمبر ۱۹۳۱ء میں نستعلیق کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں میں نے اپنی تجویز پیش کی اور نہایت عجلت میں کچھ لفظ لکھوا کر دکھلائے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ان شکلوں میں ضروری تبدیلی و ترمیم کرنے کے بعد ایسے حرف بن سکتے ہیں جن میں نستعلیق کی شان ایک بڑی حد تک قائم رہے گی۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ اجلاس میں میں اپنے تجویز کئے ہوئے حرفوں کو مکمل صورت میں پیش کروں۔ اس کے بعد دارالطبع کے کارپردازوں نے اپنے طور پر میری مجمل تجویز کی بنا پر حرف بنائے۔ نہ ان حرفوں کے خاکے میری رائے سے بنے نہ اس کا مجھے علم تھا کہ دارالطبع میں یہ کام ہو رہا ہے۔ جب اکتوبر ۱۹۳۲ء میں کمیٹی کا تیسرا اجلاس منعقد ہوا تب معلوم ہوا کہ میری تجویز کی ہوئی شکلیں چھپ بھی گئیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی چیز میری طرف کیونکر منسوب کی جاسکتی ہے۔

ابھی دوسرے اجلاس میں میں نے اپنے خاکے پیش کئے ہیں کو من حیث گیا وہ اراکین کے سات نے بہت پسند کیا اور موافقت میں رائے دی۔ کمیٹی کا یہ فیصلہ بعد کو محکمۂ سرکاری میں بھیجا گیا لیکن ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ سرکار نے کیا فیصلہ صادر فرمایا۔

(۳) ملک کے سامنے میں نے اپنی تجویز کو ابھی تک اس لئے نہیں پیش کیا کہ ایک تو جہاں یہ تجویز ابتدا ازبیش ہوئی وہاں سے ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسرے یہ کہ میں نمونے کے طور پر کچھ ٹھپے بنوانے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ ابھی تیار نہیں ہیں۔

امید ہے کہ میں جلد اپنی تجویز کو شائع کر سکوں گا۔

نیازمند

عبدالستار صدیقی

یونیورسٹی الہ آباد

۱۵۔ اپریل ۱۹۳۳ء

(۲)

(از پنڈت امبکا پرشاد باجپئی سابق اڈیٹر "بھارت متر" کلکتہ)

بخدمت اڈیٹر صاحب "زمانہ" کانپور

جناب من۔ تسلیم! میں نے کلکتہ یونیورسٹی کے طلباء ہندی ایم اے۔ کے لئے ایک کتاب "ہندی پر فارسی کا اثر" نامی لکھی ہے۔ مولانا آزاد کی کتاب "آبحیات" کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قلندر بخش جرأت نے کچھ دوہے اور کبت لکھے تھے۔ مگر وہ میری نظر سے نہیں گذرے۔ مجھے مولانا عبدالقادر صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مرزا جانجاناں مظہر کے لکھے ہوئے کچھ دوہے بعض اُردو رسالوں میں شایع ہوئے ہیں، چونکہ یہ رسالے یہاں نہیں مل سکتے اس لئے میں آپ کے ذریعہ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اُن کی اطلاع میں مذکورہ دوہے کہیں دستیاب ہو سکتے ہوں تو براہ کرم مجھے اس کی اطلاع دیکر شکر گذاری کا موقع دیا جائے۔ اگر وہ دوہے کسی اُردو رسالے میں شائع ہوئے ہوں تو اس رسالہ کے پرچے میرے نام بذریعہ قیمت طلب پارسل بھیجدئیے جائیں۔ اس توجہ فرمائی کے لئے شکر گذار رہوں گا۔

نیازمند: امبکا پرشاد باجپئی

لوکمانیہ ٹائپ فاؤنڈری۔ ۱۰۲ مکتا رام اسٹریٹ کلکتہ

رسالہ ہُما پڑھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

پریم چند کی تازہ تصنیف

بیوہ

اس کتاب میں بیوہ کے درد ناک واقعات لکھے گئے ہیں اور انکی تکلیفات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں اسکے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش کیگئی ہے کہ بیواؤں کیلئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۸،

رامائن مسدس

(مصنفہ جناب منشی رام جی مل صاحب کپور سنبھلی)

اول تو اس رامائن میں مخصوص ایک یہ خوبی نمایاں ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے جیون کو عجیب مرغوب انداز و دلکش پیرائے میں ظاہر کیا ہے جو بمقابلہ دیگر رامائنوں کے نیا اور انوکھا ہے اور غیر سود مضمون سے پاک وصاف ہے۔ آپ کی جدت طراز ذہن رسا نے ایسے ایسے نازک ہونادر استعارات و تشبیہات دلکش اس حسن وخوبی سے استعمال کئے ہیں جو دیدہ زیب جامہ سے مزین وروحانی و وجدانی لطافت سے مملو اور حسن آفرینی میں قریب المأخذ ہیں ہر شعر ملتاہوا جادو اور نشتر کا کام کرتاہے سلف مکالمات و بلند پروازی تحسیل تحسین وداد سے۔ اشعار کی نوعیت کا رنگ بالکل نیا ہے فصاحت کا دریا لہریں لے رہاہے غرضکہ یہ رامائن تنہائی کا مونس اور افسردگی خاطر کا ذریعہ تفریح اور عبرت کا درس دینے میں بے نظیر ہے معہ رنگین تصاویر حجم ۳۰۰ صفحات

قیمت صرف تین روپیہ عہ،

زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور سے طلب فرمائیے

بذریعہ استعمال سناٹوجن

پھر وہی بے برداشت بھوک!

بذریعہ استعمال سناٹوجن معدہ میں تعجب انگیز تقویت حاصل ہو جانیکے باعث بھوک کی کمی رفع ہو جاتی ہے اور دیگر تکالیف بھی اس کے ساتھ ساتھ جاتی رہتی ہیں آپ پھر ہر طرح کی غذاؤں کی لذت اُٹھانے کے قابل ہو جائینگے اور تمام جسم پر اسکے تقویت دینے والے اثر رسانی کی بدولت آناً فاناً میں بہ نسبت قبل اور بھی صحت مند اور طاقتور ہو جائینگے

سلطنت بھوپال سے محمود علی خانصاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"سناٹوجن کا استعمال کیکے میں ہمیشہ کامگار اور خوش مزاجی کے ساتھ رہتا ہوں اور علاوہ اسکے قریب قریب ہر قسم کی خوراک ہضم کر سکتا ہوں"

جبکہ بذریعہ استعمال سناٹوجن جملہ تکالیف جسمانی رفع ہو جاتے ہیں تو آپ کیوں معدہ کی گڑبڑی کی تکلیف کو برداشت کر رہے ہیں آج ہی اس تعجب انگیز مقوی غذا کا استعمال شروع کر دیں۔

SANATOGEN

ہر ایک دواخانہ اور بازار میں ملتا ہے

سناٹوجن تیار کرنیکے وقت سے پیک کرتے وقت تک ہاتھوں سے نہیں چھوا جاتا ہے

تکلیف دہ جھلسنے والی گرمی

اور دھوپ۔ اگزیما اور گرمی کے پھوڑے پھنسیوں کا حیرت انگیز مرہم

زمبک سے خاتمہ کیجیے

گرمی کے موسم میں اگزیما شدید گرمی جھلسنے والی دھوپ خارش، کھجلی، پھوڑے اور پھنسیاں بیحد تکلیف دہ اور درد پہونچاتی ہیں۔ ان امراض اور تمام دیگر جلدی بیماریوں کا نہایت سریع الاثر اور قابل اطمینان علاج **زمبک** ہے۔ یہ حیرت انگیز نباتاتی مرہم بہت جلد درد کو تسکین دیتا، مضر جراثیم کو ہلاک کرتا اور بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ زخموں سے تمام مادۂ فاسد کو کھینچ کر نکال دیتا ہے۔ جلد کی صورت اور رنگ خراب نہیں ہونے دیتا۔ اور نئی تندرست کھال پیدا کر دیتا ہے۔

مچھروں۔ جوکوں۔ ڈانسوں وغیرہ کے کاٹے پر اگر فوراً زمبک لگا دیا جائے تو آرام ہو جاتا ہے۔ زمبک میں نہایت بیش قیمت جراثیم کش خواص موجود ہیں اور وہ خون میں سمیت نہیں پیدا ہونے دیتا۔

تمام دوافروش خوبصورت ڈبیوں میں ۸/۔ اور ۱۲/ فی ڈبیہ کے حساب سے فروخت کرتے ہیں

خالص نباتاتی ہے اور جانوروں کی چربی سے پاک ہے

زمبک Zam-Buk

فہرست مضامین

تصویر:- سید حسن امام مرحوم

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

[illegible]

اپنے گلے اور پھیپھڑوں کو
برساتی موسم کے خطرات سے محفوظ رکھیے
فوری سردی لگنے سے بچے رہیے۔ اپنے پھیپھڑوں کی حفاظت رکھیے کیونکہ برسات کے
بھی محسوس ہو تو پیپس کی حیرت انگیز ٹکیوں میں سے ایک منہ میں ڈال لیجیے۔
سب انگریزی دوا فروش پیپس کو ایک روپیہ فی شیشی کے حساب سے فروخت کرتے ہیں
ان عجیب و غریب سانس کے ساتھ اثر کرنے والی ٹکیوں کو استعمال کیجئے۔
پیپس Peps
ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ
ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں کامیابی
ملنے کا پتہ:- منیجر نگم کمپنی۔ نیا چوک کانپور

زمبک Zam-Buk

انتہا درجہ کا حیرت انگیز مرہم جو آجتک زخموں جراحتوں
یا مریض جلد کے لئے ایجاد ہوسکا

حیرت انگیز طور پر تسکین دیتا ہے فوراً آرام کرتا ہے

بیش قیمت جراثیم کش ہے

اور خالص جڑی بوٹیوں سے بنا ہے
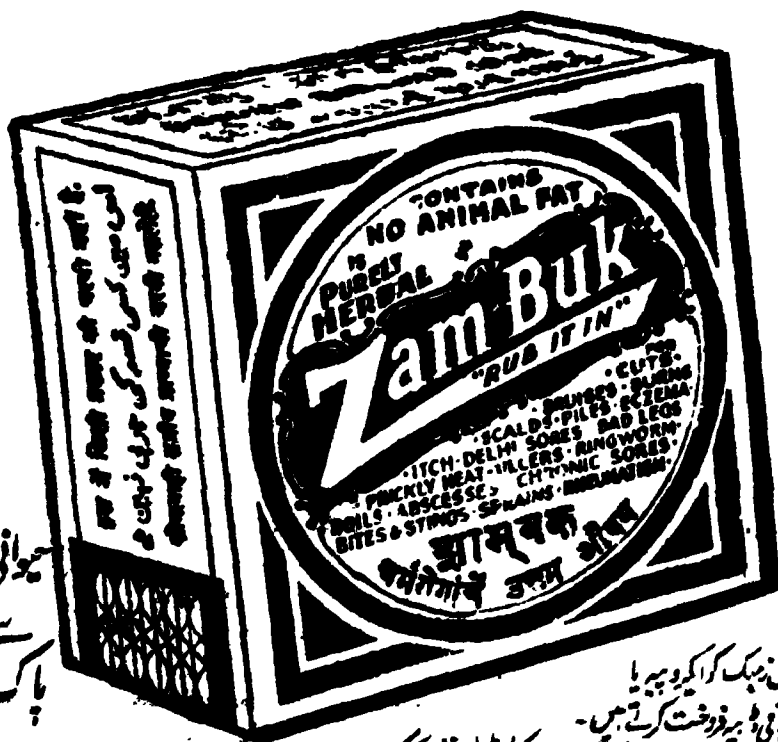
حیوانی چربی سے پاک

تمام دوا فروش زمبک کو ایک روپیہ یا اڑھائی روپیہ فی ڈبیہ فروخت کرتے ہیں۔
ایجنٹس: میسرز اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کو لیمیٹڈ کلکتہ

سید حسن امام مرحوم

تاریخ پیدائش ۳۱ اگست سنہ ۱۸۷۱ء　　　تاریخ وفات ۱۹ اپریل ۱۹۳۳ء

زمانہ

جلد ۶۰ — جون ۱۹۳۳ء — نمبر ۶

آئرلینڈ

(۲)

(از بابو انشت پرشاد نگم بی اے۔ ایل ایل بی)

۱۹۲۱ء کا صلحنامہ دسمبر ۱۹۲۱ء کا پہلا ہفتہ آئرلینڈ کے لئے عجیب بےچینی کا زمانہ تھا۔ ہر متنفس کی نگاہیں لندن کی طرف لگی ہوئی تھیں، جہاں آئرش نمائندے اور برطانوی مدبرین حکومت آئرلینڈ کے مستقبل کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔ ۶۔ دسمبر کی صبح کو اس تاریخی عہدنامہ پر دستخط ثبت ہوگئے۔ اس کی خبر آتے ہی ڈی ویلرا خوشی سے جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہماری فتح ہوگئی۔ نمائندوں کو ہدایت تھی کہ دستخط کرنے سے پہلے مسودے کی ایک نقل بھیجکر دوبارہ منظوری حاصل کرلیں لیکن منظوری کی درخواست آئے بغیر صلح ہوجانے کے یہی معنی تھے کہ آئرش مطالبات بلاچون وچرا تسلیم کرلئے گئے۔ ڈی ویلرا کی خوشی کا یہی باعث تھا۔ لیکن جلد ہی اُس کی امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ عہدنامہ کی جو نقل بعد میں آئی اس میں آئرلینڈ کے لئے مکمل آزادی کا سامان نہ تھا۔ اس عہدنامہ کی شرطیں مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

اول، دوم و سوم شرائط کا یہ منشا تھا کہ آئرلینڈ کی سیاسی حیثیت سلطنت برطانیہ میں کناڈا وغیرہ نوآبادیوں کی سی ہوگی۔ اس کا نام آئرش فری اسٹیٹ ہوگا۔ فری اسٹیٹ میں حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک گورنر جنرل ہوگا جس کے تقرر وغیرہ کا وہی طریقہ ہوگا جو کناڈا کیلئے ہے۔

چوتھی دفعہ میں آئرش فری اسٹیٹ کی پارلیمنٹ کے ممبروں کے لئے مندرجہ ذیل حلف وفاداری

لینا طے ہوا :-

میں ... . سچے دل سے حلف لیتا ہوں کہ آئرش فری اسٹیٹ کے آئین کا جو قانونی طریقہ پر قائم ہے سچا وفادار رہونگا اور ہز مجسٹی کنگ جارج پنجم ان کے ورثا اور جانشینوں کا بھی وفادار رہونگا۔ کیونکہ مجھے بحیثیت آئرش باشندہ ہونے کے برطانیہ عظمیٰ کے باشندوں سے مساوات کے حقوق حاصل ہیں اور اس لئے بھی کہ آئرلینڈ ان اقوام کی سیاسی مجلس کا ایک ممبر ہے جس کو " برٹش کامن ویلتھ " کہتے ہیں "

پانچویں دفعہ میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ آئرلینڈ کے جائز مطالبات کا لحاظ رکھتے ہوئے ملکی قرضہ کی ذمہ داری آئرلینڈ پر رہیگی۔ ان مطالبات کا فیصلہ اگر آپس میں نہ ہو سکا تو ایسے اشخاص کی پنچایت کے سپرد کر دیا جائیگا جو سلطنت برطانیہ کے باشندے ہوں۔

دفعہ ۶ میں یہ طے کیا گیا۔ کہ آئرلینڈ کی بحری حفاظت اس وقت تک برطانیہ کریگا جبتک ہر دو حکومتیں اس مسئلہ کو آپس میں طے نہ کرلیں۔ البتہ محاصل وغیرہ کی وصولیابی کے لئے جس حد تک جنگی جہاز ضروری ہیں آئرلینڈ رکھ سکے گا۔ ہر دو حکومتوں کی کانفرنس پانچ سال بعد ہوگی جبکہ آئرلینڈ کی بحری حفاظت کا مسئلہ طے کیا جائیگا۔

دفعہ ۷ میں برطانوی افواج کے لئے زمانۂ امن میں چند مخصوص بندرگاہوں نیز دیگر مخصوص سہولتوں کا بہم پہونچانا آئرلینڈ کا فرض قرار دیا گیا تھا۔ لیکن زمانۂ جنگ میں آئرلینڈ ان تمام بندرگاہوں اور سہولتوں کو بہم پہونچائیگا جنکی ضرورت برطانیہ کو محسوس ہو۔

دفعہ ۸۔ آئرلینڈ کی فوج برطانیہ کی فوج سے وہی تناسب رکھیگی جو برطانوی آبادی کے ساتھ آئرلینڈ کی آبادی کو ہے۔

دفعہ ۹ ہر دو ممالک کے بندرگاہ ایک دوسرے کے جہازوں کے لئے حسب معمول ٹکیس ادا کرنے پر کھلے رہیں گے۔

دفعہ ۱۰۔ جن سرکاری ملازموں کو فری اسٹیٹ گورنمنٹ موقوف کریگی یا جو بوجہ تبدیلی طرز حکومت بطور خود ترک ملازمت کریں گے ان کو مناسب معاوضہ دیا جائیگا۔

دفعہ ۱۱ لغایت ۱۵ کے رو سے صوبہ آلسٹر کے بارہ میں یہ طے ہوا کہ عہدنامہ کی منظوری کے ایک ماہ بعد تک آلسٹر پر کوئی اثر ان شرائط کا نہ ہوگا بلکہ وہاں بدستور سنہ ۱۹۲۰ء کے قانون کے مطابق حکومت جاری رہیگی۔ لیکن ایک ماہ کے اندر آلسٹر کو اپنے لئے خود طے کرنا ہوگا کہ وہ اس عہدنامہ کی شرائط کا پابند

عہد نامہ کی شرطوں کے مطابق صرف وہی اشخاص عارضی حکومت کے ممبر ہو سکتے تھے جو عہد نامے کے شرائط بذریعہ تحریر کے تسلیم کریں۔ ایسی حالت میں ڈی ویلرا کا عارضی حکومت میں داخل ہونا غیر ممکن تھا۔ لہذا آرتھر گرفتھ اس کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ اگرچہ باضابطہ طریقہ پر آئرلینڈ کا حکمران آرتھر گرفتھ تھا لیکن قوت اب بھی ڈی ویلرا کے ہی ہاتھوں میں تھی کیونکہ ریپبلکن فوج صرف ڈی ویلرا کی رہنمائی تسلیم کرتی تھی۔ حکومت کی پشت پناہ برطانوی گورنمنٹ تھی جس نے عہد نامہ کے شرائط کے مطابق فری اسٹیٹ کی عارضی حکومت کو انتظام ملکی میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ گویا قوم پرستوں کے دو فریق جواب تک دوش بدوش غنیم کی جڑ کاٹنے کی کوشش میں تھے خود آپس میں مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ ۲۶۔ مارچ کے ایک اہم جلسہ میں ریپبلکن فوج نے پھر ایک بار کمل آزادی کے حق میں آواز بلند کی اور با لاعلان کہہ دیا کہ اس کا کوئی تعلق آئرش فری اسٹیٹ کی عارضی حکومت سے نہیں ہے۔ اس نے فور کوٹ اور دیگر تاریخی عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ مگر اب ڈی ویلرا کا کام پہلے سے زیادہ مشکل تھا۔ کیونکہ یہ جنگ صرف انگریزوں کے خلاف نہ تھی بلکہ اس کو اپنے ہموطنوں اور انگریزی حکومت کی مجموعی طاقت کا مقابلہ کرنا تھا۔ مگر ڈی ویلرا نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اس کا قول تھا کہ ہم نے برطانوی گورنمنٹ کے لئے آئرلینڈ پر حکومت کرنا غیر ممکن کر دیا ہے اور اسی طرح آئرش گورنمنٹ کو بھی جو برطانیہ کے زیر سایہ کام کرتی ہے حکومت کرنا غیر ممکن کر دیں گے۔ انگریزوں کا ایک جنگی جہاز بھی جو فری اسٹیٹ کی حکومت کی امداد کے لئے آیا ہوا تھا لوٹ لیا گیا اور اس میدان میں بھی ڈی ویلرا کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے۔ ارباب حکومت نے جب ڈی ویلرا کا اثر اہل ملک پر جمتا ہوا دیکھا تو انھوں نے ایک جدید انتخاب کا اعلان کر دیا تاکہ وہ عوام الناس کو یہ دکھلا سکیں کہ جمہور آئرلینڈ اُن کے ساتھ ہے۔ اور ڈی ویلرا کی حرکات محض اس کی ضد یا خود غرضی پر مبنی ہیں۔ یہ انتخاب جون ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اور چونکہ اس کا انتظام کلیتًا حکومت کے ہاتھوں میں تھا اس لئے ڈی ویلرا کی پارٹی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اب عارضی حکومت کو شن فین پارٹی کے ساتھ تشدد آمیز برتاؤ جاری کرنیکا موقع ملا۔ اس کے خلاف فوجی طاقت کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ اس کے صدر مقامات پر انگریزی توپوں سے گولہ باری شروع کر دی گئی۔ فور کوٹ وغیرہ عمارتیں جو اس کے قبضہ میں تھیں مسمار کر دی گئیں۔ غرض اس طرح ڈبلن میں عارضی حکومت کا سکہ جم گیا۔ لیکن آئرلینڈ کے جنوبی حصوں میں اب بھی شن فین پارٹی ہی برسر اقتدار تھی اس خانہ جنگی میں سینکڑوں محبان وطن کی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اور جان و مال کے ناقابل تلافی

نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ مارشل لا جاری تھا اور جن لوگوں کے خیالات گورنمنٹ کے خلاف تھے اُن کے ساتھ بیدردی کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ شن فین پارٹی انتہائی مصائب برداشت کرنے کی عادی اور حب وطن کے جوش میں عظیم قربانیوں کے لئے تیار تھی۔ لیکن قومی بربادی کے نظارہ کی تاب نہ لا سکی۔ اب وہ محسوس کرنے لگی اس کشمکش کے جاری رکھنے میں ملکی مفاد کا خون ہو رہا ہے اور اگر خانہ جنگی کا خاتمہ نہ کیا گیا تو رفتہ رفتہ وہ عناصر ضائع ہو جائیں گے جن کا وجود قوم کی ترقی و بہبودی کے لئے لازمی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں ڈی ویلرا نے موجودہ حکومت کے ساتھ سلسلۂ جنگ موقوف کر دی جس سے حکومت کا کام بآسانی اور بلا رکاوٹ چلنے لگا۔

حکومت کا طرز عمل | ۱۶۔ جون ۱۹۲۲ء کو جبکہ اول اول برٹش گورنمنٹ نے آئرش گورنمنٹ کا چارج اہل آئرلینڈ کے حوالہ کیا اور عارضی حکومت قائم ہوئی تو اس کے صدر مسٹر آرتھر گریفتھ تھے جو اگست ۲۲ء میں فوت ہو گئے۔ ان کے بعد صدارت کی کرسی پر مسٹر مائکل کالنس متمکن ہوئے۔ لیکن خانہ جنگیوں کی کشمکش میں اُسی ماہ وہ بھی گولی کا شکار ہو گئے۔ اور عنان حکومت ولیم کاسگروو کے ہاتھ میں آئی جو عرصہ تک آئرلینڈ کے حکمران رہے۔ آپ فطرتاً اعتدال پسند واقع ہوئے ہیں اور سیاسی اعتبار سے آپ کے خیالات برطانیہ کے کنسرویٹو طبقہ سے ملتے جلتے ہیں مگر آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں آپ کا بھی حصہ کچھ کم نہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کی آئرش والنیٹروں کی فہرست میں آپ کا بھی نام تھا۔ ۱۹۱۶ء کی خونریزی میں آپ بھی اپنے ہموطنوں کے ساتھ شریک تھے اور قید خانہ کی آب و ہوا کا لطف اُٹھا چکے تھے۔ آزادی کی آخری لڑائی میں آپ کا کام یہ تھا کہ مقامی کونسلوں کو انگریزوں کے ساتھ اتحاد عمل سے باز رکھیں۔ چنانچہ عارضی حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس پر ملک کا ایک با اقتدار فرقہ بھروسہ رکھتا تھا۔ عہدنامہ کی شرائط کے مطابق اس نے آلسٹر کو فری اسٹیٹ کے ساتھ شریک کرنے کی کوشش کی لیکن بسوء آلسٹر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا رہا۔ اور فری اسٹیٹ کے ساتھ شرکت کرنا کفر سمجھا۔ اسطرح عہدنامہ کی شرائط کی پابندی محض فری اسٹیٹ کے چھبیس اضلاع ہی پر رہی۔ اس کے لئے علیحدہ اور باقاعدہ آئین مرتب کرنا اور عہدنامہ کی تاریخ سے ایک سال کے اندر اس کا نفاذ کرنا بھی عارضی حکومت کا فرض تھا۔ چنانچہ آئین مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مرتب کی گئی جس نے دیگر ممالک میں نظم و نسق کے عیوب و محاسن پر غور کر کے ایک آئین مرتب کیا۔ ستمبر ۲۲ء میں عارضی پارلیمنٹ کی نشست ہوئی جس میں کمیٹی کا مرتب کیا ہوا آئین پاس کیا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے بھی

اس آئین کو طویل بحث ومباحثہ کے بعد منظور کر لیا۔ اور اس کا باضابطہ نفاذ شاہی اعلان کے ذریعہ ۶۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ہو گیا۔

دوسرا اہم کام جو گورنمنٹ کے ذمہ تھا وہ عہدنامہ کی شرائط کے مطابق آئرش فری اسٹیٹ اور آلسٹر کے حدود کا تعین تھا۔ ۱۹۲۵ء میں مجوزہ کمیشن کا تقرر ہوا۔ عہدنامے کی شرائط کی منظوری کے وقت آئرش نمایندوں کا یہ خیال تھا کہ باشندگان ملک کی رضاجوئی کے لحاظ سے آلسٹر کے حدود اس قدر تنگ کر لیے جائیں گے کہ اس کو فری اسٹیٹ سے علحدہ رہنا مشکل ہو جائیگا اور بالآخر اس کو فری اسٹیٹ سے الحاق کے سوائے کوئی چارہ نہ رہیگا۔ مگر کمیشن کی کارروائی شروع ہونے پر فری اسٹیٹ کے نمایندوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اُنھیں برٹش مدبرین کی سیاسی قابلیت کی داد دینا اور پولیٹیکل شطرنج میں مخالفین کی چالوں کے سامنے مات کھانا پڑی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فری اسٹیٹ کے نمایندوں نے میدان خالی کر دیا۔ فری اسٹیٹ کی حکومت نے مجبوراً اس طور سے صلح کر لی کہ عہدنامہ کے وقت جو حدود آئرلینڈ کے جنوبی اور شمالی حصوں کی قائم تھیں وہی قائم رہیں اور اس کے صلہ میں شاہی قرضہ کی جو رقم آئرلینڈ کے ذمہ تھی برٹش گورنمنٹ نے معاف کر دی، حکومت کے اس فعل نے اہل ملک کے سامنے اس کو شرمندہ کر دیا۔ اور وہ اب نفرت اور بے عزتی کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔

ڈی ویلرا کا عروج اسکے بعد پھر اہل ملک کی توجہ ڈی ویلرا کی پارٹی کی طرف منتقل ہوئی لیکن چونکہ حلف وفاداری کی شرط ڈیل کے داخلہ میں بارج تھی اس لئے وہ ملک کے نظم ونسق میں کوئی حصہ نہ لے سکتی تھی۔ اس دقت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے عزم کیا کہ کسی ترکیب سے مجلس قانون ساز میں دخل حاصل کرے۔ چنانچہ شن فین پارٹی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور مسٹر ڈی ویلرا کی سرکردگی میں ایک گروہ نے فائنافیل پارٹی کے نام سے اپنا مسلک یہ قائم کیا کہ ڈیل میں داخل ہو کر قوم کی خدمت کرے۔ ۱۹۲۵ء کے انتخاب میں اس پارٹی کے چند ممبر ڈیل میں داخل ہوئے اور اُنھوں نے حلف وفاداری لے لیا مگر اس اعلان کے ساتھ کہ یہ حلف کچھ معنی نہیں رکھتا۔ فائنافیل کے اُن چوالیس ممبروں میں جو ڈیل میں داخل ہوئے مسٹر ڈی ویلرا بھی تھے۔ ڈی ویلرا نے ڈیل میں داخل ہوتے ہی اپنی پارٹی کا مقصد یہ بتلایا کہ تیس لاکھ پونڈ سالانہ کی کثیر رقم جو آئرلینڈ میکس اراضی کی شکل میں انگلینڈ کو ادا کرتا ہے وہ ناواجب و قانوناً ناقابل وصول ہے۔ یہ رقم اس قرضہ کی ادائی میں تھی جس سے زمینداروں کی اراضی خریدکر کاشتکاروں کو دیگئی تھی

ولیم کاسگریو کا کام اب پہلے سے بہت زیادہ مشکل ہوگیا، مگر رعب داب قائم رکھنے کی غرض سے اس نے تشدد کی پالیسی بدستور جاری رکھی۔ ریپبلکن خیالات کے لوگوں پر برابر سختیاں ہوتی رہیں، اور محبان وطن اب بھی گرفتار ہوکر قید خانہ میں بھیجے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے کاسگریو کا عہد حکومت مقبول نہ ہوسکا۔ اور فاناقیل پارٹی اہل ملک کے دلوں میں جگہ پاتی رہی۔ ۱۹۳۲ء کے انتخاب میں اس پارٹی کو حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۳۲ء میں آئرش فری اسٹیٹ کی حکومت کا صدر ڈی ویلرا مقرر ہوا۔ اس طور پر آئرلینڈ کی تاریخ میں پہلا موقع ہاتھ آیا جبکہ انتہا پسند پارٹی کا سرغنہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ پر ممتاز ہوا۔ نیرنگی زمانہ نے اس شخص کے سر پر حکومت کا تاج رکھدیا جو سولہ برس پیشتر بغاوت کے جرم میں پھانسی کا مستوجب قرار پاچکا تھا۔ مگر یہ وہ شخص ہے جس نے حب وطن کے جوش میں اپنی زندگی قوم اور ملک کے لئے وقف کردی۔ اس نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں تمکنت اور غرور کے ساتھ نہیں بلکہ انکساری اور عاجزی کے ساتھ لی۔ قومی خدمت اس کا مسلک ہے اور اپنے ملک کو دنیا کی سربرآوردہ قوموں کی فہرست میں داخل کرنا اس کی سیاست کا منتہائے نظر۔ اس نے پہلا کام بحیثیت پریسیڈنٹ یہ کیا کہ خود اپنی اور دیگر وزرائے حکومت کی تنخواہوں میں معقول کمی کردی۔ دوسرا کام پولیٹیکل قیدیوں کی رہائی تھا۔ کاسگریو کی حکومت نے پولیٹیکل قیدیوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ کردیا تھا۔ ڈی ویلرا نے ان کو ایک دم آزاد کردیا۔ حقیقتاً قوم کے اس فرقہ کو جس کی کوشش، ہمت اور ایثار نے ملک کو غیر قوم کے پنجہ سے آزاد کرایا تھا اب تک اس نعمت عظمیٰ کا لطف اٹھانے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس کے لئے آزادی کی نعمت "آسمان سے گری کھجور میں اٹکی" بنگئی تھی۔ برطانوی تشدد کی جگہ کاسگریوین پالیسی نے لے رکھی تھی اور ان کی زندگی اب بھی جیل کی چہار دیواری کے اندر ہی کٹتی تھی۔ ڈی ویلرا نے ان کو یہ موقعہ دیا کہ وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کریں۔ اس واقعہ کے بعد ہی قوم کے حریت پسند فرقہ نے قبرستان میں جاکر ۱۹۱۶ء کے شہیدان وطن کی یاد تازہ کی اور تہ دل سے ان کی روحوں کا احترام کرتے ہوئے ایک بار پھر قومی آزادی کا حلف اٹھایا۔

۲۲۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو ڈی ویلرا نے حکومت برطانیہ کے سامنے اپنا دعویٰ ان الفاظ میں پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ ان لوگوں کے لئے جو شاہ برطانیہ کی اطاعت کا حلف منسوخ کرنیکی کوشش میں ہیں اب حلف لینا ناقابل برداشت ہے اور امن وامان قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے

کہ یہ حلف موقوف کر دیا جائے۔ اور ٹیکس اراضی کی شکل میں جو کثیر رقم انگلستان ہر سال آئرلینڈ سے وصول کرتا ہے وہ جرمنی کے تاوان جنگ سے بھی زیادہ سخت ہے چنانچہ فری اسٹیٹ گورنمنٹ نے یہ طے کر لیا ہے کہ اب کوئی مزید رقم اس ٹیکس کی مد میں ادا نہ کی جائیگی وزرائے برطانیہ کے حلقے میں اس مراسلت کے موصول ہوتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ نوآبادیوں کے سکریٹری مسٹر ٹامس نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ فری اسٹیٹ گورنمنٹ کے اس فعل کو عہد نامہ ۱۹۲۱ء سے انحراف تصور کریگی۔ فری اسٹیٹ کو اوٹاوہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہ دیے جانے کی دھمکی بھی دی گئی۔ جون ۱۹۳۲ء میں ڈی ویلرا اور مسٹر میکڈانلڈ میں گفتگو کے لئے کانفرنس بھی ہوئی۔ لیکن ڈی ویلرا کے قدم نے جنبش نہ کی۔ اس کا اشارہ ایک ایسی سیاسی مفاہمت کی طرف تھا جس میں شمالی اور جنوبی آئرلینڈ ایک متحدہ شکل اختیار کرکے ریپبلک تسلیم کرلی جائے۔ اور برطانیہ آئرش ریپبلک اور نوآبادیوں کی ایک مجلس اقوام قائم ہو جس کا ہر ایک ممبر مساوی طرح ہو اور شاہ برطانیہ اس مجلس کے صدر ہوں۔

بہرحال فاناتا فیل پارٹی کے برسر حکومت ہونے سے آئرلینڈ کی پولیٹکل حیثیت ایک بار پھر مائل بعروج ہونے لگی ہے۔ حال ہی میں ۴ مئی ۱۹۳۳ء کو ڈبلن میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر ڈی ویلرا نے فرمایا ہے کہ ہم ان تمام باتوں پر نظر ثانی کریں گے جو آئرلینڈ کی خود مختاری اور مکمل آزادی کے رستے میں حائل ہیں۔ ہم کو توقع ہے کہ متحدہ آئرلینڈ کی ریپبلک قائم ہو جائیگی اور ہر شخص بہت جلد یہ محسوس کریگا کہ اگر ہم چاہیں تو آئرلینڈ میں ریپبلک کا اعلان کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا اعلان عوام الناس کی رائے معلوم کئے بغیر نہ کیا جائیگا حلف وفاداری کی تنسیخ کا قانون بھی ۳ مئی ۱۹۳۳ء کو پاس ہو گیا ہے۔ غرضکہ آئرلینڈ کی سیاسی گاڑی مکمل آزادی اور جمہوریت کی طرف بھاگا بھاگ دوڑ رہی ہے۔ اس کا گاڑیبان ایسا چابکدست، تجربہ کار اور مشاق ہے جو راستہ کی رکاوٹوں سے پست ہمت نہ ہو کر مہینوں کا راستہ ہفتوں میں طے کرنا چاہتا ہے۔ ہموطنوں کو اس گاڑی میں جتے ہوئے ہیں تیز روی پر آمادہ کرنے کے لئے کبھی پچکارتا ہے اور کبھی چابک سے کام لیتا ہے۔ دائیں بائیں جھاڑیوں اور کانٹے دار شاخوں سے ذرا نہیں گھبراتا۔ جو نہی کوئی چیز سد راہ نظر آئی کاٹ کر پھینکا اور راستہ صاف کرکے قدم آگے بڑھایا۔ نہ منزل کی طوالت سے ڈرتا ہے اور نہ سفر کی صعوبتوں سے مرعوب ہوتا ہے۔ اگر یہ رفتار قائم ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ چند ہی روز میں آئرلینڈ مہذب ترین اور خود مختار ممالک کی صف میں نہ آکھڑا ہوگا۔

مرزا رسوا مرحوم کی نثر

(۲)

(از جناب مولوی محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

(مراسلہ نمبر۲)

اگلے زمانہ سے شاعری کی مدح وذم میں بہت کچھ افراط و تفریط کی گئی ہے۔ مدح کی انتہا تو یہ ہے کہ یہ مصرع مشہور ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

اور ذم میں مثلاً ؎

در شعر مپیچ و در فنِ او　　چوں اکذب اوست احسنِ او

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شعر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ میں اور حیثیات سے قطع نظر کرکے صرف یہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لئے مفید ہیں اور بعض مضر، مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں وہ قسم حسن میں داخل ہیں، اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ قبیح ہیں۔ لیکن ہمارے اور ہمارے بعض معاصرین کے بعض اشعار (بلکہ ہمارے اکثر اشعار) ان دونوں صفتوں سے معرا ہیں نہ ان میں کوئی حسن ہے نہ قبح۔ لہٰذا ایسے شعر نہ اس مدح کے لائق ہیں اور نہ ذم کے۔ ایسے شعر کہنا ایک فعل عبث ہے۔ مصرعہ

شاعری جزویست از پیغمبری

یعنی مضامین القائی اور الہامی ہوتے ہیں۔ اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مضامین القائی والہامی سے کیا مراد ہے۔

آپ ہی انصاف سے دیکھیے کہ جس قسم کے اشعار آج کل ہمارے گلدستوں میں شائع ہوتے کیا وہ ع

شاعری جزویست از پیغمبری

کے مصداق ہو سکتے ہیں۔ لا واللہ ایسا نہیں ہے۔

اس کا ایک سبب کم علمی ہے۔ علم سے میری مراد بہت سی کتابیں پڑھ لینا یا کم از کم سلسلۂ نظامیہ کو کسی نہ کسی طور سے تمام کر لینا نہیں ہے۔ عقل اور فطرت تحصیل علم کے لئے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی قدر محنت چاہتا ہے اور اس کی ہمیں فرصت نہیں۔ جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے اُن کو اگلے کہہ گئے اب ہماری استادی صرف اُس سے استنباط کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اگر اس کا سلیقہ بھی ہم کو نہیں تو اُن کو اور خراب کرتے ہیں۔ ہماری شاعری سماعی اور کتابی ہے نہ نظری۔ ہم خود فطرت کو مشاہدہ کرکے غور کرنے اور کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگلوں کے مضامین کو اپنے لفظوں میں دوہرا دینا ہمارا خاص کام ہے اور اسی پر ہمیں فخر ہے۔

علم طبیعیات الٰہیات اور شعر بظاہر ان کے مقاصد جدا جدا ہیں اور شاعر کو حکیم سے اول مرتبہ پر رکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعر نازک خیال انجام دے سکتا ہے۔ فطرت سے دقیق مضامین کو اخذ کرنا اور اُس کو عام فہم اور موثر الفاظ میں کہہ جانا خاص شاعر ہی کا کام ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے بھی زیادہ ترقی کرکے کہتا ہوں کہ حقایق اور معارف کو جس پیرایہ سے شاعر ادا کرتا ہے فلسفی کی مجال نہیں ہے کہ اُسے بیان کر سکے۔ خیال کے آئینہ خانہ میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیاری پیاری صورتیں تجسم ہوتی ہیں اور صوت و حرف کے ذریعہ سے سامعہ تک پہونچتی ہیں۔

شاعری کی وسعت مثل فسحت عالم کے لامتناہی ہے، اس کا جولان گاہ فلسفہ کی حد رسائی سے کہیں آگے ہے۔ جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے شاعروں کی تخیل کئی قرن پہلے اُن کو پاچکی ہے۔ شاعر اعلیٰ رموز حکمت کو اس طرز دلآویز سے کہہ جاتے ہیں کہ فلسفی کو اُس کے بیان کرنے کے لئے بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ تمہید مطالب اور ترتیب مقدمات میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھی جیسا چاہیئے وہ امر ذہن نشین نہیں ہوتا۔ شاعر کی زبان میں خداداد اثر ہوتا ہے مگر ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء جس طرح کوئی شخص اپنی کوشش سے حسین نہیں ہو سکتا اوسی طرح فطرت سلیم بھی بنانے سے نہیں بنتی۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر صاحب شعر کہتے کہتے بوڑھے ہو گئے مگر کوئی شعر مزے کا نہ نکلا اور ایک طفل مکتب نے وہ شعر پڑھ دیا کہ مشاعرہ اُلٹ گیا۔

ممکن ہے کہ میری اس تقریر سے بعض نوعمر شاعر بیدل ہو جائیں اس لئے کہ جب شاعری امر خداداد ٹھہرا تو پھر اُس کا اکتساب غیر ممکن ہو گیا لہٰذا ہر شخص کو جو شعر کہنا چاہئے پہلے یہ دریافت کرنا

ضروری ہوا کہ آیا اُس کی طبیعت اس کے مناسب ہے یا نہیں۔ اس موقعہ پر صرف یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فطرت نے ہر انسان کو اواسطا استعدادات عطا کئے ہیں۔ فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات اور عوارض کو بہت کم دخل ہے۔ حد خاص سے زیادہ خوبصورت اور حد خاص سے زیادہ بدصورت بہ مشکل مل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک مزاج اور عادت کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگاؤ ہے۔ فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص ہر باشندہ کو عنایت کی ہے۔ انگشت نمائی کے لائق معدودے چند ہوتے ہیں۔ اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ ہرگز شعر موزوں کرنا کیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناموزوں طبیعت والے مشکل سے ملیں گے۔ لہذا اوسط درجہ کے دماغ والے اکثر موزوں طبع بھی ہوا کرتے ہیں۔ مگر اکثر استعدادات بہ سبب عدم مزاولت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتدا خراب ہو کر درستی کے قابل نہیں رہتی۔ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل اُستاد سے موسیقی نہیں حاصل کرتے اور ابتدا ہی میں سُر بیورہ ٹھیک نہیں کر لیتے اُن کو بد آواز اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے۔ لہذا ہر مبتدی کو اپنی ابتدائی درستی کا خیال نہایت ہی ضروری ہے اگر طبیعت ابتدا ہی میں خراب ہو گئی تو استاد کامل کی کوششوں سے بھی کوئی اثر مترتب نہ ہوگا مثلاً ہمارے شہر کے اکثر شعرا اور اُن کے تلامذہ کو مناسبات الفاظ کا لحاظ حد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک صنعتِ شعری ہے اور محسنات کلام میں داخل ہے مگر اب سلیقہ شعرا اس کو عیوب شعر میں شمار کرنے لگا ہے اور اس بدعادت کا اثر اس قدر شائع و ذائع ہو گیا ہے، کہ اب اُس کا ترک من قبیل محالات سمجھا جاتا ہے، اسی طرح بعض تشبیہات جو کسی اگلے اُستاد نے کسی موقع پر نظم کر دیے تھے۔ اب اس کی اس کثرت سے جھاڑ کی گئی کہ سننے والوں کو اُن سے نفرت ہو گئی۔ اور نفرت کی وجہ یہ ہے، اولاً یہ غور کرنا چاہیئے کہ:۔

تشبیہ استعارہ مجاز مرسل کنایہ اور صنائع و بدائع معنویہ و لفظیہ یہ سب مجموعاً و کلیتہً کیوں باعث لذت ہوتے ہیں؟ اس مسئلہ کا جواب ہم کو علم نفس سے مل سکتا ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے پہلے اتنا کہہ لینے دیجئے کہ اگر وہ شرط جس کی وجہ سے یہ امور باعث لذت ہوئے تھے۔ فوت ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کا مشروط یعنی لذت بھی فوت ہو جائے گی۔ واضح رہے عالی ہو کہ ان امور میں صرف قوت باعث لذت ہے یعنی قائل کا قول سامع کے لئے صرف قوت کا باعث ہوتا ہے۔ قوت سے یہاں قوتِ ذہنی مراد ہے۔ توجیہ مزید اس کی یہ ہے کہ انسان میں دو سبب لذت

گئے ہیں۔ (۱) استعمال قوئے بحالت صحت (۲) ارتفاع الم۔ اور وہی استعمال قوی ایک حد خاص سے تجاوز کرنے کے بعد موجب الم ہو جایا کرتا ہے۔ اس صورت میں ترک فعل ضروری ہو جاتا ہے۔ اور یہ دوسری قسم میں داخل ہے یعنی ارتفاع الم میں۔

تشبیہات غریب و بعید کے سننے کے بعد سامع کو قوت فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور یہی موجب لذت ہوتا ہے۔ تشبیہ کی ندرت ایک استعجاب خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجاب خود ایک فعلیت دماغی کا نام ہے۔ کیونکہ اس صورت میں دماغ کے اُن مرکزوں تک اثر پہونچتا ہے جو ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔ تشبیہات قریب مبتذل میں نہ استعمال قوت کا موقعہ ملتا ہے نہ وہ باعث استعجاب ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن میں کسی قسم کی لذت نہیں ہے۔ ایسے مضامین کو سنانا سامعہ خراشی ہے اور سامعہ خراشی درحقیقت ایک امر مولم ہے۔ لہذا اس قسم کے شعر درحقیقت مولم اور موذی ہیں۔ اور اُن کے سننے اور سنانے سے احتراز اولی ہے۔

آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو۔ وہ مجہول الکنہ بات یہی ہے جس کی اصلیت کو ہم نے بیان کر دیا۔ یعنی شعر میں ایسی کوئی بات ضرور ہو جس سے سامع کو قوت دماغی کے استعمال کے صرف کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس کی بھی ایک حد خاص ہے یعنی صرف قوت کو اعتدال ضروری ہے بعض صاحب معنی بند شعر کہتے ہیں۔ ایسے لوگ دہلی میں بہت تھے جن کے ہر شعر کے سمجھنے کے لئے قوت فکر کو حد اعتدال سے زیادہ محنت کرنا ہوتی تھی۔ اس قسم کے اشعار بھی لذت اور تفریح کے لئے مفید نہیں ہیں۔ ایسے چند شعر سن کے طبیعت تھک جاتی ہے اور اور پھر اس طرف تادیر متوجہ نہیں ہوتی۔ دماغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں۔ اُن کی لذت کے لئے نازک خیالیوں کی ضرورت ہے۔ نازک خیالی اور دقت مضمون دو امر جداگانہ ہیں۔ ایک کے دھوکے سے دوسرے کو اختیار کر لینا بڑی غلطی ہے۔

پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ شاعری کی وسعت مثل صنعت عالم کے غیر محدود ہے۔ اس سے میری یہ مراد ہے کہ مبادی مضامین جس کو مبادی تشبیہ بھی کہہ سکتے ہیں لاتعد و لاتحصیٰ ہیں۔ ان میں سے بعض کا میں ذکر کرتا ہوں۔

آسمان۔ اس سے ہم کو عظمت۔ وسعت۔ رفعت کے ایسے عالی مضامین مل سکتے ہیں مگر ان سب کے ساتھ ہی خوف کی اصل بھی اس میں شامل ہے۔ علم نجوم کے اعتقاد نے اُس کے ساتھ ہمارے

تعلقات کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ عام اس سے کہ کسی کو نجوم پر اعتقاد ہو یا نہ ہو زبان مروجہ اُس کے
لوث سے مشکل پاک ہو سکتی ہے۔ علم نجوم نے آسمان کے صفات اصلی مثلاً فضا اور نظام کے تصورات
کو بہت نقصان پہنچایا۔ اب ہمارے شعرا اُس کو ظالم اور کج رفتار ہی کے خطاب سے اکثر یاد کرتے ہیں۔ نظام
بطلیموسی نے آسمان کو محدود کر دیا ہے۔ اس لئے ہم کو اُس کی فضائے لامتناہی کا تصور جس کا بہت ہی
عمدہ اثر تخیل بلکہ اخلاق پر ہو سکتا ہے اُسے محدود کر دیا۔ مسائل ابتدائی علم ہیئت جس سے کہ اجمالی تصور
عالم سماوی کا ذہن میں پیدا ہو جائے شاعر کے لئے منجملہ واجبات ہے۔ صرف نظام شمسی جس میں ایک آفتاب
اور نو سیارے اور متعدد اقمار شامل ہیں، اگرچہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ ہمارا وہم اُس کے ادراک سے
قاصر ہے پھر بھی کل عالم کی وسعت کے مقابلہ میں ایک ذرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے
ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی کہہ دینا چاہیئے کہ ہمارے معاصرین اکثر کم متصل اور منفصل کے تصور اور تقابل سے
بے بہرہ ہیں، اور اس صورت میں ممکن نہیں کہ عالم کی وسعت کا ایک اجمالی تصور بھی اُنکے ذہن میں آ سکے۔
عظمت مضامین شعریہ میں سے اصل اول ہے، جب اُس کے تصور سے شاعر بے بہرہ رہیگا تو اُس
کے ذہن پر اصل کا اثر بھی نہ ہوگا۔ اور نہ اشعار میں اُس کے اُن کا پتہ پایا جائے گا۔ ہم فضائے اثیری
اور اُن بے شمار اجسام سے جو اُس میں ایک وضع خاص و رفتار خاص کے ساتھ حرکت کرتے رہتے
ہیں بالکل واقف نہیں، نہ ہم کو اجرام سماوی کا وزن اور حجم اور رنگ اور اُن کے تغیرات کے میقات پر
اطلاع ہے۔ نہ ہم اُس نظام موسیقی سماوی کو سمجھ سکتے ہیں جس کا فیثاغورث نے تقریباً دو ہزار پانسو
برس پیشتر ذکر کیا تھا۔ علم موسیقی نظری سے ہم بالکل بے بہرہ ہیں۔ علم تالیف اور ایقاع کو جانتے ہی
نہیں۔ چند وزن متعارف کو جن پر اُردو شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے اپنی موزونی طبع کا جولانگاہ
سمجھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ہم کو یہ نہیں معلوم کہ کونسا وزن شعری کس قسم کے بیان کے لئے مناسب ہے۔
شاعری ہمارے دو مصرعوں پر موقوف ہے۔ اگر اُن میں مناسبات معمولی ہوئے اور بعض وہ متعین
جو رائج الوقت ہیں شعر میں پائی گئیں تو گویا ہم نے شاعری کا حق ادا کر دیا۔ جس طرح ہمارے مضمون
مصنوعی یعنی غیر طبعی ہیں اسی طرح ہماری طبیعت بھی اُس کی معتاد ہو گئی ہے۔ ہمارا مذاق شعر بالکل صحیح
نہیں ہے۔ نہ ہم فطرت کی عظمت جمال اور لطافت سے متاثر ہو سکتے ہیں اور نہ اُس کا انعکاس ذریعہ
ہمارے اشعار کے ہمارے سامعین یا ناظرین پر پڑ سکتا ہے۔ ہم نے اصلی باغ کو نہیں دیکھا، کاغذ کے کٹے
ہوئے پھول آرائش کے تختوں پر دیکھ لئے ہیں اُسی کو تختہ گلزار سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم نے بن کا رُخ کبھی
نہیں دیکھا مگر اپنے قیاس سے (جس کی وسعت معلوم) اُس کا نقشہ کھینچنے کے لئے آمادہ ہیں۔ بغیر علم

ہیئت کے مبادی کو سمجھے ہوئے ہم کم از کم ایک ثلث اپنی شاعری کا مندۂ غفلت کر دیتے ہیں۔ باقی
سب دو ثلث اُن کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگلے شاعروں میں سے
بھی اکثر اُن علوم سے بے بہرہ تھے جن کا ذکر اب تک کیا گیا یا آئندہ کیا جائے لیکن اُن کے اشعار مقبول
ہیں۔ اگر اگلے شاعروں سے عرب کے زمانۂ جاہلیت کے شاعر یا اُسی طبقہ کے شعرا جو اور ملکوں اور قوموں
میں سرآمد روزگار ہو گئے ہیں مراد ہیں تو ہم کہیں گے کہ اُن کی شاعری ہرگز کتابی نہ تھی۔ اُن کے اذہان علوم
کتابی سے خالی تھے مگر اُن کا دل فطرت کا آئینہ تھا۔ اُن کی توجہ صوت و حرف میں مقید نہ تھی۔ وہ حقیقتوں
کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کر کے اپنی زبان سے اُس کو ادا کر دیتے تھے۔ متاخرین یورپ اس بھید
کو سمجھے ہوئے تھے۔ اُن کے شعرا نے اپنی طبیعت کو اس آزادی کے ڈھرے پر ڈال دیا جو شاعری
کے لئے موزوں ہے۔ وہاں کا ہر ایک شاعر عجائبات دنیا کی سیر خوشنما جھیلوں اور جزیروں گھاٹیوں
اور آبشاروں کو دور دراز سفر کر کے ملاحظہ کرنا۔ تاریخی مقامات پر جانا منجملۂ واجبات سمجھتے ہیں، لہٰذا اُن
کے اشعار سے ناظرین کو سیر بین کا لطف آتا ہے۔

والٹر اسکاٹ ایک رزمیہ گو شاعر اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ اُس کے وطن کے پہاڑ سبزہ زاروں
سے آراستہ نہ تھے، اُس نے عالم طفولیت و شباب میں انھیں پہاڑوں کی ایک ایک گھاٹی کو نہایت شوق
سے دیکھا تھا۔ اس کو اس قسم کے سنگستان سے ایک اُنس سا تھا۔ ان پہاڑوں کے سیر کرنے والے پر
ظاہر ہے کہ سوائے ہول اور وحشت کے اور کیا اثر ہو سکتا ہے۔ ہول اور وحشت کے مقابلے کے لیے
انسان میں ایک قوت ہے جس کو قوت غضبی کہتے ہیں۔ اسی قوت کی تہذیب کا نام علم الاخلاق
میں شجاعت رکھا گیا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص جس کے نفس پر ہول اور دہشت کا تصور ہوتا رہتا ہے
اور وہ عالم خیال میں بسبب اپنی ذاتی شجاعت یا بسبب اُس جوش کے جو شجاعان ملک کے تاریخی
واقعات پر نظر کرنے اور اُن مقامات کے دیکھنے سے جہاں معارک جدال و قتال واقع ہوئے ہول پیدا
ہو جاتا ہے۔ مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہوگا تو ضرور رزمیہ اشعار خوب کہے گا اور یہی حال اسکاٹ
کا ہوا۔ فردوسی کے واقعات پر نظر کرنے سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدو شعور سے اُس کو دہقان
پیر کی زبانی اگلی سپاہگری کے معرکوں کی کہانی سننے میں لطف آتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں انتہا کی
جوانمردی تھی۔ اور جن ملکوں میں اُس کو سفر کرنا پڑا وہ نہایت ہی دشوار گزار اور ہولناک تھے۔ یہی
اسباب جمع ہو کے شاہنامہ کی تصنیف کا باعث ہوئے۔ سعدی کی حیات سے ظاہر ہے کہ اسکو
سن شباب میں ترک وطن کر کے بغداد آنا پڑا اور یہیں وہ طالب العلمی کر کے فاضل مستند کے درجہ پر فائز ہو

پھر اس کو متعدد سفر کرنا پڑے۔ اور دنیا کے نشیب و فراز دیکھے۔ بہت بڑا تاریخی انقلاب جو اُس کے زمانے میں ہوا وہ سلطنت عباسیہ کا زوال اور سلطنت مغلیہ کا عروج تھا۔ یہی سب امور اُسکے رنگ طبیعت کے موجب ہوئے۔ اُس کے اشعار سے انتہا کی تجربہ کاری پائی جاتی ہے۔ ظرافت و شاعرانہ کمال اُس کا ذاتی ہے جس نے اس کے اشعار کو نہایت ہی بامذاق کر دیا۔

خلاصہ تقریر یہ ہے کہ ذاتی تجربہ کو اس فن میں بہت کچھ دخل ہے۔ تجربہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اتفاقات ایسے ہوں کہ اکثر اشیا کا مشاہدہ ہو جائے مثلاً دور و دراز کا سفر، خانگی حالات، ملاقات احباب یا اور اسی قسم کے جو اسباب ہوں یا بذریعہ علم کے قصداً تجربہ کئے جائیں جیسا کہ علوم عقلیہ تجابیہ کا معمول ہے اصطلاحاً جو امور بلا قصد پیش آتے ہیں اُن کو مشاہدہ اور جو بالقصد کیے جاتے ہیں اُن کو تجربہ کرتے ہیں

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہمارے اکثر معاصرین تجربہ متصل و منفصل سے بے بہرہ ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ذہناً اعداد اور ابعاد کا توہم نہیں کر سکتے اگرچہ اس کا علم بھی ہو۔ مثلاً زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے اور محیط پچیس ہزار میل۔ یہ اکثر صاحبوں کو معلوم ہوگا۔ مگر پچیس ہزار میل زبان سے کہہ دینا یا بذریعہ رقوم و اعداد کے کاغذ پر لکھ لینا ناکافی ہے۔ اس پچیس ہزار میل کا توہم حقیقی اُس کو ہو سکتا ہے جس نے کل زمین کا دورہ کیا یا یہ کہ مثلاً اور ذرائع سے اوس کا تصور حاصل کیا ہے۔ ایک یہ کہ اگر ریل گاڑی تیس ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے اور کسی جگہ نہ ٹھہرے تو آٹھ سو تینتیس گھنٹہ بیس منٹ میں زمین کا دورہ پورا ہو جائے گا جس کے چونتیس ۳۴ یوم سترہ ساعت بیس منٹ ہوتے ہیں۔ اگر اس مدت تک ریل گاڑی پر بیٹھے رہیں تو کس قدر کسل ہوگا۔ یا مثلاً با پیادہ زمین کے گرد سفر کریں (اگر بشرط امکان) اور بیس میل فی یوم چلیں تو بارہ سو پچاس دن یعنی تین سال قمری چھ ماہ گیارہ یوم میں دورہ کامل ہو جائیگا۔ (تین مہینہ ۳۰۔ اور تین مہینہ ۲۹ یوم کے۔)

اجرام سماوی میں سے آفتاب کا اثر تخیل پر سب سے زیادہ ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ مذہب کی تاریخ کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب پرستی بہت ہی قدیم مذہب ہے۔ اکثر زبانوں میں جہات اربعہ کے نام سے وضع سایۂ شمس کی پائی جاتی ہے۔ مثلاً لفظ شمال کے معنی بائیں ہاتھ کے ہیں۔ اگر کوئی شرق کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو تو ضرور شمال اوس کے بائیں ہاتھ کی طرف پڑے گا۔ آفتاب کی حرارت سے قوت قہری اور اشراق اور ضو سے نور۔ اور ضو اور حرارت کی آمیزش سے جلال کا تصور پیدا ہوتا ہے ہمارے ملکوں میں گرمی زیادہ ہے۔ اس لئے اس کا تصور الم سے خالی نہیں۔ سرد ملکوں کے بسنے والوں

کا خیال نسبت آفتاب کے بہت اکثر ہے۔ ان کے نزدیک اس میں شان محبوبیت پائی جاتی ہے اور اس کا غضب وجلال جوتا ہے ہمارے ملکوں میں بھی ظہور نیر اعظم کے وہ اوقات جن میں حرارت اعتدال کے ساتھ ہے نہایت ہی پسندیدہ منظر دکھاتے ہیں۔

شفق سفیدۂ سحری اور طلوع آفتاب سے ہزارہا مضامین اخذ کئے گئے ہیں۔ چونکہ آفتاب کا جرم مرئی چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے اور عام نگاہیں اس کی عظمت کی حد تک نہیں پہونچ سکتیں، ایک اجمالی تصور اس امر کا کہ آفتاب زمین سے بڑا ہے شاید عام لوگوں کو بھی ہو مگر وہ کافی نہیں ہے۔ اس امر کا تصور دل میں بمشکل پیدا ہو سکتا ہے کہ آفتاب اور زمین کے قطروں میں (۷۹۱۲) امیال اور (۸۰۰۰۰) امیال کی نسبت ہے یا یہ کہ آفتاب زمین سے (۹۵۲۹۰۲۹۰) امیال کی دوری پر ہے۔ اور یہ امور تو اس سے بھی زیادہ بعید الفہم ہیں کہ اس قدر بُعد سے آفتاب زمین کو کھینچتا ہے۔

ماہتاب آفتاب سے استفادۂ حرارت و نور کرتا ہے کسب حرارت کی مثال آتشی شیشہ سے بہتر نہ ہوگی جو اس قدر بُعد سے اتنی حرارت جذب کر لیتا ہے کہ آگ لگا دینے کے لئے کافی ہو۔

سوائے ماہتاب کے اور سیارے بھی کسب نور کرتے ہیں اور یہ لحاظ قرب و بُعد اور مسامتت اور عدم مسامتت کے کمی اور زیادتی نور کی مثل قمر کے اُن سیاروں میں بھی ہوتی رہتی ہے۔

اجرام سماوی کے اوقات ظہور و خفا اور حرکات مستقیمہ و رجعت وغیرہ سے شعرا نے بہت کام لئے ہیں۔

اشکال سماوی جن کا تعین اور تسمیہ محض وہمی تھا شاعری میں مدتوں سے جاری ہے۔ ہمارے شعرا کے خیالی آسمان میں اشکال و بروج وغیرہ زندہ موجود رہتے ہیں۔ اور اُن کی طرف صفات ذی حیات جانوروں کے منسوب کیے جاتے ہیں، مگر اب اوس میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اس لیے کہ اثر موہوم واقعیت سے بہت بعید ہو گیا ہے۔ اور اب جس قدر اثر باقی ہے وہ بہ سبب عدم علم کے ہے۔ ورنہ درحقیقت اُس میں کوئی لطف نہیں ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ باریک یہ عرض کرنا ہے کہ ہر تشبیہ کی وسعت وجہ شبہ تک محدود ہے اُس سے زیادہ توسیع لغو محض ہے۔ مثال اُس کی یہ ہے کہ معشوقوں کے خط کو سبزہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اب اس سبزہ کے لئے کوئی بالو رچرندہ قرار دینا یا اُس سبزہ کا خشک ہو جانا یا اُس سبزہ کا سوکھی گھاس بنکے ہوا میں اڑ جانا یہ مضامین وجہ شبہ کی حد سے خارج ہیں فلہذا لغو ہیں۔

تشبیہوں کو اپنی حد پر رکھنا فطرت سلیم کا کام ہے ورنہ متقدمین اور متاخرین اکثر کے کلام میں یہ نقص پایا جاتا ہے غالباً اس قانون کی طرف توجہ نہ تھی۔

—

میں سابق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا آسمان ذہنی ہے ہم کو عالم خارجی کے مشاہدہ کا شوق ہی نہیں۔ اس وجہ سے ہم کو ثوابت اور سیارات، ذوات الاذناب۔ شہاب۔ بروج و اشکال۔ کہکشاں۔ خسوف و کسوف۔ زمین۔ جو۔ فضاء ہوبیہ۔ بخارات طوفان۔ گرد باد۔ سحاب۔ رعد۔ برق۔ باراں وغیرہ سے نئی نئی تشبیہیں مل سکتی ہیں۔ ورنہ یہ مساوی تشبیہہ ہمارے اور نیز ہمارے بعد دت ہائے مدید تک بلکہ تا قیامت شاعروں کے واسطے کفایت کرتے ہیں۔ مبدء فیاض کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ مگر لینے کے واسطے تیز چاہیئے۔

زمین جس پر ہم آپ رہتے بستے ہیں یہی کیا کم ہے۔ کوہستان۔ وادی۔ غار۔ میدان جنگل۔ سمندر۔ دریا۔ چشمہ سار۔ آبشار۔ ترائی۔ سراب وغیرہ سب خدا کی قدرت کے نمونے ہیں ان کے علاوہ زمین پر جو چیزیں پائی جاتی ہیں از قسم جمادات و نباتات وحیوانات۔ جمادات میں سے طرح طرح کے خوش رنگ پتھر۔ الماس۔ یاقوت۔ زمرد۔ پکھراج۔ نیلم وغیرہ۔ نباتات میں سے ہر قسم کے درخت، ان کے رنگا رنگ پھول یا بیخ و شاخ و برگ۔ غنچہ۔ ثمر۔ نمو۔ رس۔ یا حیات حیوانی کیں سے صحت و مرض۔ استخوان۔ رباطات۔ عضلات۔ دل۔ جگر۔ پھیپھڑ۔ معدہ۔ طحال۔ سر۔ مُخ۔ دماغ۔ زبان۔ دست و بازو۔ ہاتھ پاؤں۔ پھر ان کے اجزا اور لوازم میں طرح طرح کی منفعتیں اور خوبیاں ہیں جن کی تصویریں شاعروں کو ہو بہو دکھانا چاہیئے ہیں۔

حیوانات مخصوصہ مثل شیر و پلنگ۔ روباہ۔ خرس۔ گوسفند۔ گاؤ۔ اور دوسرے وحش وطیر و ہوام وغیرہ۔ وہوام غرضکہ یہ سب شعرا کے واسطے ہیں۔ مخلوقات الٰہی کے ماورا انسانی مصنوعات سے شعرا نے بہت کچھ مضامین اخذ کئے ہیں مثلاً جہاز۔ قصر و منار وغیرہ۔

حال کے مصنوعات مثل ریلوے انجن و تار برقی وغیرہ کو ابھی ہمارے ملک کے شاعروں نے علیحدہ رکھا ہے اس کی وجہ معلوم نہیں۔

فطرت کے ذخائر سے ابھی بہت ہی کم چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمارے شعرا نے کام لیا ہے مثلاً اقسام طیور ہی کو لیجیئے۔ اہل علوم نے تین ہزار سے زیادہ انواع طیور کا بیان کیا ہے ہمارے شعرا کو ان میں سے بلبل۔ کبک۔ طاؤس۔ طوطی۔ قمری۔ زاغ۔ ہما۔ عنقا۔ موسیقار۔ بس انھیں چند جانوروں کا نام یاد ہے۔ ان میں سے موسیقار۔ ہما اور عنقا محض خیالی ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس نباتات میں بھی یہی کیفیت ہے۔

اب علوم کی طرف آئیے۔ آلہیات۔ ریاضیات۔ طبیعیات۔ علم تمدن۔ تدبیر منزل۔ علم اخلاق۔

ان علوم کے ان مسئلوں کو شعرا اس خوبصورتی سے بیان کر سکتے ہیں کہ سامع ہر چند کم فہم ہو مگر وہ اُسے سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ مبادی تشبیہ کو جس تفصیل کے ساتھ میں بیان کرنا چاہتا تھا وہ اُس بے اطمینانی اور تشویش کے زمانہ میں مجھ سے نہ ہو سکا مگر پھر بھی آپ اگر ایک نظر اُن امور کی طرف کریں گے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور پھر اپنے ملک کی شاعری کو ملاحظہ کریں گے تو آپ پر واضح ہو جائیگا کہ ہماری شاعری کس درجہ محدود ہے۔ اور ملکوں کے شاعر دور دراز ملکوں میں جا کر آثار فطرت اور مصنوعات انسانی کا ملاحظہ کرتے ہیں۔ مثلاً یورپ کے شاعر ملک اطالیہ خصوصاً مدینۃ الکبریٰ میں جا کر قدیم رومیوں کی عمارت تمدن معابد و ہیاکل کو دیکھنا لازم اور ملک سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کا تماشا واجب سمجھتے ہیں۔ ہمارے وطن لکھنؤ کے شاعروں میں سے اکثر کلے پہاڑوں تک نہ گئے ہونگے جو ناف شہر سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ خود شاعر کے دل پر جس چیز کا اثر پڑتا ہے جب اُسے وہ بیان کرتا ہے تو اور لوگ بھی اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری وجہ تو اس کی یہ ہے کہ جس امر کا تجربہ خود انسان کو نہیں ہوتا اُسے وہ بیان ہی نہیں کر سکتا۔

مخلوقات اور مصنوعات عالم خارجی کے سوا عالم ذہنی سے بھی بہت سے مضامین شعرا کو مل سکتے ہیں۔ یعنی اُن چیزوں سے جن کو ہم نے بذریعہ کسی حس کے دریافت نہیں کیا ہے بلکہ اُن کا وجود بالفعل ذہنی ہے۔ مثلاً بہشت۔ دوزخ۔ قیامت۔ میزان۔ صراط وغیرہ اس قسم کے مضامین مذہبی تخیلات کے واسطے بہت ہی مفید ہیں۔ علم تاریخ سے شعرا کو بہت مضمون مل سکتے ہیں۔ نامی گرامی شعرا کے کلام میں تلمیحات تاریخی ہوا کرتے ہیں۔ تلمیح کا رواج ہمارے شعرا میں کم ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ واقعات تاریخی نہ عام شعرا کو یاد ہیں نہ عام سامعین اور ناظرین ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تلمیحات کو فروگذاشت کرنے کی کوئی وجہ کافی موجود نہیں بلکہ اگر اس کی مراعات کی جائے تو میدان شعر وسیع ہو سکتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ واقعات جن کو شاعر نظم کر دیں گے وہ ضرور ہی مشہور ہو جائیں گے۔ ہمارے شعرائے ہندوستان کے فخر وہ شاعر مرزا دبیر اور میر انیس اعلی اللہ مقامہما نے احادیث و روایات کو نظم کرنے کا التزام کیا اور اس قسم کی تلمیحات اپنے کلام میں داخل کیے اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو لوگ اُن کے کلام بلاغت نظام کے دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں، اُن کو ہزارہا واقعات تاریخی سیرت انبیا و ائمہ ہدا پر اطلاع ہو گئی۔ اخلاق پر اس سے بہت ہی عمدہ اثر پڑا۔ جیسی ان دو شاعروں کی تعظیم و توقیر ہوئی اور

شعرا کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا اُن کا کلام مطبوع ہوتا جائے گا۔ اس سے زیادہ اُن کا کلام قدر و منزلت کے لائق تھا۔ مگر افسوس کہ اُن کی شاعری کا تعلق فرق اسلام میں سے صرف ایک فرقہ کے ساتھ تھا۔ اگر اس مذہبی خصوصیت سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو بھی یہ شاعری قابل قدر ہے۔ یہ خصوصیت تو باعتبار مضامین کے تھی، ایک خصوصیت باعتبار صورت ظاہری کے بھی ہے، وہ یہ کہ جزو اعظم اُن کے مرثیوں کا صرف ایک صنف شعر ترکیب مسدس کے ساتھ مختص ہے۔ ممکن تھا کہ ہر صنف شعر میں مرثیئے کہے جاتے۔ یا سوائے اُن مضامین کے جو مرثیہ کے ساتھ مختص کر دیے گئے ہیں عام مضامین حکمت و اخلاق کے کہے جاتے۔

اس موقع پر مجھے یہ بھی کہنا پڑا کہ ہمارے شعرا نے نہ صرف از روئے معنویت بلکہ لفظاً بلکہ وزناً بھی اپنے کلام کو محدود کر دیا۔ بحور اور اوزان جو اُردو شاعری میں رائج ہیں وہ بھی بہ نسبت فارسی اور عربی کے کم ہیں۔

بعض صاحب یہ کہیں گے صرف وہی وزن از روئے طبیعت پسندیدہ ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اوزان بحور مزاولت سے مطبوع اور پسندیدہ ہو جاتے ہیں یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ بعض اوزان جن کو میں خود غیر مطبوع تصور کرتا تھا مزاولت سے مطبوع ہو گئے اور مزاولت کے واسطے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے جو وزن اچھا نہ معلوم ہوتا ہو اُس میں چند شعر کسی شاعر کے کہے ہوئے یا اپنے آپ ہی چند شعر موزوں کرکے دس بارہ منٹ تک زبان سے پڑھے جائیں یا کم از کم الفاظ وزن کو زبان پر جاری کریں اور اگر مع ترنم ہو تو جلد تر اثر ہوگا۔

اوزان شعر میں اور تصرفات جائز بھی ہو سکتے ہیں بلکہ بعض تغیرات کیے بھی گئے ہیں اور وہ علی العموم پسندیدہ ہوئے۔

ایک اور امر بھی لائق غور ہے کہ ہمارے شعر کہنے کا کیا اصول ہے۔ آج کل عموماً غزل گو شاعر زیادہ ہیں۔ کہیں مصرع طرح کا دے دیا گیا یا خود کسی اُستاد کے دیوان کی کوئی طرح پسند کی یا خود ہی اپنی طبیعت سے کوئی نئی زمین نکالی، اب قافیوں پر نظر کی اور ہر ایک قافیہ کا لگاؤ ردیف کے ساتھ دیکھنا شروع کیا، اسی اثنا میں ہر قافیہ کے ساتھ مصرعہ کہنے لگے۔ اب اِن مصرعوں پر مصرعے لگا دیے چلیے غزل ہو گئی۔ مطلع کہنا قدرے طلب ہے اس لیے کہ اُس میں دو قافیوں کا باہمی ربط اور پھر ردیف کے ساتھ دونوں کا علاقہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بہرصورت مضامین قافیوں سے پیدا کیے جاتے ہیں غزل اور غزل کے مثل جو اصناف شعر میں مثلاً قصیدہ اور ترکیب بند اور ترجیع بند

سب کی ترکیب کا اصل اصول یہی ہے۔ مرثیہ میں بند کا پہلا یا چوتھا یا چھٹا مصرعہ پہلے کہہ لیتے ہیں اور پانچ مصرعہ اور لگانا پڑتے ہیں۔ غزل میں مضمون کو سمیٹنا پڑتا ہے اور مسدس میں پھیلانا پڑتا ہے۔ رباعی میں بھی صرف ایک مصرعہ کہہ کے تین مصرعہ اور قوافی کی پابندی سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

ان سب اصناف میں شاعر کی طبیعت کو قافیوں کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔ مثنوی میں البتہ شاعر کسی قدر آزاد ہوتا ہے۔ ہر ایک مصرعہ اپنی طبیعت سے مضامین کی مناسبت کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور دوسرا مصرعہ اس مصرعہ کے کسی قافیہ کی پابندی سے کہنا ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر مثنوی کہنے والے دوسرے مصرعے برائے بیت لگا دیا کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصرعہ کہا اور دوسرا مضمون جو اس سے دست وگریباں ہے اس مصرعہ کے قافیہ کے ساتھ نہیں آتا۔ اس صورت میں سخت افسوس ہوتا ہے۔ نواب مرزا شوق مرحوم کا وہ شعر

عشق کیا چیز ہے بلا جانے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

دونوں مصرعوں میں کیسی مناسبت ہے۔ گویا دوسرا مصرعہ اسی کے لئے تھا مگر قافیہ نہ ملا۔

اسی مشکل پر نظر کرکے متقدمین یونان اور متاخرین انگلستان نے قافیہ کی قید کو اڑا دیا۔ نظم بے قافیہ کہنی شروع کی۔ اس قسم کی نظم کو ہمارے بر اعظم میں نثر مرجز کہتے ہیں۔

جب پہلے پہل انگلستان میں نظم بے قافیہ میں لوگوں نے شعر کہے، ڈاکٹر جانسن سے جو اس وقت کے محققین لغت سے تھا لوگوں نے رائے طلب کی۔ جانسن نے کہا کہ پھر اس سے نثر ہی کیوں نہیں کہتے۔ اگر ہمارے ملک میں کوئی اس طرح کی نظم کہے (بلکہ بعض نے کچھ کہا بھی) تو اس کی نسبت یہی کہا جائیگا۔ راقم الحروف نے خود کئی مرتبہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ واقعی کچھ بے تکی سی معلوم ہوتی ہے[1]۔

سوائے نثر مرجز کے ایک صنعت نظم کی ایسی بھی ہے جس کو موزوں بغیر قافیہ کہہ سکتے ہیں یعنی فرد اس لئے کہ فرد میں بھی قافیہ کی قید نہیں ہے۔ بلکہ بعض محققین کے نزدیک عدم قافیہ فرد میں مشروط ہے اور جو دو مصرعہ مقفیٰ ہوں انھیں مطلع کہتے ہیں۔ اگرچہ راقم الحروف کے نزدیک فرد میں عدم تقفیہ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ مطلع ایک جزو غزل یا قصیدے کا ہے کوئی مستقل صنف شعر نہیں ہے۔ بہر نوع ایک مجموع فردیات کو نظم بے قافیہ سمجھ لیجئے۔ اس صورت میں ایک خاص تصرف کرنا پڑیگا۔ وہ یہ کہ فرد میں ایک مضمون ایک ہی بیت میں ختم ہو جاتا ہے اور مجموع فردیات میں ایک فرد کے مضمون کو

---

[1] بے تکی نظم واقعی اچھا نام ہے، اسلیے کہ ہندی میں قافیہ کو تک کہتے ہیں۔

دوسری فردوں سے تعلق رہے گا۔ ہمارے ملک میں بھی شاعری کا میلان اسی طرف ہے کہ نظم سے قافیہ کی قید حتی الوسع کم کر دی جائے تاکہ شاعر کو خیالات کی آزادی سے موزوں کرنے کا موقع ہے اور یہ میلان اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنا ترک کیا گیا۔ ذوق کے اُستاد ناصر کا دیوان دیکھیے سرے سے اخیر تک سنگلاخ زمینیں بھری پڑی ہیں، اگرچہ اُس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے مگر کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا سا مضمون ہے۔ خیالات اور جذبات کا لطف نہیں ملتا۔ ہمارے زمانے کے شعراء جن کا کلام مطبوع خاص و عام ہے مثلاً نواب مرزا صاحب داغ دہلوی یا جناب امیر احمد صاحب امیر مینائی یا حکیم ضامن علی صاحب جلال لکھنوی یا اور اساتذۂ حال، ان بزرگوں کے کلام میرے دیکھنے سننے میں آئے ہیں، میں نے سنگلاخ زمینیں نہیں دیکھیں۔ بخلاف اس کے اگلے شعرا میں اُس قسم کی زمینیں کم و بیش سب کے کلام میں پائی جائیں گی۔ اگلے شاعروں میں میر تقی میر ہی سہل اور شگفتہ زمینوں میں شعر کہتے تھے۔

ایک تصرف اور راقم الحروف نے تجویز کیا ہے اگر اُس طرز پر کچھ نظمیں کہی جائیں تو عجب کیا کہ مطبوع ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک بحر پر دو دو مصرعہ تین تین مصرعے یا زیادہ لگائے جائیں۔ اور اس قسم کے ہر ایک قطعہ کو اُن میں سے ایک دَور کہیں اور کم سے کم دو دوروں کے اخیر مصرعے مقفیٰ ہوں یہ کچھ ضرور نہیں کہ ہر دَور میں تعداد مصرعوں کی مساوی ہو بلکہ کم و زیادہ ہو تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اور اس قسم کے بہت سے ادوار کا مجموعہ ایک نظم سمجھی جائے۔

مقصود ان تصرفات سے یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیالات آزادی سے نظم کرنے کی قوت حاصل ہو جب تک ایسا نہ ہوگا شاعری محدود رہے گی۔ پھر قافیہ کی قید بالکل ترک کر دینا یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے پس کوئی نہ کوئی بات ایسی ہونا چاہیئے جس سے دونوں باقی رہیں، یعنی آزادیٔ مضمون اور قافیہ۔

میں نے ذکر کیا ہے کہ شاعری اور مصوری دونوں ایک ہی طرح کی صنعتیں ہیں، یہ قول حکیم ارسطاطالیس کا ہے۔ اچھا اب یہ تصور کیجیے کہ مصور جب کسی شے کی تصویر بناتا ہے وہ کیا کرتا ہے۔

۱۔ ایک صورت عمل کی یہ ہے کہ اُس شے کو نظر کے سامنے رکھ کے اس کے اجزا کے تناسبات کے مطابق ہر تصویر کھینچتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت عمل کی یہ ہے کہ (جبکہ شے جس کی تصویر کھینچنا منظور ہے موجود نہ ہو) کہ تخیلہ میں جو اُس شے کی تصویر موجود ہے سطح تصویر پر اس کی نقل کرتا ہے۔

۱؎ شگفتہ زمین سے یہ مطلب ہے کہ اکثر قوافی غزل کے ردیف کے ساتھ مرتبط ہوں۔

۳- تیسری صورت عمل کی یہ ہے کہ جبکہ ایسی شے کی تصویر بنانا ہو جو نہ خارج میں موجود ہو نہ ذہن
میں تخیل سے بعض اجزا کو بعض کے ساتھ ترکیب دے کے ایک جدید صورت اختراع کرتا ہے۔
مثلاً ایسا شخص جس کے دس سر اور سو ہاتھ اور ہزار پاؤں ہوں۔ یہی تین صورتیں صنعت شعری کی ہیں:
(۱) شے موجود فی الخارج حاضر ہو۔
(۲) شے موجود فی الخارج حاضر نہ ہو بلکہ ذہن میں اُس کی تصویر ہو۔
(۳) شے نہ خارج میں موجود ہو نہ ذہن میں بلکہ ایک جدید صورت اختراع کی جائے۔
ہمارے شعرا کا معمولی یہ طریقہ ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہے۔ ہم قافیہ میں سے مضمون
پیدا کرتے ہیں۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

ہم خارج سے مضامین اخذ کرتے ہیں نہ ذہن سے، ہم کو اس پر قدرت ہی نہیں کہ کسی منظر کو دیکھ کے
بانِ قلم سے اُس کی تصویر کھینچ دیں۔
نظم ایک طرف، نثر میں بھی جہاں تک میں نے خیال کیا ہے یہی نقص پایا جاتا ہے۔ اکثر ناول جو
اس زمانہ میں لکھے گئے اُن سب میں ایک ہی طرح کے منظر ہوتے ہیں، اور وہی ہر پھر کے آتے ہیں جیسے
شہروں میں ایک غریب تھیٹر تھا جسے لوگ مذاق سے چیتھڑا کمپنی کہتے تھے اُس میں چند پردے تھے
اور ہر تماشہ میں وہی پردے بار بار دکھائے جاتے تھے خواہ اُن کا محل ہو یا نہ ہو۔
اکثر تقلید پیشہ ناول نویسوں نے رینالڈ کے ناول انگریزی میں پڑھے ہیں، اُسی کے مضامین جس
قدر یاد رہ گئے ہیں اُس کو اپنے ناولوں میں صرف کرتے ہیں۔ قصہ میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی۔ ہم
نے کسی انگریزی کتاب میں انگلستان کے ناول نویسوں کے پلاٹ (قصہ) کی ایک عام صورت
پڑھی تھی۔ اُس کا ذکر اس موقع پر لطف سے خالی نہیں۔ واقعی ناولوں میں اس کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔
ایک باغ میں ایک خوبصورت نوجوان مس سے ایک صاحب بہادر کا سامنا ہوتا ہے۔
صاحب بہادر ایک جان سے ہزار جان عاشق ہو جاتے ہیں، مس صاحبہ سے اظہار عشق کرتے ہیں اور
شادی کا پیام دیتے ہیں، مس صاحبہ نیم راضی ہیں، صاحب بہادر مفلس ہیں اس لیئے مس صاحبہ کے
والد ماجد قطعی انکار کرتے ہیں۔ دلوں میں محبت رہتی ہے، مس صاحبہ کی شادی ایک اور صاحب سے
ٹھہرتی ہے، یہ دوسرے صاحب بڑے دولتمند ہیں اس لیے مس صاحبہ کے والدین کو یہ شادی منظور ہے
مگر بڈھے اور بدصورت ہیں، اس لیئے مس صاحبہ کو منظور نہیں پہلے صاحب سے پھر ایک باغ میں خفیہ

ملاقات ہوتی ہے۔ پینگ بڑھتے ہیں۔ مس صاحبہ کے والدین مشتبہ ہوجاتے ہیں۔ پہلے صاحب بہادر مس صاحبہ کو بھگانے جانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ دونوں کی ایک رائے ہوجاتی ہے، صاحب ایک سیڑھی لے کے آدھی رات کو مس صاحبہ کے بنگلہ کی کھڑکی کے پاس سیڑھی لگادیتے ہیں۔ مس صاحبہ اُتر کے صاحب بہادر کے ساتھ ہوجاتی ہیں۔ کسی دور دراز ملک میں جاکر شادی ہوجاتی ہے۔ والدین سے ترک ہوجاتی ہے، صاحب بہادر کے باپ مرجاتے ہیں، بہت سی دولت ہاتھ آتی ہے، مس صاحبہ کے والدین سے ملاپ ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ناول نویسوں کے لئے ایسا ہی ایک ڈھانچہ بنادیا جائے تو اسی پر ہزاروں ناول نام بدل بدل کر لکھ لئے جائیں۔

ایک اور خرابی ہمارے ملک کے ناولوں میں پردہ کے اصول کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ عوام عشق اور عاشقی کو ہر قصہ کی جان سمجھتے ہیں، الذت فراق، اور انتظار سب سے عمدہ مضمون خیال کیا جاتا ہو پھر اگر کسی پردہ نشین سے سامنا ہو بھی گیا تو بغیر اس کے کہ اُس کی عصمت پر دھبہ لگے، پیام سلام۔ وعدے وعید۔ فراق۔ انتظار یہ کچھ بھی نہیں ہوسکتا اور جب تک یہ نہ ہو قصہ کا مزا کیا۔ لہذا لازم ہوا کہ ہر قصہ میں ناجائز محبتوں کا تذکرہ ہو اور یہ موجب خرابی اخلاق کا ہے۔ ناول پر کیا موقوف اور قصے بھی اسی طرح کے ہیں۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں زنا بالجبر کے ارتکاب کا مصنف نے خود اعتراف کیا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق نے مثنوی طلسم الفت میں جمع بین الاُختین کو جائز رکھا ہے۔ قدیم مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی بہت مقبول ہے اُس میں بھی پہلے ناجائز طور سے وصال ہوا پھر فراق کے بعد شادی ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ گناہگاریوں کا ذکر قصوں کی جان سمجھی گئی ہے۔ اس سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ ملکی قانون نے فحش الفاظ کے استعمال سے روک دیا ورنہ اور بھی فضاحتیں صرف کی جاتیں۔ اگلے قصوں میں ایسے مضامین بھی ضرور ہی ہوتے تھے۔ کوئی قصہ اس سے پاک نہیں ہے اور اس سب کا سبب کلی یہ ہے کہ فطرت کے ملاحظہ کا ہمارے ملک میں بہت ہی کم شوق ہو جمال اور عظمت کے تصورات سے اذہان قاصر ہیں، نئے مضمون کیونکر نکلیں اور اگر نکلیں بھی تو ردیف اور قافیوں کی قیود کی وجہ سے موزوں نہ ہوسکیں گے۔ اور اگر کوئی موزوں کرے اور بعض تصرفات کو دخل دے تو نشانۂ تیر ملامت ہوگا۔ اعتبار کے دائرہ سے خارج ہوجائے گا۔ اُستادی میں بٹہ لگ جائیگا۔

اس سے پیشتر کسی مراسلہ میں ہم نے مبادی تشبیہ کو بیان کیا ہے۔ اب ہم بعض اقسام تشبیہ کو ایک جدید اصول سے بیان کرتے ہیں

باعتبار غرض کے تشبیہ کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں ۱۔

(۱) وہ تشبیہ جس سے مشبہ کی توضیح مقصود ہو۔

(۲) وہ تشبیہ جس سے کوئی وجدان خاص پیدا کرنا مقصود ہو۔

پہلی غرض علمی ہے یعنی مفید ہے علم کے لئے، دوسری غرض وجدانی ہے جس سے قبض و بسط مطلوب ہو۔

مثلاً پوپ شاعر کے ایک شعر کا یہ مضمون ہے:-

"کہ انسان کی حیات کا جہاز عقل کی رسیوں اور خواہش کی ہوا کے زور پر چلتا ہے"

اس تشبیہ میں یہ لطف ہے کہ جس طرح باد مخالف جہاز کی رسیوں کو توڑ کے جہاز کو درہم برہم کر دیتی ہے یہی حال ہماری خواہشوں کا ہے کہ جب وہ حد اعتدال سے متجاوز ہوتی ہیں تو گویا انسانی حیات کا جہاز طوفانی ہو جاتا ہے، اور انجام اس کا غرق ہے، یا سعدی کا وہ مشہور شعر

رعیت چو بیخ است و سلطاں درخت درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

صائب اور غنی کے اشعار اسی قسم کے ہیں، ان لوگوں نے اکثر ایسے ہی اشعار کہے ہیں

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

اس آخر شعر میں سیل کو ذوی العقول میں سے فرض کر لیا ہے مگر اس قسم کی تشبیہوں میں قوت کم ہوتی ہے اس لیئے کہ بعض صورتوں میں عکس غلط ہو جاتا ہے۔ سعدی کا یہ شعر نہایت ہی عمدہ مثال ہے ؎

نہ محقق بود نہ دانشمند چار پائے بر و کتابے چند

بعض صورتوں میں مشبہ بہ میں کچھ تصرف کر دیتے ہیں مثلاً پوپ شاعر نے علم و معرفت کو شراب سے تشبیہ دی ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایسی ہے جس کے کم پینے سے نشہ ہوتا ہے اور زیادہ پینے سے دماغ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ خلاف واقع ہے مگر شراب کو لفظ معرفت یا حقیقت کے ساتھ بیان کر دینے سے (جیسا کہ شاعر نے کیا بھی ہے) وہ اعتراض مرتفع ہو گیا۔

دوسری قسم وجدانی تشبیہوں کی غرض عقل سے بالکل مغائر ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی مشبہ کا اثر وجدان پر کم پڑتا ہوا معلوم ہو تو اس اثر کو مشبہ بہ کے ذریعہ سے بڑھا دیں مثلاً ارسطاطالیس نے عدالت کو صبح کے ستارہ سے تشبیہ دی ہے۔ واقعی عدالت ایک امر معقول ہے اس کا محض ذکر ایسا کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتا ہے جیسا کہ صبح کے ستارے کی تمثیل سے پڑ سکتا ہے۔

وہ تشبیہیں جن کا اثر وجدان پر پڑتا ہے، اصل اُن کی تصور الم یا لذت کا ہے، الم کا تصور لذت کے تصور سے زیادہ تر موثر ہے۔ اسی لئے حکماء نے اُس افسانہ کو جس کا انجام غم پر ہوتا ہے زیادہ تر مفید اخلاق بیان کیا ہے۔ بہ نسبت اُن افسانوں کے جن کا انجام شادی پر ہے۔

وہ افسانے جس کا انجام غم ہے ٹریجڈی کہلاتے ہیں جس کو شیخ ابو علی سینا نے طراغودیا کہا (دیکھو کتاب شفا جلد منطق زیطور یقیہ (خطابت) اور بو طیقیہ (شعر)۔ وہ افسانے جس کا انجام شادی ہے کمیڈی کہلاتے ہیں، اس کو شیخ نے کمودیا کہا ہے۔ وہ افسانے جن میں ذکر جنگ وجدال کا کیا جاتا ہے ایپک کہلاتے ہیں شیخ ان کو انی کہتا ہے۔

علم نفس میں ثابت ہو چکا ہے کہ واقعی لذت اور الم سے جو اعصاب متاثر ہوتے ہیں وہی اعصاب اُس کے تخیل سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگر چہ واقعی تحریک تخیلی تحریک سے باعتبار قوت کے بہت ہی اخف ہوتی ہے۔ اس درجہ خفت کا تدارک اور طریقوں سے کیا جاتا ہے، تاکہ اثر تا حد امکان زیادہ ہو جائے۔

وجدانی اثر کے پیدا ہونے کے لئے یہ شرطیں ہیں، اول مشبہ بہ اور مشبہ میں بحیثیت تاثیر کے مطابقت ہو اور مشبہ بہ اقوی ہو۔ دوم متبذل نہ ہو۔ سوم ایک حد خاص سے متجاوز نہ ہو۔

پہلی شرط تشبیہ کی ضرورت ذاتی سے پیدا ہوتی ہے۔ بالفرض اگر دو وجدان مغائر مشبہ بہ اور مشبہ سے پیدا ہوں تو ضرورت تشبیہ کی فوت ہو جاتی ہے۔ اگر قوت میں زیادہ نہ ہو تو تخیلی اثر میں بہ نسبت واقعی کے جو کمی ہے اُس کا تدارک نہ ہوگا۔ اگر مشبہ بہ اور مشبہ کی قوتوں میں نسبت مساوات کی ہو تو تشبیہ عقلی ہو جائیگی جس کی غرض محض بیان اور توجیہ ہے نہ تاثیر وجدانی اور اس حالت میں بھی اعرفیت مشبہ بہ کی مشروط ہے۔ اور اگر قوت میں کم ہو تو غرض تشبیہ کلیتہً فوت ہو جائیگی۔

دوسری شرط مابہ الامتیاز ہے درمیان تشبیہ عقلی اور وجدانی کے۔ متبذل سے مقصود وہی تشبیہ ہے جس کی تکرار اکثر ہو چکی ہے۔ جس قدر تکرار زیادہ ہوتی جائیگی غرابت کم ہوتی جائے گی۔ اور اعرفیت بڑھتی جائیگی۔ پس غرابت اور اعرفیت میں نسبت عکسی ہے، غرابت مفید ہے وجدان کے لئے اور اعرفیت مضر ہے۔ برعکس اس کے اعرفیت مفید ہے توجیہ کے لئے نہ صرف غرابت بلکہ لازم اور ملزوم کا بعد بھی تشبیہ وجدانی کے لئے مشروط ہے تاکہ تصادم ملائم کے لئے مفید ہو۔

تصادم طائم اسی حالت میں پیدا ہوگا جبکہ لازم اور ملزوم میں بُعد ہو اور ایک کے ذریعہ سے دوسرے کا علم بعد غور اور فکر کے حاصل ہو سکے۔ لراقمہ

ادا کی شوخیوں سے اُٹھتے اُٹھتے جھک گئیں نظریں   مری قسمت سے اُن کے تیر بھی آئے کماں ہو کر

تیر کے کماں ہو جانے اور عدم تاثیر میں جس قدر غرابت اور بُعد ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ تشبیہ قسم عقلی میں داخل نہیں ہے اس لئے کہ باعتبار اعرفیت کے خود مشبہ زیادہ تر اٰتی ہے "یعنی عدم تاثیر افعال معشوق بالنسبت عاشق" اور مشبہ محض ایک امر اختراعی وہمی ہے جس کے وقوع کو عقل خارج میں تسلیم ہی نہیں کر سکتی۔ پس اثر اس تشبیہ کا محض وجدانی ہے جو غرابت تشبیہ سے پیدا ہوتا ہے۔

تیسری شرط جس کو اعتدال سے تعبیر کرنا چاہیئے، شرائط استحالیہ میں سے ہے مگر از بسکہ عدم اعتدال وجدان کے باب میں اس درجہ مضر ہے کہ غرض اصلی فوت ہو جاتی ہے، اس لئے اس کو بھی شرائط موجبہ ذاتیہ میں سمجھنا چاہیئے مثال عدم اعتدال کی مثلاً معشوق کے ظالم ہونے کی تشبیہ، مثلاً معشوق کو باعتبار ظلم کے قصاب سے تشبیہہ دینا یا مصرعہ مشہور ع

دوسرا دنیا میں اب چنگیز خاں پیدا ہوا

کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جب مشبہ حد اعتدال سے زیادہ اقوی ہو تو اُس کی قوت کو کسی تصرف مناسب کے ذریعہ سے کم کر کے حد اعتدال پر لے آئیں، مثلاً سید انشاء اللہ خاں مرحوم کا یہ مشہور شعر ؎

یہ غضب کا ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں   وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

اس شعر میں عید قرباں کی قید تشبیہ حد اعتدال میں آگئی۔ قصاب اور عید قرباں کے دن ذبح کرنے والا اگرچہ دونوں کے فعل یکساں ہیں مگر باعث ان کے جداگانہ ہیں۔ تشبیہ عقلی سے اثر وجدانی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن تشبیہ عقلی کو وجدانی کے ساتھ ترکیب دینے سے لطف تشبیہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ غالب

چال جیسے کڑی کمان کا تیر   دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی

کڑی کمان کا تیر باعتبار سرعت سیر کے تشبیہ عقلی ہے اور باعتبار قوت تاثیر کے تشبیہ وجدانی ہے اور دلیل اس امر کی کہ قصد شاعر دونوں پہلو سے وجہ شبہ کی لئے ہوئے ہے۔ دوسرا مصرعہ ہے کما ہو ظاہر۔

ترکیب تشبیہ عقلی اور وجدانی کی افصح العرب بعد النبی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا یہ مشہور شعر ہے ؎

جراحات السنان لہا التیام   ولا یلتام ما جرح اللسان

اس شعر میں قرینہ قصد وجدانی کا لفظ جرح ہے۔

استغنا اور دولتمندی

(از جناب ڈپٹی لال صاحب نگم ایم۔ اے دہلوی)

دنیا میں دولتمند کون ہے؟ اس کا جواب صاف الفاظ میں یہی دیا جاسکتا ہے کہ دولتمند وہ شخص ہے جس کے پاس دھن دولت روپیہ پیسہ افراط سے ہو۔ گویا دولتمند ہونیکا معیار روپیہ پیسہ ہوا۔ اب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ روپے پیسے کو کوئی جانتا بھی نہ تھا تو کیا اس زمانہ میں کوئی شخص بھی دولتمند نہ ہوتا ہوگا اور سب لوگ مفلس قلاش ہوتے ہوں گے؟ نہیں اس زمانہ میں بھی لوگ دولتمند تھے۔ دولتمندی صرف روپے پیسے کی افراط کو نہیں کہتے ہیں بلکہ ضروریات زندگی کے علاوہ زائد سامان کی ملکیت کا نام دولتمندی ہے۔ تمدن کے ابتدائی زمانہ میں لوگوں کے پاس بھیڑ بکری گائے بیل، کھیت کیاریاں، مکان ہاٹ حویلی وغیرہ ہوتی تھیں۔ ان کے نزدیک یہی چیزیں دولت تھیں اور جن لوگوں کے پاس ان چیزوں کی بہتات ہوتی تھیں وہی امیر اور دولتمند کہلاتے تھے۔

یہ تو تھا دولتمندی کا وہ خیال جو آجکل عام طور سے دنیا پرست لوگوں کے دلوں میں بسا ہوا ہے۔ اب ہم ایک انوکھی بات بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس جہان میں بہتیرے خدا کے بندے ایسے ہیں جو روپیہ پیسہ نہیں رکھتے لیکن پھر بھی امیر ہیں ان کی جیب میں ہاتھ ڈالو تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ نکلے گی۔ اور شاید ان کے کوٹ میں جیب تک نہ لگی ہو لیکن پھر بھی وہ امیر ہیں یعنی دل کے غنی۔

مالدار وہی ہے جس کا جسم تندرست ہو۔ ہاتھ پاؤں چلتے پھرتے ہوں کسی عضو بدن میں کسی قسم کی خامی نہ ہو، دماغ روشن ہو۔ دراصل اسی کا نام دولتمندی اور امارت ہے۔ کیا ہوا اگر کسی کے پاس کروڑوں روپے بھرے مگر بیمار اور کمزور رہو کر صاحب فراش رہے۔ تندرست ہڈیاں اور ہاتھ پاؤں سونے چاندی اور جائداد سے بہتر بلکہ افضل ہیں۔

اصلی دولتمندی دل کی خوشی میں ہے جو شخص دولت رکھتا ہے مگر خوش نہیں وہ امیر نہیں۔ بلکہ محتاج اور مفلس ہے۔ حقیقت میں دولتمندی اور خوشی کا بیر ہے۔ کیونکہ دولتمند کو ہمیشہ اپنے روپے کی فکر رہتی ہے جس سے اس کی تندرستی اور خوشی میں ضعف آجاتا ہے۔ لیکن اس کی ہوس پر جوانی کا سا

رنگ و روغن چڑھ جاتا ہے وہ دولت جمع کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے اور یہ طمع اس کو بعض اوقات ایسا ذلیل کرتی ہے کہ وہ نہایت ہی مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے۔ الغرض دولتمندی کا انحصار روپے پیسے جاگیر وغیرہ پر نہیں بلکہ انسان کے دل اور خیال سلیم پر ہے۔

میرا دل ایک عظیم الشان سلطنت ہے مجھے اس میں ایسی مسرت حاصل ہے جو دنیا بھر کی نعمتوں اور خوشیوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ پھر میں ہمیشہ اس فکر میں کیوں غلطاں و پیچاں رہوں کہ تھوڑی سی زمین مل جائے۔ جب میں یہ جانتا ہوں کہ تمام دنیا میری ہے تو پھر تھوڑی سی زمین کی خواہش کیا معنی رکھتی ہے۔ جاگیردار اور زمیندار میرے گماشتے ہیں جو میری جائداد کی حفاظت کرتے اور اسکو میرے لئے اچھی حالت میں رکھتے ہیں۔ عجائب خانہ میرا ہے۔ اس میں ہر عجیب چیز میری ہے۔ عجائبات کے فراہم کرنے میں نہ مجھے کوئی دقت اٹھانی پڑی نہ کسی چیز کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ تاہم وہ سب میری ہیں۔ میرا جب جی چاہتا ہے عجائب خانہ میں جاکر ہر چیز دیکھکر خوش ہو لیتا ہوں۔ میں انکو اپنے گھر میں نہیں لانا چاہتا کیونکہ میں ان کی آرائش صفائی اور دیکھ بھال اسقدر نہیں کر سکتا جتنی کہ وہاں ہو رہی ہے۔ باغات مرغزار اور پارک سب میرے ہیں۔ میرا جب جی چاہتا ہے باغ میں جاتا ہوں پھول پتے دیکھکر دل خوش کر لیتا ہوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا لیتا ہوں۔ مجھے پھولوں اور پودوں کی حفاظت کی فکر نہیں۔ اسکی فکر دوسروں کو ہے۔ میں صرف ان سے لطف اندوز ہونیکے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میرے چاروں طرف ایسے لوگوں کا ہجوم ہے جو مجھے خوش کرنیکی غرض سے نئی چیزیں بناتے ہیں۔ اور پھر آپس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نسبت مجھے چیز سستی دے۔

ایک کروڑ پتی لاکھوں روپے خرچ کر کے اپنے گھر میں نگار خانہ بناتا ہے۔ مگر غریب شاعر تصاویر کے اس مجموعہ کو دیکھکر ایک لمحہ میں اس تخیل شاعرانہ میں محو ہو جاتا ہے جو مالک کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہ آئی تھی۔

حرص و ہوا کے بندوں کی لغت میں "بس" کا لفظ ہی ندارد ہے۔ ان کو کتنا ہی روپیہ مل جائے مگر وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہینگے کہ تھوڑا سا روپیہ اور ملے۔ خواہ رات کی نیند اور دن کی بھوک سب کچھ جاتی رہے لیکن روپے کا بھوت ان کے سر ایسا چڑھتا ہے کہ اتارے نہیں اترتا۔ وہ روپے کیلئے عزیز سے عزیز چیز کی قربانی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ روپے کا نہ خود لطف اٹھاتے ہیں نہ کسی محتاج کو دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب سکندر اعظم تمام دنیا فتح کر چکا تو رو کر کہنے لگا کہ "افسوس اب فتح کرنیکے لئے اور کوئی ملک باقی نہ رہا"۔ حرص و ہوا کے غلام ہمیشہ اسی دھن میں رہتے ہیں کہ کہیں کچھ اور مل جائے اور

اس "اور" "اور" کی فکر سے ان کی روح کو ایسی فرحت ملتی ہے کہ وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتے انکی حالت محتاجوں سے زیادہ قابل رحم ہوجاتی ہے حکیم افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں ایک قصہ لکھا ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ جب شہنشاہ یولاؔ کی وفات ہوئی تو دیوتاؤں نے اس سے پوچھا کہ تم اگلے جنم میں کیا بننا چاہتے ہو شہنشاہ نے جواب دیا کہ میں آئندہ جنم میں گمنام شخص بننا چاہتا ہوں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شہنشاہ جو بادی النظر میں بہت ہی خوشحال اور قابل رشک خیال کئے جاسکتے ہیں وہ اس گمنام شخص سے بہتر نہیں ہیں جسکو دنیا میں کسی قسم کی فکر نہ ہو اور جو ہر وقت خوشی اور شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

دنیا میں دولتمند ہونا اچھا ہے لیکن دولت کا سانپ بنتا اچھا نہیں۔ خدا نے روپیہ پیسا اسلئے دیا ہے کہ خود استعمال میں لاؤ اور غیروں کو دیکر ثواب کماؤ۔ اصلی دولتمندی اسی بات میں ہے کہ بیماروں کے لئے اسپتال کھلواؤ یتیموں کے لئے یتیم خانے بنواؤ بیچاری دکھیا بیواؤں کے لئے "ودھوا آشرم" قایم کرو۔ بھوکے ننگوں کو روٹی کپڑا دو۔ اَن پڑھ لوگوں کیلئے مدرسے کھلواؤ۔ اصلی دولتمندی کی شان ان مبارک کاموں سے ظاہر ہوگی۔ یوں قارون کا خزانہ جمع کرکے رکھ جاؤ تو کس کام کا۔ مٹی کا انبار اور ایسا خزانہ یکساں ہے۔ بلکہ مٹی کا انبار ایسے خزانے سے بہتر ہے۔ کیونکہ اول الذکر کی حفاظت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن موخرالذکر کیلئے بڑے اہتمام اور فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

دولت اُن لوگوں کے پیچھے دوڑتی ہے جو اس سے مستغنی ہیں لیکن ان لوگوں کے آگے بھاگتی ہے جو اس کے خواہشمند ہیں۔ حریص لوگ چاہے جتنا مال خزانہ اکٹھا کرلیں وہ اس خزانچی کے مانند ہیں جو امپیریل بنک میں لاکھوں روپے گن ڈالتا ہے۔ اور پھر بھی ہمیشہ روپے کی فکر میں رہتا ہے کہ کہیں غلطی سے زیادہ خرچ نہ ہوجائے۔ حرص و ہوا کے بندے خزانہ کے پہرہ دار ہوتے ہیں خود روپے سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ مال و دولت انسان کو امیر نہیں بنا سکتی۔ بلکہ دل ہے جو انسان کو دولتمند بنا سکتا ہے۔ اگر انسان دل کا غنی ہوگا تو پھر اس کو دولت کی حاجت نہیں۔ اگر انسان میں سیرچشمی نہیں تو چاہے سلطنت مل جائے یا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ جائے پھر بھی وہ غریب ہے۔

کالی داس، غالب، اور تلسی داس اپنے زمانہ کے شہرۂ آفاق شاعر بے بدل گذرے ہیں۔ وہ امیر تھے۔ گو ان کے پاس روپیہ نہ تھا۔ شاعرانہ خیالات کی بلندی اور بلند پروازی ان کے لئے جواہرات اور سونے چاندی کے خزانے سے بڑھکر تھی۔ پھول پتے، گھاس پات، ندی نالے، پہاڑ اور جنگل یہ سب ان کی جاگیر تھی۔ یہی انکی اصلی دولت تھی۔ ان کے اشعار پڑھو، کہیں ان نامور شعرا نے قدرتی

مناظر کا عجیب دلآویز نقشہ کھینچا ہے۔ یہی قدرتی مناظر اور شاعرانہ خیالات دنیا میں اُنکے لئے دولت اور خزانہ مادرہ کا درجہ رکھتے تھے۔ انھوں نے حریص لوگوں کی طرح کبھی دولت کی خواہش نہیں کی۔ اور اگر کبھی مل گئی تو خرچ کرنے میں بھی ذرا تامل نہ کیا۔ روپے کی ان کے دل میں اتنی بھی محبت نہتی جتنی کہ اُڑد پر سفیدی۔ غالب جیسا اہم بالشان شاعر عمر بھر مفلس و فلاکت زدہ رہا۔ لیکن اُس نے اپنے اشعار آبدار سے لوگوں کے خیالات کو مالامال کر دیا کالی داس اور تلسی داس جانتے تھے کہ انسان کو اس خوراک کی اتنی ضرورت نہیں ہے جو اس کے مُنہ کے ذریعے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ ورنہ پھر انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انسانی زندگی کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی غذا کی ضرورت ہے۔ وہ غذا خیالات سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس غذا کے مہیا کرنے والے مشہور و معروف مصنف شعرا اور اعلیٰ درجہ کے اہل خیال ہیں۔ یہ وہ دولت ہے کہ جس سے فقیری میں امیری کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

ساکھی منی گوتم جکروتی راجہ کا بیٹا دولت و دنیا کو ہیچ سمجھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ راج پاٹ کو لات مار جنگل کو سدھارا۔ اس نے راحد ھانی پر صحرانوردی کو ترجیح دی۔ وہ زہد و ریاضت اور اتقاء کو ایک لافانی اور لازوال خزانہ سمجھتا تھا۔ وہ فاقہ کشی کی کلفت کو راحت شمار کرتا تھا۔ وہ اخلاقی اصولوں اور پاکبازی کو انسان کے لئے دولت اور روٹی سے زیادہ ضروری خیال کرتا تھا۔ اُس نے خود فاقہ کشی کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ انسان بھوکا زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن اخلاق سے گرا ہوا انسان زندہ رہتے ہوئے بھی مردوں سے بدتر ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسان کی اخلاقی زندگی اس کے لئے روز افزوں خزانہ ہے انھیں اخلاقی اصولوں پر کاربند رہکر ساکھی منی گوتم نے مہاتما بدھ کا درجہ حاصل کر لیا جنکے سامنے آج کسی مالدار سے مالدار شخص کی بھی کوئی وقعت نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جس شخص کے پاس روپیہ نہیں ہوتا وہ مفلس کہلاتا ہے لیکن جس شخص کے پاس روپے کے علاوہ اور کچھ نہیں وہ اول الذکر شخص سے بھی زیادہ مفلس ہے۔ مالدار شخص وہی ہے جو روپیہ نہ رکھتے ہوئے بھی خوش رہے۔ جو حریص ہے وہ لاکھوں روپے کا مالک ہوتے ہوئے بھی غریب و محتاج ہے۔ دولت کئی قسم کی ہے۔ ایک دولت علمی دولت ہے۔ جو شخص علمی مذاق رکھتا ہے وہ کسی حالت میں بھی مفلس نہیں کہلا سکتا۔ وہ ایک ایسے شغل کا دلدادہ ہے۔ جو اس کو ہمیشہ خوش اور محظوظ کرتا ہے۔ وہ شخص امیر شیر دلاور ہے جو افلاس اور سیاہ بختی کا مقابلہ نہایت مردانگی اور خوشی سے کرتا ہو۔ جس خوش قسمت شخص کا دل استغنا سے معمور ہے وہ معمولی دولت تو کیا چیز ہے اگر ہفت اقلیم کی

بادشاہت بھی ملتی ہو تو بیدریغ لات مار دیتا ہے۔ مگر یہ صفت پرماتما کے خاص مقبول بندوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ جو لوگ دنیائے دنی کی دلفریبیوں کو حقیر سمجھتے ہیں انکا دل دولت سے مستغنی ہے کہتے ہیں کہ دیوجانس کلبی کو راہزنوں نے پکڑ کر غلام کے طور پر بیچ ڈالا تھا۔ اس کے خریداروں نے اسکو آزاد کر دیا۔ اور اپنے گھر کا انتظام اور بچوں کی تعلیم کا کام اس کے سپرد کیا۔ اسکو دولت اور جھوٹی شان و شوکت سے دلی نفرت تھی اور ہمیشہ ایک ٹب میں پڑا رہتا تھا۔ اس کا شہرہ سنکر ایک دن سکندر اعظم اس سے ملنے گیا اور حکیم کو ایسی ذلیل حالت میں رہتے ہوئے بھی خوش دیکھکر متعجب ہوا اور پوچھنے لگا "کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟" حکیم نے جواب دیا۔ "ہاں! مجھے اس بات کی ضرورت ہے کہ تم ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ اور مجھے اس قدرتی نعمت سے محروم نہ کرو جو تم حشر تک مجھے نہیں بخش سکتے"۔ یہ طنز آمیز جواب سنکر سکندر اعظم سُن رہگیا اور بیساختہ اس کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا۔ "اگر میں سکندر نہ ہوتا تو پھر دیوجانس ہونیکی دعا مانگتا"۔

دلیر اور ایماندار آدمی روپے کی خاطر کام نہیں کرتے۔ وہ محبت عزت اور خوش چلنی کیلئے کام کرتے ہیں سقراط جان سے گذر گیا مگر اپنے اخلاقی اصولوں کو نہ چھوڑا وہ لوگوں کو پاکباز اور راست گفتار بنانا چاہتا تھا اور اس عمل کے مقابلہ میں جان کو بالکل بے حقیقت سمجھتا تھا۔ اس نے بلا تامل زہر کا پیالہ پی لیا اور مرتے دم تک لوگوں کو اخلاقی نصائح کرتا رہا۔

مفلس شخص کی پہچان یہ ہے کہ وہ سست ہو کام کرنیکو اسکو جی کبھی نہ چاہتا ہو کام کرنے والا آدمی کبھی مفلس ہو نہیں سکتا۔ روایت ہے کہ الہ آباد میں ایک نہایت ہی مالدار مہاجن تھا اتفاق کی بات دیکھئے کہ کام میں اسکو ایک سال بہت گھاٹا ہوا اور اس غریب کو اپنا دیوالہ نکالنا پڑا۔ جب شام کو گھر آیا تو بہت افسردہ خاطر تھا اور نہایت مایوسانہ لہجے میں اپنے شریف بیوی سے بولا "میری پیاری میں بالکل برباد ہو گیا ہوں جو دھن دولت میرے پاس تھا وہ سب اب قرضخواہوں کا مال ہے"۔ بیوی ذرا سے سکوت کے بعد بولی کیا قرضخواہ تمہیں بھی بیچ ڈالینگے؟ خاوند نے جواب دیا "نہیں!" پھر عقلمند بیوی نے پوچھا "کیا قرضخواہ مجھے بیچ ڈالیں گے؟" خاوند نے کہا "نہیں! تم کیسی باتیں کرتی ہو؟" بیوی نے کہا تو پھر یہ باتیں نہ کہو کہ میں بالکل برباد ہو گیا ہوں۔ روپے پیسے کے چلے جانے پر اتنی مایوسی کی کیا ضرورت ہے روپیہ پیسہ ہمارے ہاتھ پاؤں کا میل ہے۔ اگر ہم سلامت ہیں تو پھر وہی روپیہ پیسہ ہو سکتا ہے۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج میرے پاس تو کل اس کے پاس۔ اس کے ملنے پر نہ خوشی ہونا چاہئے اور نہ اسکے جانے پر کچھ رنج کرنا مناسب ہے اگر ہم محنت کرینگے تو دوبارہ گئی ہوئی دولت واپس آسکتی ہے

مثنوی دریائے عشق

(از مسٹر صغیر احمد جان بی۔ اے)

خدائے سخن میرؔ نے بہ اعتبار فن شعر و شاعری کی کوئی صنف ایسی نہیں چھوڑی جسمیں طبع آزمائی نہ کی ہو، قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، قطعہ، رباعی وغیرہ سبھی کچھ لکھا مگر قصیدہ انکی افتاد طبیعت کے خلاف تھا وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کہاں سے لاتے کہ قصیدہ کو قصیدہ بنا دیتے۔ مرثیہ کو انھوں نے کبھی نظر استحسان سے دیکھا ہی نہیں۔ محض مذہبی فریضہ سمجھکر جو کچھ بن سکا لکھ لیا۔ اسی لئے ان کے مرثیوں میں مائی کاوش اور فنی خوش اسلوبیاں نظر نہیں آتیں۔ سوداؔ نے انکے مرثیہ اور ایک سلام پر تنقید نظم کی ہے جو کلیات سوداؔ میں موجود ہے۔ اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں میرؔ کا مرثیہ شاعرانہ حیثیت سے کس قدر پست ہے۔

واسوخت کے موجد اردو میں بقول آزاد میرؔ ہی ہوئے قطعہ، رباعی وغیرہ بھی کلیات میں موجود ہیں اور خوب ہیں۔ لیکن غزل اور مثنوی یہ دو صنفیں ایسی ہیں جن میں میرؔ کی شاعری بے پناہ نظر آتی ہے۔ اہل تحقیق نے المیہ و حزنیہ انداز بیان کو غزل اور مثنوی کا لوازمہ بتایا ہے۔ اور یہ انداز بیان تا وقتیکہ دل میں درد کی ٹیس نہ ہو پیدا ہونا محال ہے، میرؔ کی پُر سوز اور دردناک طبیعت کے متعلق کچھ لکھنا عبث ہے اس پر زبان کی سلاست و فصاحت، انداز بیان کا جوش و صداقت سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ غرض غزل کے میدان میں انکا مرتبہ اسقدر بلند ہے کہ آج تک تمام اردو شعرا ان کے آگے شاگردی کا زانو تہ کرتے ہیں، اور زبان اعتقاد سے کہتے ہیں۔ ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں، یا اپنی کاوشوں و دماغ سوزیوں کی ناکامی پر یوں نوحہ کرتے ہیں ع؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میرؔ نے متعدد مثنویاں لکھیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ میں یہاں صرف عشقیہ مثنویوں کے نام گنواتا ہوں۔ شعلۂ عشق، دریائے عشق، جوش عشق، اعجاز عشق، معاملات عشق، اور خواب و خیال۔

ان مثنویوں میں شعلۂ عشق اور دریائے عشق کو چھوڑ کر باقی تمام مثنویاں کچھ زیادہ بلند پایہ نہیں ہیں۔ لیکن یہی دو مثنویاں میر کا مرتبہ بہ حیثیت مثنوی گو بہت بلند کر دیتی ہیں۔

میر کی عشقیہ مثنویاں سب کی سب حزنیہ (Tragic) ہیں۔ جہاں ایک طرف میر کی حرماں نصیبی اور حسرت کوشی پر روشنی پڑتی ہے وہاں دوسری طرف ان کا فلسفۂ زندگی بھی اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔ بچپن ہی سے انھیں بے ثباتی دنیا کی تعلیم دی گئی تھی۔ جس کا اثر آخر دم تک ان کا رفیق حیات رہا۔ خوشدلی انکی راہ سے کوسوں دور تھی بوالہوسیوں پر نظر نہ رکھتے تھے شادکامی سے انھیں غرض نہ تھی قیس فرہاد کے قصے پیش نظر تھے، عشق صادق کے دلدادہ تھے یہی وجوہات ہیں کہ عین جوش بہار میں بھی انھیں بلبل کی سی سرمستی اور از خود رفتگی نہیں سوجھتی وہ بہار کے رنگین پردوں پر خزاں کی بھیانک صورت اور خوفناک مورت دیکھتے ہیں۔ پھر ان کی شاعری کیوں نہ پر سوز ہو۔ اور ان کی مثنویاں کیوں نہ حزنیہ ہوں۔

میر کی مثنویوں کو عام طور پر کوئی شہرت نصیب نہ ہوئی۔ اسکی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول تو یہ مثنویاں منفرد طور پر ایسی نہیں ہیں کہ علٰحدہ علٰحدہ شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں تک پہنچتیں، ڈھائی ڈھائی سو تین تین سو اشعار کی مثنویاں ہیں اور کلیات ہی کے ایک گوشہ میں پڑی ہیں دوسرے یہ تمام مثنویاں حزنیہ ہیں اور یہ بات عام طور پر ہندوستانیوں کی افتاد طبیعت کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس قدر افسانہ جات اور مثنویاں ہمیں دستیاب ہوتی ہیں وہ یا تو نری طربیہ (Comic) ہیں یا مخلوط، یعنی حزنیہ و طربیہ (Trago-Comic) غرض انکا انجام طربیہ ہی ہوتا ہے۔ ابتک عوام حزنیہ ڈرامہ یا مثنوی کو پسند نہیں کرتے۔

اردو کی مشہور و معروف مثنوی سحرالبیان کی خصوصیت تفصیل اور منظر نگاری ہے، ورنہ واقعات کردار کم و بیش سب مافوق العادت ہیں۔ اگرچہ جزئیات تمام مطابق فطرت ہیں مگر کلی طور پر جو اثر دل پر ہوتا ہے وہ مافوق العادت ہی ہوتا ہے، وہ واقعات اور حادثات جو تمام قصے کی روح رواں ہیں سب اتفاقیہ ہیں انسانی فطرت اور انسانی کوشش وسعی کو ان میں کچھ دخل نہیں۔

مثنوی دریائے عشق کئی حیثیتوں سے حزنیہ ڈرامہ سے ایسی ملتی جلتی ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے خزانے ڈرامہ سے یکسر خالی نہ تھے،

حزنیہ ڈرامہ کی خوبیاں بلکہ اصول جو بیان کئے گئے ہیں قصے کا منفرد ہونا۔ قصے کی تدریجی ترقی یعنی اس میں گوناگوں واقعات کے الجھاوے نہیں ہونا چاہئے۔ ان واقعات کا فطرت کے قریب ترین ہونا جن سے قصہ ترقی پاکر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ کردار نویسی کی وضاحت اور صداقت، واقعات و جذبات کی مصوری طرز ادا، اور بیان کی ندرت وغیرہ۔ انھیں اصولوں کی روشنی میں بالا دریائے عشق پر نظر تنقید ڈالی

جاتی ہے، مثنوی کے شروع میں بتیس اشعار حضرت عشق کی شان میں ہیں۔ جن میں انکی نیرنگ سازیاں اور طرفہ کاریاں بیان کی گئی ہیں۔

کشش اسکی ہے ایک اعجوبہ	ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محروم وصل یاں سے گیا	کہ نہ یار اسکا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکا ہے	ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے
جسکو ہو اس کی التفات نصیب	وہ ہی مہمان چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے	کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

یہ اشعار بطور صنعت براعت الاستہلال لکھے گئے ہیں، اور تمام قصے کا لب لباب پیش کرتے ہیں۔

پہلے مغربی ڈرامہ کا یہ قاعدہ تھا کہ ڈرامہ نویس شروع میں کسی شخص کی زبانی کل قصے کو مختصراً ادا کرتا تھا۔ تاکہ حاضرین کو ڈرامے کے سمجھنے میں دقت نہ واقع ہو۔ اس تقریر کو انگریزی میں پرولوگ PROLOGUE کہتے ہیں۔ اب پرولوگ کا دستور نہیں رہا لیکن بڑی بڑی کمپنیوں میں تماشہ کے قبل تمام ڈرامہ کا لب لباب چھپا ہوا حاضرین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ ترقی مفید ثابت ہوئی یا غیر مفید، صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ قصے کا ماحصل بتا دینے کا پہلے بھی دستور تھا اور اب بھی ہے،

مثنوی دریائے عشق کے یہ بتیس شعر اچھے خاصے پرولوگ کا کام دے سکتے ہیں۔ میر نے ہر ایک عشقیہ مثنوی میں اس قسم کے اشعار نہایت اہتمام کے ساتھ لگائے ہیں۔ اور ان اشعار کی علت غائی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ قارئین پر خوب اچھی طرح واضح ہو جائے کہ وہ اب آگے کیا پڑھنے والے ہیں اور شروع ہی سے ان کے دل و دماغ پر حزنیہ انجام کے لئے اثرات قائم ہو جائیں۔

یہ طریقہ کچھ میر کی ایجاد نہ تھا پرانی مثنویوں میں بھی پرولوگ ساقی نامہ کے طور پر لکھا جاتا تھا اور اس میں بھی قصے یا اس کے کسی خاص حصے کے انجام کے اثرات قائم کر دئے جاتے تھے،

اس تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے:۔

ایک جوان عنالالہ رخسار و سرو بالا نے کسی غرفے میں ایک مہ پارہ کے جمال پر شرر کو دیکھکر بیک نظر دل اور ہوش و حواس حضرت عشق کی نذر کئے اور مجنوں صفت اس رشک لیلی کے کوچے کی گرد اپنے سر پر ڈالنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس مہ پارہ کے اعزا کو خبر ہوئی انھوں نے بپاس ننگ و ناموس لڑکی کو اس کی دایہ کے ہمراہ نینس میں بٹھا کر دریا پار کسی دوست کے یہاں بھیجا۔ یہ مجنوں بھی آہیں بھرتا پیچھے پیچھے روانہ ہوا جب دریا پر پہنچا تو محبوب اور دایہ کو کشتی میں سوار ہوتے دیکھکر اپنی بے کسی

اور محبوب کی دوری پر فریاد و فغاں شروع کی۔ دایہ نے بکمال حیلہ سازی اس بیخود عاشق کو بھی "سفینے"
میں سوار کر لیا اور عین منجدھار میں پہونچ کر اس پرفن نے محبوب کی کفش پا عاشق کو دکھا کر دریا میں
پھینک دی۔ اور کہا حیف ہے اس عشق پر محبوب کی کفش امواج تلاطم سے ہم آغوش ہو اور تو سفینے
میں بیٹھا دیکھا کرے۔ اسے بھلا اتنی تاب کہاں، فوراً دریا میں کود ا۔ امواج زنجیر پا ہو گئیں۔ اور قعر دریا
کی طرف کشاں کشاں لے گئیں۔

ایک ہفتہ کے بعد اس محبوب نے دایہ سے کہا کہ وہ فرو مایہ تو اب غرق ہو گیا اور وہ ننگ زمین
سے جا تا رہا میں یہاں بہت پریشان ہوں اب چاہئے کہ گھر واپس چلیں۔ دایہ رضامند ہوئی اور دونوں
سوار ہو کر روانہ ہوئے جب دریا پر پہنچے تو اس محبوب نے دایہ سے کہا کہ جہاں وہ آرزومند ڈوبا
تھا وہ جگہ مجھے بھی دکھا تا کہ میں بھی موجۂ و گرداب کی سیر کر لوں دایہ اصل مطلب نہ سمجھی اور وہ جگہ
دکھادی کہ یہاں وہ کودا تھا محبوب فوراً اسی جگہ کود گئی اور آن واحد میں نظروں سے غائب ہو گئی۔

یہ صرف ایک مفرد قصہ ہے اس قصے کو ضمنی قصوں کی آمیزش سے گنجلک نہیں کیا گیا ہے اس کے علاوہ
قصہ بتدریج ترقی کرتا گیا ہے اور ترقی کی ہر منزل پر حزنیہ نے بھی آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔ غیر متعلق واقعات
اور اتفاقی حادثات سے ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کی گئی ہے وہ واقعات جن سے حزنیہ آغاز ہوتا
ہے اور وہ واقعات جن پر حزنیہ ختم ہو جاتا ہے محض اتفاقی نہیں ہیں ان میں کسی قسم کا ما فوق العادت عنصر
نہیں پایا جاتا۔ بلکہ واقعات انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور آئے دن معمولی زندگی میں مشاہدہ میں آتے
رہتے ہیں۔

اس مثنوی کی دوسری نمایاں خصوصیت جو اس کو ڈرامہ کے قریب تر کر دیتی ہے اسکی کردار نویسی ہے
اشخاص جس قدر کم ہیں اسی قدر ان کی جزئیات سے قطع نظر کی گئی ہے۔ مکالمہ اور دیگر ذرائع سے ان کی مکمل
شخصیتوں سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ صرف انہیں اشخاص کو ابھارا گیا ہے جنکا تعلق براہ راست ہے۔

ہیرو۔ صورت شکل :- (ایک جا) اک جوان رعنا تھا ۔۔۔ لالہ رخسار و سرو بالا تھا

اسکی فطرت :- عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم ۔۔۔ دل تو رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اسکو صورت خوش سے ۔۔۔ انس رکھتا تھا وضع دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن ۔۔۔ رہ نہ سکتا تھا بغیر صورت بن

سر میں تھا شوق۔ شوق دلمیں تھا ۔۔۔ عشق ہی اسکے آب و گل میں تھا

اس کا عشق صادق ہے اور اس راہ میں وہ اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتا معشوق کی کفش پا کو دریا میں

گزرتے ہوئے دیکھ چکا ہے۔ دایہ کے تیز و تند وحشت الفاظ سُن چکا ہے۔ اب تاب کہاں کہ سفینے میں گرداب بلا سے محفوظ بیٹھا رہے اور کشش یار موجوں کے تھپیڑے سہے۔

بے خبر کار عشق کی تہ سے — جست کی ان نے اپنی جاگہ سے
نتیجہ۔ تھا سفینے میں پاکر دریا میں — موج زنجیر ہو گئی پا میں
کھچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب — تھی کشش عشق کی مگر تو آب
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں — ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں

ہیروئن۔ ہیروئن کا تعارف ہم سے پہلے نہیں کرایا گیا۔ لیکن ہیرو سے اسے بھی عشق ہے اور بے بھی صادق۔

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ — ہوگیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ دریاں سے گیا — آرزومند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد — ساتھ اسکے گئے وہ شور و فساد
شور و فتنے تھے اس تلک سارے — اب تو بدنامیاں نہیں بارے

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دل کو دل سے راہ تھی۔ انداز بیاں سے جو حسرت ٹپکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ دریائے عشق اسکو اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ آ تیرے لئے آغوش عافیت وا ہے۔

دل تڑپتا ہے متصل میرا — مرغ بسمل ہے نالۂ دل میرا
وحشت طبع اب تو افزوں ہے — حال جی کا مرے دگرگوں ہے
بے دماغی کمال ہوتی ہے — جان تن کی وبال ہوتی ہے
دل کوئی دم میں خون ہووے گا — آج کل میں جنون ہووے گا
بیکلی جی کو تاب دیتی ہے — طاقت دل جواب دیتی ہے
مصلحت ہے کہ مجھکو لے چل گھر — ایک دو دم رہینگے دریا پر

دریا پر پہنچ کر اضطراب شوق نے ایک حشر برپا کر دیا ہے دایہ سے بے صبری کے عالم میں رہ رہ کر سوال کرتی ہے

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش — تھا کدھر سے کس طرف بیہوش
تجھکو آیا نظر کہاں آکر — پھر جو ڈوبا تو کس طرف جاکر
مجھکو دیجو نشان اس جا کا — میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں ناآشنائے سیر آب — ناشناسائے موجہ و گرداب

تجھ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں   گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور   اتفاقی ہیں اس طرح کے امور

ان اشعار سے علاوہ جوشِ اضطراب کے ہیروئن کی عقل و فراست پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح اظہارِ شوق کرتے کرتے "ہوں میں نا آشنائے سیرِ آب۔ نا شناسائے موجۂ و گرداب" کہکر بات کو ٹال دیتی ہے۔ بلکہ دایہ کو جو کہ "استادِ کار حیلہ و فن" ہے کسی طرح کا شبہ نہ ہو جائے۔ لیکن جب اس ناشکیب عشق کو یہ بتایا جاتا ہے کہ :-

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف   یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کی مانند   پھر نہ تھا کچھ سراب کی مانند

تو اس طرح تکمیلِ عشق ہوتی ہے اور اس طرح حرماں نصیب عاشقوں کا وصال ہوتا ہے :-

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکے   گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کرکے
موج ہر اک کمندِ شوق تھی آہ   لپٹی اس کو برنگ مارِ سیاہ

تیسری اہم شخصیت دایہ کی ہے اور یہی شخصیت قصہ میں حزنیہ انجام کا موجب ہے ہیروجب محبوبہ کو کشتی میں سوار ہوتے دیکھتا ہے اور خود کو بیکس اور بے یار و مددگار پاتا ہے تو مصروفِ آہ و بکا ہوتا ہے۔ یہ گریہ و زاری دایہ کے گوش زد ہوتی ہے۔

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن   تھی وہ استادِ کار حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلی کی   وعدۂ وصل سے تشفی دی
کا ے ستم دیدۂ غمِ دوری   ہو چکا اب زمانِ مہجوری
زار نالے نہ کر شکیبا ہو   عشق کا راز تا نہ افشا ہو
دیکر اس کو فریب ساتھ لیا   دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
لیک در پردہ اس نے یہ ٹھانی   کیجیے اس سے خصمی جانی

اور عین منجدھار میں پہونچکر اپنے حیلہ اور فریب کو بروئے کار لاتی ہے۔

بیچ دریا کے دایہ نے جاکر   کفش اس گل کی اسکو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اکبار   اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیری نگار کی پاپوش   موجِ دریا سے ہوئے ہم آغوش

صرف اسی قدر نہیں بلکہ عاشقِ صادق کو طعن و تشنیع سے موئے پر سو درے لگاتی ہے

اور آتش عشق پر پٹرول چھڑکتی ہے۔

یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو　　مفت ناموس عشق کو مت کھو
تھی اگر تھا عزیزاسے ناکام　　کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

گو دایہ استادکار حیلہ وفن ہے۔ لیکن ہر فرعونے راموسے، آخر عورت ذات ہے خود بھی دھوکا کھاجاتی ہے، ہیروئن کی بیقراری اور جگر تابی کی گفتگو سنکر:۔

یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق　　گھات میں اپنے لگ رہا ہے عشق

اور گھر واپس چلنے کا عزم کرلیتی ہے اجب ہیروئن اس سے دریافت کرتی ہے کہ:۔

یاں گرا تھا کہاں وہ گم مایہ

تو:۔　کر میں گرچہ دایہ تھی کامل　　لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق　　ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق

اس کے بعد ہیروئن کے اعزا کا کردار ہے۔ یہ زیادہ نمایاں نہیں۔ لیکن جس قدر ہونا ضروری تھا اتنا ہے اور بالکل فطری ہے شریفوں کو اسی طرح اپنے ننگ وناموس کا خیال ہوتا ہے جب راز عشق فاش ہوجاتا ہے تو وہ قصد کرتے ہیں:۔

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے　　درپئے دشمنی جان ہوئے
مشورت تھی کہ ماریں ڈالیں　　وفتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھیری کہ ہونگے ہم بدنام　　سنکے آخر کہیں گے خاص وعام
کیا گناہ تھا کہ یہ جواں مارا　　کن نے مارا اسے کہاں مارا

حزنیہ ڈرامہ کے لئے طرز ادا کی متانت اور سنجیدگی لب ولہجہ میں جوش اور سیاق کلام کا پُردرد ہونا خاص طور پر ضروری ہیں۔ اور یہ سب باتیں اس مثنوی میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ اوّل کے تیس اشعار جو حضرت عشق کی شان میں ہیں اور بطور پرولوگ لکھے گئے ہیں انہیں سے حزنیہ اثر دلوں پر قائم ہوجاتا ہے۔ عشق کی تعریف میں فلسفیانہ قافیہ پیمائی اور صوفیانہ نغمہ سرائی نہیں کی گئی ہے بلکہ واقعات کا اظہار نہایت متانت اور پرجوش صداقت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خود شاعر پر گذر چکا ہے۔ اور صورت حال کی ترجمانی پُردرد طریقہ سے کی جارہی ہے۔

اشعار ذیل میں کلام کی متانت اور طرز ادا کا سوز وگداز ملاحظہ ہو:۔

دل میں جاکر کہیں تو درد ہوا　　کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

گہ نمک اس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا

کہیں باعث ہر دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا

ہے کہیں دل جگر کی بیتابی — تھا کسی مضطرب کی بیخوابی

ایک دل سے اٹھے ہی ہو کر دود — ایک لب پر سخن ہے خوں آلود

کہیں بیٹھے ہے دل میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

کہیں شیون ہے اہل ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا

آرزو و تمنا امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی

دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا — شوق نے کام کو خراب کیا

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات — ایک میں اور کتنے تصدیعات

جس سے جی کو کمال ہو الفت — جس سے دل کی درست ہو نسبت

خلش اسکی پلک کو گر واں ہو — دل میں یاں کاوشِ نمایاں ہو

واں اگر ہو شکست کا سو باب — یاں رگِ جاں کو ہووے پیچ و تاب

واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار — دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار

یار کو درد چشم گر ہووے — چشم عاشق لہو میں تر ہووے

چاک داماں میں واں پئے زینت — یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت

واں دہن تنگ یاں ہے دل تنگی — حسن اور عشق میں ہے یکرنگی

واقعہ نگاری اور مصوری، مثنوی کے لوازمات سے مانے جاتے ہیں اور واقعہ بھی یونہی ہے کہ مثنوی کیلئے واقعہ نگاری اور مصوری لازمی چیز ہیں۔ ان کے بغیر مثنوی، مثنوی کے درجہ سے گر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے مثنوی سحر البیان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن مصوری واقعات اور مصوری جذبات کے لحاظ سے دریائے عشق کا پایہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نیچرل مصوری کے ساتھ بیان کی صفائی نے اس میں اور بھی لطافت پیدا کر دی ہے۔ بے ساختگی سے حیرت انگیز زور پیدا ہو گیا ہے۔

ہیرو یک نظر ہیروئن پر عاشق ہوتا ہے اسکی تصویر ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی — تاب وطاقت نے بیوفائی کی

ہیروئن جب غرفے سے غائب ہوجاتی ہے تو عاشق صادق کی بیقراری ملاحظہ ہو :-

وہ گئی اس کے سر بلا آئی — خاک میں مل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا تپیدن ناز — رنگ چہرہ کا کر گیا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک — چاک کے پہلے پاؤں داماں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا — اشک نے رنگ خوں کیا پیدا
سوزش دل نے جی میں جا لی کی — داغ نے اک جگر کو آتش دی
بستر خاک پر گرا وہ زار — درد کا گھر ہوا دل بیمار
خلق اس کی ہوئی تماشائی — پر جو وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے — رو دیا اس نے ایک حسرت سے

ہیروئن نے دایہ سے یہ دریافت کیا کہ وہ ناکام عاشق کہاں ڈوبا تھا دایہ بتاتی ہے :-

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

وہ اس جگہ پہونچکر سفینے سے کود پڑتی ہے۔ اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے :-

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کے — گر پڑی قصد ترک جاں کر کے

واقعہ نگاری اور مصوری میں عام طور پر مادی اشیا کا نقشہ کھینچا جاتا ہے مگر نفس انسانی اور اسکے مخفی اور نازک جذبات کی مصوری اس سے بہت زیادہ دشوار ہے اسمیں ایک خاص قسم کی لطافت اور نزاکت ہوتی ہے جس کے اظہار سے مصور کا موقلم عاجز ہے یہ صرف ایک باریک بین اور قادر الکلام شاعر ہی کا کام ہے کہ ان غیر مادی اور غیر مرئی جذبات و حسیات کے مرقعے نہایت صداقت اور لطافت کیساتھ پیش کرتا ہے خصوصاً میر کی جذبات نگاری اور کیفیات بمروہ کی مصوری بہت نازک اور لطیف ہے مثلاً عاشق کی یاس و حسرت کی تصویر ملاحظہ ہو :-

نام کو بھی تیرے نہ جانا آہ — تجھسے کیونکر سخن کی نکلے راہ
ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ — دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ
کوئی مشفق نہیں کہ ہو وے شفیق — بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق
آہ جو ہمدمی سے کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

ہیروئن کے مخفی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ — ہو گیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ تنگ دسیاں سے گیا — آرزو مند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد — ساتھ اسکے گئے وہ شور و فساد

شور فتنے تھے اس تلک سارے اب تو بدنامیاں نہیں بارے

یا مثلاً ہیروئن کے دریا میں کودتے کو اس طرح دکھایا ہے۔

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکے گر پڑی قصد ترک جاں کرکے

لفظ "کہاں کہاں" میں جذبات اور اضطراب شوق کا ایک سمندر ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ ہزار بار پڑھئے ہر بار ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔

جوش بیان اور بیساختگی تو میر کی غزلیات اور مثنویات کا خاص جوہر ہیں۔ ان خصوصیات کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہر شعر جوش بیان، بے ساختگی اور آمد کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے مزید اں زبان میں وہ صفائی اور روانی ہے کہ باید و شاید، آج سے سوا سو برس پہلے کی زبان ہے۔ اور سوائے چند متروک الفاظ اور محاورات کے آج ہی کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ آج اگر کوئی شاعر اس بے تکلفی اور صفائی سے دس شعر بھی موزوں کرے تو میر کی زبان انکی شاعری اور انکی قادر الکلامی کی حقیقت معلوم ہو۔

مثنوی سحر البیان میں جس چیز کی فراوانی ہے دریائے عشق میں اسی چیز کا فقدان ہے یعنی اس میں منظر نگاری نہیں ہے اور جو کچھ ہے بھی تو وہ مرتبہ میں بہت کم ہے اول تو دریائے عشق میں ایسے مواقع ہی بہت کم ہیں جہاں منظر نگاری سے کام لیا جاتا۔ اور جہاں کہیں ایسا موقع نکل بھی سکتا تھا اسکو باحسن وجوہ نظر انداز کیا ہے۔ البتہ ایک موقع پر دریا ایسا حائل ہوتا ہے کہ منظر نگاری کرنی ہی پڑتی ہے۔

آب کیا تھا کہ بحر تھا ذخار تند و مواج و تیرہ و تہ دار

موج کا ہر کنارہ طوفاں پر مارے چشمک حباب عماں پر

ہمکنار بلا ہر اک گرداب لجۂ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

گذر موج جب نہ تب دیکھا ساحل اسکا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

اشعار زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ "مانو یا نہ مانو ہمیں جس نے لکھا ہے اس نے کبھی دریا دیکھا ہی نہیں۔ گوشۂ عزلت میں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتا رہا ہے ورنہ دریا میں تو وہ وہ لطافتیں، وہ دلفریبیاں، وہ وہ جوش و خروش ہوتے ہیں کہ زور قلم ختم ہو جائے۔ اور دریا زور و شور کم نہ ہو" آخری شعر کہتا ہے۔" واہ! تشبیہ کا حق ادا ہو گیا۔ اس سے بڑھکر نادر اور لطیف تشبیہ کوئی کہاں سے پیدا کرے گا۔ مگر "کشتی اک آن کر ہوئی موجود" بھلا کہاں سے؟ لایا کون؟ اگر ان جزئیات کو بھی باندھا ہوتا تو کلام میں کسی قدر صداقت اور جوش پیدا ہو جاتا"۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔ یہ بات ازل سے میر حسن ہی کے حصے میں آئی تھی۔ میر دنیائے دل کے بادشاہ ہیں۔ جذبات اور احساسات پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ کیا جانیں باغ و راغ۔ رزم و بزم، کوہ و دشت، خشکی و تری کسے کہتے ہیں۔

چاہ کن را چاہ در پیش

(از جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی)

(۱)

سر داؤد، خوبصورت لائبریری میں سر جھکائے متفکر و متردد بیٹھے ہیں۔ برقی روشنی وجیہہ و مغرور چہرے کی معنی خیز وحشت اور زبردستی پھیل جانیوالی زردی کو نمایاں کر رہی ہے۔ میز پر کھلا ہوا خط رکھا ہے، متحیر نگاہیں نامعلوم کشش کے ماتحت عبارت تر جم کر رہ گئی ہیں۔

یہ خط صبح کی ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ اس گھڑی سے یہ وقت ہوا کہ دو چار نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں بار پڑھا جا چکا ہے لیکن سیری نہیں ہوتی۔ قیامت یہ ہے کہ ہر دفعہ کا مطالعہ، کچھ نہ کچھ دلی انکار میں اضافہ کر دیتا ہے اور وہ میز پر ہاتھوں کی دونوں کہنیاں ٹیک اور ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھکر کسی گہرے سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ حولق آنکھوں سے دلی انتشار ٹپکنے لگتا ہے۔

اس حالت میں بھی کم و بیش ایک گھنٹہ گذر گیا۔ یکایک خشک لبوں کو حرکت ہوئی، بھرائی ہوئی پُرخوف آواز نے لائبریری کی ساکت فضا میں ہلکا سا تموج پیدا کر دیا۔ سر داؤد نے خط کی عبارت کو زیر لب دوہرایا۔

"سر داؤد! معلوم ہوا ہے کہ تم نے بظاہر سوداگری کے ذریعہ لکھوکھا روپیہ فراہم کیا ہے۔ تم تنہا ہو تمہاری کثیر دولت کا کوئی وارث نہیں تاہم طمع زر دامن نہیں چھوڑتی اور تم دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹورنے میں جائز و ناجائز تدبیر کی پرواہ نہیں کرتے۔ محض اس نقطۂ نظر سے فیصلہ کیا ہے کہ ضروری مصارف پورا کرنیکے واسطے تمہاری کمائی سے استفادہ کیا جائے۔ لہٰذا اس یادداشت کے ذریعہ ہدایت کیجاتی ہے کہ ۱۱ بجے شب کو لائبریری کی عقبی کھڑکی کھلی رکھکر انتظار کیا جائے۔ میں موعودہ وقت پر آکر سر دست ایک ہزار گنی کا مطالبہ کروں گا۔ اگر یہ رقم خاموشی اور انسانیت سے حوالے نہ کی گئی تو ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے پولیس میں تمہارے مجرمانہ افعال کا پردہ فاش کر دیا جائیگا۔ پھر جو ہوگا تم اس سے بے خبر نہیں ہو۔"

"راقم کا نام تمہاری لوح قلب پر مرتسم ہے"

اس دھمکی نے سر داؤد کی نگاہوں کے سامنے قید فرنگ کا ہولناک مرقع پیش کر دیا۔ دل میں طرح طرح کے

وسوسے گھر کرنے لگے اور وہ پھر غور میں آ گئے ماتھے پر سوئی ہوئی شکنیں رونما ہوئیں مرجھائی صورت گرگٹ
کی طرح جلد جلد رنگ بدلنے لگی۔ پھٹی پھٹی آنکھیں امید و بیم کی آماجگاہ بنکر رہ گئیں۔

دیوار میں لگے ہوئے کلاک نے پہلے ساڑھے نو ——— دس، پھر ساڑھے دس کا ادھا بجا دیا۔ دفعتہً
سر داؤد کے افسردہ چہرے پر شگفتگی کی لہر دوڑ گئی۔ کسی فوری خیال کے ماتحت دونوں آنکھیں چمکنے لگیں کرسی
پر بیٹھا نہ گیا۔ دلی منصوبے کو عملی تشکیل دینے کیواسطے اُٹھے دوسرے کمرے سے لیبل لگی ہوئی چھوٹی سی شیشی
نکال لائے جس میں ہلکے سنہرے رنگ کا عرق بھرا تھا۔ مرمریں میز پر وہسکی کی بوتل، شیشہ کا گلاس، برف کا
ظرف اور سوڈے کی دو بوتلیں رکھی تھیں۔ سر داؤد بالمرہ شب کو ان چیزوں سے سرور کیف حاصل کرتے تھے
لیکن آج معمول کے خلاف تفکرات نے اس جانب متوجہ ہونیکا موقعہ نہ دیا تھا۔ اب کرسی پر بیٹھکر اطمینان
کی سانس لیتے ہوئے وہسکی اُنڈیل کر سوڈا ملایا اور برف کے چند ٹکڑے ڈالکر گلاس مُنہ سے لگا لیا جب غٹ
غٹ کی دو چار آوازوں کے بعد گلاس میں ایک گھونٹ سے بھی کچھ کم شراب رہ گئی تو چھوٹی شیشی کا کاگ
کھول کے سنہری عرق کے چند قطرے ٹپکا دیئے بعد ازاں ڈاٹ لگا کر شیشی کو بحفاظت جیب میں رکھ لیا۔

اب دلی انتشار دور ہو چکا تھا اور دونوں آنکھوں سے فاتحانہ مکروہ چمک نمودار تھی۔ بزعم خود انھوں نے
اس عیارانہ تدبیر سے حریف کو مغلوب کر لیا تھا چند منٹ تک سرنگوں رکھکر اپنی چالاکی پر خوش ہوتے رہے پھر مئے نوشی
کا جملہ سامان میز پر چھوڑ کر بغلی کمرے میں جا بیٹھے۔ دروازے کا پردہ برابر کر دیا اور نتیجے کا انتظار کرنے لگے

(۲)

لائبریری میں گھڑی کی ٹِک ٹِک کے سوا کوئی آواز سامعہ نواز نہ تھی لیکن سر داؤد کے کان اُسی جانب
لگے تھے۔ وقت رسمی رفتار سے گذرتا رہا جتنی دیر میں چھوٹی سوئی دس کے ہندسے سے سرک کر گیارہ
ہندسے پر پہونچی اُتنے عرصہ میں بڑی سوئی نے پورے دائرے کا چکر کاٹ کر بارہ کے نشان پر دم لیا
ایک خفیف گھر گھراہٹ کیساتھ چھوٹی ہتھوڑی نے آہنی پیالی پر یکے بعد دیگرے گیارہ ضربیں لگائیں۔ سر داؤد کا
دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اضطرابی کیفیت سے مجبور نہ بیٹھ سکے نشست سے اٹھکر پردے کے قریب
کھڑے ہو گئے بیم و رجا نے سرخ و سفید چہرے پر ہلدی کا سا زرد غازہ پھیر دیا۔ دل تو بہت چاہا مگر پردے کی
سے لائبریری میں جھانکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایکا ایکی کھٹکے کی آواز کے ساتھ ہی لائبریری کی عقبی کھڑکی کے دونوں پٹ پاٹوں پاٹ کھل گئے اور
ایک چھ سات فٹ کا بھاری بھرکم جوان چوکھٹ بازو کے سہارے اوپر چڑھکر لائبریری میں داخل ہو گیا۔
سر سے پاؤں تک کالے لبادے میں لپٹا ہوا تھا۔ نائٹ کیپ (رات کی ٹوپی) سامنے کی جانب اتنا جھکا

پھنی گئی تھی کہ چہرے کے خدوخال تک روشنی کا گذر محال ہو گیا تھا۔

نووارد نے پہلے تو گشتی نظر دوڑا کر چاروں طرف دیکھا پھر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اسی کرسی پر جا بیٹھا جس پر بیٹھ کر تسرداؤ نے چند دقیقے پیشتر عزم خود کامیاب تجویز کی مسرت میں جرعے نوش کیا تھا۔

اس وقت اچھی خاصی سردی تھی۔ اگرچہ نووارد نے سرمائی معز اثرات سے بچنے کا بست کافی انتظام کرلیا تھا پھر بھی راستے کی ٹھنڈی ہوا نے یخ کی طرح ہاتھ پاؤں سرد کردئے تھے۔ کلیجے میں کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ابھی یہاں بیٹھ کر مقررہ وقت تک تسرداؤ کا انتظار کرنا نہایت ضروری بلکہ ناگزیر تھا۔ اس نے اس گھر کو خانۂ بے تکلف خیال کرتے ہوئے وسکی اور سوڈے سے گلاس بھرا۔ عادتاً برف کی دو تین کنکریاں ڈالیں اور جام کو لبوں تک لایا۔ ہنوز تھوڑا فصل باقی تھا کہ ایک خوفناک خیال نے ہاتھ پکڑ لیا۔ گلاس بدستور میز پر رکھدیا اور دل ہی دل میں کسی اہم مسئلے کے حل میں غرق ہو گیا۔ غیر معمولی ذہانت نے بہت جلد راز کی حقیقت ظاہر کر دی۔ غیظ و غضب سے دونوں آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ مُنہ لال انگارا ہو گیا۔ مگر اس حالت کو استقلال نصیب نہوا۔ آناً فاناً میں جذبات پر قابو پا کے سابق کی طرح مطمئن و پرسکون نظر آنے لگا۔ لبوں پر حقارت آمیز تبسم نمودار ہوا۔ اُس نے دو چار دفعہ آہستہ آہستہ سر کو جنبش دیتے ہوئے گلاس کی نصف شراب وسکی کی بوتل میں ڈالدی۔ بقیہ مقدار کو ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور مصنوعی اضطرار ظاہر کرتے ہوئے دو چار چکر لگائے۔ پھر ہاتھ اس طرح ڈھیلا کیا کہ گلاس چھٹ کر گرا۔ اور گرتے ہی چورچور ہو گیا۔ شراب کی چھینٹیں کئی کئی قدم تک اڑکر پہنچیں۔ اس کے بعد خود ہی تیورا کر فرش پر آرہا۔ دھماکے کی آواز فضا میں گونج کر گم ہو گئی اور لائبریری میں پھر وہی سکوت طاری ہو گیا۔ یہ تمام واقعات چند منٹوں میں واقع ہو گئے۔

(۳)

برابر کے کمرے سے دھماکے کی آواز سنتے ہی تسرداؤ خوشی سے اُچھل پڑے۔ خوف زدہ چہرے پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی۔ کامیابی کے غرور میں سینہ تان اور سر بلند کئے لائبریری میں داخل ہوئے۔ یوں ــــ جیسے فتح مند جرنل مفتوحہ قلعہ میں داخل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اُن کی متجسس نگاہیں گلاس کے ریزوں اور شراب کی بوندوں پر پڑیں جو برقی روشنی میں الماس و گوہر کی طرح بکھری ہوئی ضوفشانی کر رہی تھیں۔ امکان یقین سے بدلنے لگا۔ پھر گشتی نظر اس نظارے سے گذرتی ہوئی ایک انسانی ہیکل سے ٹکرائی جو بیجان لوتھ کی مانند فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ گرتے وقت سر میز کے پائے سے ٹکرا کر کھل گیا تھا۔ اور زخم سے جیتا جیتا خون برس رہا تھا۔ اینٹھے ہوئے ہاتھ پاؤں سے جانکنی کا راز فاش ہو رہا تھا جو ٹوپی آگے کی طرف جھک کر چہرے کو نقاب کی طرح چھپائے تھی اب سر سے جدا ہو کر کئی فٹ کے فاصلے پر جا گری تھی اور بجلی کی

روشنی میں اجل رسیدہ کے خد وخال صاف صاف نظر آرہے تھے۔ مرنے والا بھی سر داؤد کی طرح بارعب وپروجاہت تھا۔ لباس قیمتی نفیس اور شریفانہ تھا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس لباس فاخرہ میں کوئی انسانیت سوز ہستی ملبوس نہیں ہے جس صورت پر ہمیشہ کبر وتمکین کی دوہری دوہری نقابیں پڑی رہتی تھیں، اُسے مرگ ناگہانی نے عریاں کرکے مٹیلے رنگ سے رنگ دیا تھا۔

اس بے جان قالب پر سر داؤد نے وہی نگاہ ڈالی جو شکاری خاک وخون میں لتھڑے ہوئے شکار پر ڈالتا ہے اور دل ہی دل میں اپنی قدر اندازی پر خوشی مناتا ہے۔ وہ لاش کے قریب کھڑے ہو کر کئی منٹ تک عمیق نظروں سے گھورتا رہا۔ گویا صحیح حالات کی جانچ میں مصروف ہے۔ پھر کسی خیال سے اکڑوں بیٹھ کر چہرے کو بغور دیکھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر قلب کی حرکت معلوم کی اور عُجب ونخوت سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "تم مرگئے؟ موت نے دونوں ہونٹ سی دیئے۔ اب افشائے راز کا خوف باقی نہیں (لاش سے خطاب کرکے) "دوست ہارون؟ مجھ سے اور ہزار گنی کا مطالبہ؟ عدم ادائگی کی صورت میں گرفتار کرادینے کی دھمکی؟ خوب؟ خوب؟؟ احسان مانو کہ میں نے تمھیں دارو‌ئے مرگ پلاکر مالی مشکلات اور کشاکش حیات سے مستغنی کردیا۔ جاؤ، عالم ارواح میں ابدی زندگی کے دن پورے کرو اور اگر ممکن ہو تو وہاں سے افشائے راز کی کوشش کرو۔"

سر داؤد سیدھے کھڑے ہو گئے حیلہ طراز دماغ نے اس بلا کو سر سے ٹالنے کی عجیب تجویز پیش کی۔ انھوں نے ٹیلیفون کے قریب جاکر ریسیور اٹھایا۔ اکسچینج آفس سے پولیس اسٹیشن کا نمبر طلب کیا اور سب انسپکٹر کو پکار کر کہا۔ "ہلو مسٹر؟ آپ ہیں، سب انسپکٹر؟ میری لائبریری میں ایک لاش پائی گئی ہے جلد تشریف لائیے بڑی مہربانی ہوگی۔"

(۴)

سر داؤد ریسیور رکھکر پھر اپنی کرسی پر آبیٹھے۔ چہرے سے فکر وغور کی علامتیں ٹپکنے لگیں اور وہ ان واقعات کی تصنیف میں مشغول ہو گئے جو موجودہ باب میں تھانے دار سے بیان کرنا تھے۔ ابھی گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا ادھا بجایا تھا کہ سب انسپکٹر چند کانسٹبلوں کے ساتھ موقعہ واردات پر آموجود ہوا اور لاش پر اُچٹتی نظر ڈالکر سر داؤد سے کہا ——— "مہربانی فرماکر واقعہ کی تفصیل ارشاد کیجئے۔"

سر داؤد ——— "واقعات بالکل مختصر لیکن نہایت حیرت انگیز ہیں۔ لائبریری میں میری نشست معمولاً ساڑھے دس بجے رات تک رہتی ہے۔ چنانچہ آج بھی حسب دستور مقررہ وقت تک موجود تھا پھر آرام کے ارادے سے خواب گاہ میں چلا آیا۔ ہنوز سونے کے انتظام میں مصروف تھا کہ دھماکے کی آواز سنکر لائبریری میں واپس آنا پڑا۔ یہاں پہنچ کر ایک اجنبی کو فرش پر مرا ہوا دیکھ کر فوراً آپ کو ٹیلیفون سے مطلع کیا۔"

سب انسپکٹر "اس کے علاوہ اور کوئی نئی بات؟"

تسر داؤد پر کوئی نہیں ہے"

سب انسپکٹر نے سر جھکا کر کچھ غور کیا۔ پھر لاش کی طرف متوجہ ہوا قریب پہنچکر جھکا، مردنی چھائی ہوئی صورت پر گہری نظر ڈالی۔ منہ کے پاس ہاتھ لیجا کر سانس معلوم کی اور آخر میں نبض ٹٹول کر دیکھی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس طرح حسب معمول چل رہی تھی جیسے تندرست آدمیوں کی نبض چلتی ہے!

سب انسپکٹر نے اپنا تعجب ظاہر کرنے کیواسطے لبوں کو جنبش دی۔ پوری طور پر آواز نہ نکلی تھی کہ وہ حرکت اعجاز عیسوی بن گئی۔ قالب بیجان میں روح حلول کر گئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس واقعہ نے حاضرین پر سکتہ طاری کر دیا سب کے سب پتھر کی مورتیں بنکر رہ گئے۔

ہاسون کی شعلہ بار آنکھوں سے نفرت و حقارت پیدا تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر سر کے زخم سے خون پاک کیا۔ پھر تسر داؤد کی طرف قہر کی نگاہوں سے گھورتے ہوئے تھانیدار سے مخاطب ہوا۔

"داروغہ صاحب؟ متعجب نہ ہوجیئے۔ یہ بھی ایک رول تھا۔ شکر ہے میری ایکٹنگ کامیاب رہی اور مقصد حاصل ہوگیا۔ (جیب سے خط نکال کر دیتے ہوئے) ملاحظہ ہو۔ یہی وہ خط ہے جو میں نے تسر داؤد کو لکھ کر ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا۔ انھوں نے میری خواہش کے موافق لائبریری کی کھڑکی کھلی چھوڑ دی لیکن مجرمانہ ذہانت نے انوکھی چال کھیلنے پر ابھارا اور انھوں نے جن مکارانہ تدبیروں سے بے انتہا دولت پیدا کی ہے انھیں میں سے ایک تدبیر کو عملی تشکیل دیکر میرے لبوں پر سکوت دائمی کی مہر ثبت کرتے ہوئے جرائم پر پردہ ڈالنا چاہا۔ انھوں نے شراب میں زہر کی آمیزش کی اور اسے اس نیت سے میز پر چھوڑ کر روپوش ہوگئے کہ میں انکی عدم حاضری میں مے نوشی کرتے ہوئے فنا ہوجاؤں۔ کوئی شبہ نہیں کہ انکی چال کارگر ہوچکی تھی لیکن عین وقت پر میری نگاہ پڑ گئی اور جام میں کچھ سنہری ذرات چمکتے دکھائی دئیے۔ چونکہ مجھے قبل سے ان کے پاس سم قاتل ہونے کا علم تھا اس لئے تھوڑی فکر میں سارا معمہ حل ہوگیا۔ واقعات آئینے کی طرح جھلکنے لگے اور میں ان کی غداری پر بھینٹ چڑھنے سے بال بال محفوظ رہا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ ان کی چال کو انھیں پر الٹ دوں اس خیال کے ماتحت میں نے گلاس توڑ ڈالا۔ اور مردہ بنکر گر پڑا۔ اگرچہ سر میں خفیف سی چوٹ آئی مگر کچھ مضائقہ نہیں یہ کامیابی کا صدقہ ہے۔ دھماکے کی آواز تسر داؤد کے کان میں پڑی اور وہ فوراً لائبریری میں واپس آئے۔ مجھے بیجان دیکھکر جان میں جان آئی۔ خوشی سے بغلیں بجائیں۔ چند مہمل جملے استعمال کئے پھر آپ کو ٹیلیفون دیکر طلب کیا۔ یا بالفاظ دیگر میری تمنا پوری ہوئی۔ (تسر داؤد کی جانب اشارہ کرکے) میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ان مہربان کو اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کرلیں"

سر داؤد کی صورت سے شکستگی ظاہر تھی چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا تھا۔ وہ دلی اضطراب پر قابو پانے کی ناکام سعی میں مصروف تھی کہ سب انسپکٹر نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا ...... "آپ کیا عذر پیش کرینگے؟"
سر داؤد: "یہ شخص جھوٹا ہے...... بالکل جھوٹا! محض کاذب! میں نے آج بلکہ اس وقت سے پہلے اسکی صورت بھی نہیں دیکھی پھر زہر دینے کی کوشش کے کیا معنی؟ معلوم ہوتا ہے کسی دشمن نے اغوا کرکے اسے میری تخریب و تذلیل پر آمادہ کیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں تو پھر اسکی دیوانگی میں جائے کلام نہیں۔"
ہارون: "سر داؤد! جرم ثابت ہے۔ اب تردید میں مفر نہیں۔ بہتر ہے کہ اقبال جرم کرتے ہوئے اپنے آپ کو عدالت کے رحم پر چھوڑ دو۔"
سر داؤد: "ہرگز نہیں۔ میں تمہیں غلط الزام لگانیکے جرم میں قانون سپرد کروں گا (تھانیدار سے) اسکی غلط بیانی کا ثبوت ابھی حاصل ہوا جاتا ہے۔ میں اس بوتل سے جسمیں یہ زہر ہونا بیان کرتا ہے چند گھونٹ پیکر دکھلائے دیتا ہوں کہ اس کا لگایا ہوا الزام بے بنیاد افترا سے زیادہ وقیع نہیں۔"
ہارون: "ٹھہر و ٹھہرو۔ جلد بازی میں تمہاری جان کا خطرہ ہے۔"
سر داؤد: "کوئی خطرہ نہیں میں ضرور اس بوتل کی شراب پیکر تمہارا جھوٹ واضح کروں گا۔"
ہارون: "سر داؤد! ایسی غلطی نہ کرنا کیونکہ میں نے سم آلود شراب گلاس سے بوتل میں انڈیل دی ہے اور اس کے اندر وہی زہر موجود ہے جو تم نے گلاس میں ڈالا تھا۔"
سر داؤد: "تم دھوکا دیکر مجھ پر جرم عاید کرانا چاہتے ہو مگر یاد رکھو میں تمہارے فریب میں آنیوالا نہیں"
جملہ ختم کرتے ہی سر داؤد نے بوتل منہ سے لگا کے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اُتارنا شروع کئے۔ جب تک ہارون نے اسکے ہاتھ سے بوتل چھینی کئی گھونٹ معدے میں پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیورا کر گرے آنکھیں الٹ گئیں۔ الٹی سانسیں چلنے لگیں، اور نزع کی حالت طاری ہوگئی۔ تھانیدار نے ڈاکٹر بلانا چاہا لیکن ہارون نے کہا...... "اب کوشش فضول ہے۔ سر داؤد اپنی مجرمانہ چالوں کا شکار ہو چکا۔ وہ گزشتہ آنیسے پہلے جرموں کی سزا بھگتنے کو خدائی عدالت میں پہنچ جائیگا۔ ہرچند اتفاقات نے دنیوی پاداش سے بچالیا لیکن اخروی مواخذے سے محفوظ رہنا محال ہے۔ سچ ہے ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

تنقید کتب

بیوہ[لہ]

یہ دلچسپ ناول ہندوستان کے مایۂ ناز اور مشہور و معروف ناول نویس اور فسانہ نگار منشی دھنپت رائے المعروف بہ پریم چند کی تصنیف لطیف ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات پر معمولی لکھائی چھپائی اور کاغذ کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

ہندوستان میں عموماً اور صوبجات متحدہ میں خصوصاً ایک ناول نگار اور فسانہ نویس کی حیثیت سے جس قدر شہرت اور ہر دلعزیزی منشی پریم چند نے حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر بنگال اپنے ٹیگور اور سرت چندر چاٹرجیا پادھیا پر ناز کر سکتا ہے تو ہمارا صوبہ منشی پریم چند پر بجا طور سے فخر و مباہات کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند صاحب جو کچھ لکھتے ہیں وہ پورے جوش، پورے انہماک اور پورے خلوص کے ساتھ لکھتے ہیں اور چونکہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے؛ اس لئے پریم چند کا کوئی ناول ہو یا افسانہ پڑھنے کے بعد دل پر ایسا اثر کرتا ہے کہ زبان سے فوراً بیساختہ واہ واہ اور مرحبا نکل جاتی ہے۔

کردار نویسی میں پریم چند کو کمال حاصل ہے، ان کے افسانوں کا ہر شخص اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے پریم چند انسانی نفسیات کے زبردست ماہر ہیں، اور جس وقت وہ اس بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زن ہو کر باہر آتے ہیں ان کا دامن آرزو گوہر مراد سے معمور ہوتا ہے۔ انھوں نے دیہاتی سوسائٹی کا اس قدر غور و خوض اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا ہے کہ جب وہ کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں پھرتی نظر آتی ہیں۔ دیہاتی زندگی کی مصوری میں شاید ہندوستان میں ان کو وہی درجہ حاصل ہے جو روس میں کاونٹ ٹالسٹائی کو حاصل تھا۔ منشی پریم چند کی تحریروں میں ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں میں پند و نصائح کی ٹھونس ٹھانس نہیں ہوتی، بانہمہ وہ اپنی سادہ عبارت میں کہیں کہیں علم و حکمت کے بیش بہا موتی اس سلیقہ اور خوش

لہ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور

اسلوبی سے پروتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھتے ہی دل سے واہ واہ کی صدائے اختیار بلند ہونے لگتی ہے۔
ہم کتاب زیر نظر میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جو ہمارے قول پر شاہد ہیں۔

"اپنی تعریف سُنکر ہم اتنے متوالے ہو جاتے ہیں کہ ہم میں اچھا برا سمجھنے کی تمیز ہی نہیں رہ جاتی، بڑے سے بڑا مہاتما بھی اپنی تعریف سنکر خوشی سے پھول اُٹھتا ہے، ہاں تعریف کرنے والے کے لفظوں میں بھگتی (عقیدت) کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعرا کو جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنے کے لئے راجے مہاراجے انعام واکرام کیوں دیتے۔ بتاؤ راجہ صاحب تیغ کی آواز سُنکر چونک پڑتے ہیں، کانوں میں اُنگلی ڈال لیتے ہیں اور گھر میں بھاگتے ہیں مگر دربار کا شاعر انھیں شجاعت میں ارجن اور درونا چارج سے دو ہاتھ اور اونچا اُٹھا دیتا ہے۔ تو راجہ صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ انھیں مطلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ میرا مضحکہ اڑایا جا رہا ہے۔ ایسی تعریفوں میں ہم الفاظ کو نہیں اُن کے اندر چھپے ہوئے جذبات کو دیکھتے ہیں۔" (بیوہ صفحہ ۲۹)

سطور بالا میں پریم چند نے فطرت انسانی کی کس قدر سچی تصویر کھینچی ہے اور انسان کی نفسیاتی کمزوریاں کس دلآویز پیرایہ میں دکھائی ہیں۔ یہ عبارت ان لوگوں کیلئے بھی شمع ہدایت ہے جو ہندوستان اور ہندوستانی زبان کے سچے محب اور خدمتگذار بننا چاہتے ہیں۔ اگر پریم چند چاہتے تو بہت آسانی سے ارجن اور درونا چارج کی جگہ رستم واسفندیار استعمال کر سکتے تھے لیکن جب ہمارے یہاں رستم و اسفندیار سے بھی زیادہ سورما ارجن، بھیم، بھیشم پتامہ، درونا چارج، ابھیمنیو، کرن اور پرسرام جی وغیرہ گذرے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ ہم ان کے نام نہ لکھیں اور اپنے گھر سے ہزاروں میل فاصلہ پر پہونچکر ایران وتوران کی خاک چھانتے پھریں۔ اسی طرح جب ہمارے یہاں گنگا اور جمنا جیسے پاک اور مقدس دریا موجود ہیں تو ہم کیوں ان سے جیحون، سیحون یا عراق سے فرات و دجلہ لاکر ہندوستان میں بہائیں۔

ناداری وتنگدستی کی مذمت ملاحظہ ہو:۔

"دست نگری سے بڑی مصیبت بدنصیبی کے بھی خزانہ میں نہیں ہے۔" (صفحہ ۴۸)

تعلیم اخلاق دیکھئے:۔

"کثیف برتن سے صاف پانی بھی گندہ ہو جاتا ہے۔ نفرت سے بھرا ہوا دل پاک مذاق بھی نہیں برداشت کر سکتا۔" (صفحہ ۱۰۷)

دیکھئے ذیل کے مکالمہ میں کس قدر مؤثر اور دلچسپ پیرایہ میں اصلاح رواج ورسوم کا درس دیا گیا ہے:۔

سومترا:۔ تو تمہاری ماں (ممانی) امیر گھرانے کی لڑکی ہوگی؟

پورنا :- کیسا اپیر گھرانا ؟ مول لائی گئی تھیں، ماموں صاحب کی پہلی بیوی مر گئی تھیں تو انھیں مول لے آئے تھے۔

سومترا :- کیا کہتی ہو بہن ! کہیں عورتیں بکتی ہیں ؟

پورنا :- عورتیں اور مرد دونوں ہی بکتے ہیں۔ لڑکی کا باپ کچھ لیکر لڑکی بیاہے اور لڑکے کا باپ کچھ لیکر بیاہے۔ یہ بیچنا نہیں تو اور کیا ہے ؟" (صفحہ ۱۲۵)

ہزاروں کتھائیں اور ہزاروں سبھائیں اس قدر اثر نہیں ڈال سکتیں جس قدر اس مکالمے کی ان چند سطروں سے ناظرین کے دل پر پڑ سکتا ہے۔

ایک عفت پرور اور عصمت پرست عورت کیا معنی خیز اور سبق آموز فقرہ کہتی ہے :-

"بڑھاپے پر بد چلنی کا الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے :" (صفحہ ۱۵۰)

"کیچے کے لئے زمین کا ٹھیکرا بھی تیز چاقو بن جاتا ہے :" (صفحہ ۱۶۰)

بیوہ کی مشکلات کا فوٹو کیا خوب کھینچا جاتا ہے :-

"پانی میں رہکر اس کے تھپیڑوں سے بچا رہنا تمہاری (یعنی بیوہ کی) طاقت سے باہر ہے۔ بے لنگر کی کشتی لہروں میں ساکت نہیں رہ سکتی، پڑی ہوئی دولت کو اٹھا لینے میں کسے تامل ہوتا ہے :" (صفحہ ۱۷۵)

"جلتے ہوئے دل سے دھوئیں کے سوائے اور کیا نکل سکتا ہے :" (صفحہ ۱۰۰)

محبت کے متعلق فرماتے ہیں :-

"محبت کی رفتار روانی آب کی طرح ہے جو ذرا دیر کے لئے رک جائے مگر اپنی چال نہیں تبدیل کر سکتی" (۱۰۰)

ایک جگہ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں :-

"جو چڑیا کو جال کے نیچے بکھرے ہوئے دانہ کی طرف لے جائیں انکا اکھڑ جانا ہی اچھا :" (۱۰۰)

الغرض کہاں تک لکھا جائے ع داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار۔

پریم چند کی ایک خصوصیت اور ہے یعنی جس سوسائٹی کا وہ نقشہ کھینچتے ہیں اس کی زبان اس قدر کمال کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ انہیں کا حصہ ہو جاتی ہے، اصل یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس قدر خوبی سے لکھتے ہیں جس سے وہ ایک صاحب طرز خاص ہو گئے ہیں۔ اس ناول میں پریم چند نے امرت رائے۔ دان چند کملا پرشاد تین مردوں اور پریما۔ سومترا اور پورنا تین عورتوں کا کیرکٹر دکھایا ہے جن میں پریما اور سومترا کا کیرکٹر مکمل اور قابل تعریف ہے۔ پلاٹ میں بیواؤں کی حالت زار، اوباشوں کے ہتھکنڈے، اصلاح رسوم کی ضرورت اور قومی خدمات کی اہمیت دکھائی گئی ہے۔ تمام ناول دلچسپ ہونے کے علاوہ اصلاحی ہے۔ اور ایسے ہی ناولوں کی ملک و قوم کو ضرورت بھی ہے، ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہر شخص جو اردو جانتا ہو وہ اس نفیس کتاب کا مطالعہ کرے۔

مشاہیر اُردو کے خطوط

مرتبہ مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل، پروفیسر عربی، فارسی و اُردو ہندو یونیورسٹی بنارس۔
یہ کتاب زبان اُردو کے بیش مشاہیر کے منتخب خطوط کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس بزرگ کے خطوط درج کئے گئے ہیں، اُن کے شروع میں فاضل مؤلف نے کاتب الحروف کی مختصر سوانح عمری بھی درج کر دی ہے، جس سے معلومات میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں خطوط کی ترتیب ایسی رکھی گئی ہے جس سے اُردو انشاء و ادب کی تدریجی ترقیوں کا معقول پتہ چل سکتا ہے۔ شروع میں خطوط کی اہمیت اور خصوصیات کے متعلق مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد، علامہ سید سلیمان ندوی، مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی، مولوی مرزا محمد عسکری بی۔اے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کی تحریروں کے اقتباسات بھی دیے ہیں۔ کتاب بحیثیت المجموع اچھی اور طلبہ کے لئے مفید ہے
قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ، رائے صاحب رام دیال اگروالا، الہ آباد۔

چراغ

چراغ، آہ ...... چراغ کہاں ہے۔ اسے حسن خواہشات کی چنگاری سے روشن کر دو۔ چراغ ہے جیسے "چراغ سحر" کی طرح ایک بار بھڑک کر بجھ جانے سے واسطہ نہیں۔ میرے حبیب دل! کیا تیری قسمت کا بھی یہی عالم ہے؟ آہ! اس سے "موت" بہتر ہے۔

مصائب تیرے دروازے پر دستک دیتے ہیں، کہ تیرا مالک بیدار ہے۔ اور اس تاریک رات میں تیری "محبت کا امتحان" چاہتے ہیں۔ عروس شب نے بادلوں کا سیہ نقاب لیا ہوا ہے۔ اور بارش۔ اپنے اختتام سے بے خبر، آہ، میں نہیں جانتا کہ میرے دل میں وہ جذبہ کیا ہے۔ جو مجھے رہ رہ کر اچھال رہا ہے۔
...... اور آہ! ...... اس کا مطلب ......؟

برق بیتاب کی ہلکی سی چمک، میری نگاہوں پر آلام کا تاریک پردہ گرا دیتی ہے۔ اور میرا دل ...... بیتاب و بیقرار دل! اس تاریکی میں اس راستہ کی جستجو میں محو ہو جاتا ہے ...... جہاں سے "موسیقی شب" مجھے دعوت دیتی ہوتی ہے۔

چراغ ...... آہ ...... چراغ کہاں ہے! اسے "حسن خواہشات" کی جلتی ہوئی آگ سے روشن کر دو۔

طوفانی رات ـــــ سراسر طوفان ہے۔ باد تند اپنے پورے جوبن پر ہے۔ اور سیاہی شب کس قدر خوفناک!
ناچیز کے صدقے۔ اپنے آپ کو مضمحل نہ کرو۔ اور قندیل "محبت" کو اپنی "آتش حیات" سے روشن کرو۔

(ٹیگور)

یادِ رفتگاں

سید حسن امام مرحوم

اک نفس پر ہے کاروبارِ حیات
آدمی کی بھی کوئی ہستی ہے　　(جگر بریلوی)

ابھی چھ مہینے بھی گذرنے نہیں پائے کہ نادرِ ہند سر علی امام مرحوم کی وفات حسرت آیات کا صدمہ اُٹھا چکی ہے۔ افسوس کہ ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو دوسرے عالمِ قانون یعنی سر علی امام مرحوم کے چھوٹے بھائی سید حسن امام کے غم میں صف ماتم بچھانا پڑی، آہ ؎ غروب ہوگئے شمس و قمر زمیں کے تلے۔ اللہ اللہ ابن ماں! آپ کی آنکھوں کے سامنے عالمِ پیری میں آفتاب و ماہتاب کے ایسے درخشاں فرزند یکے بعد دیگرے دنیا سے اُٹھ جائیں اُن کے قلب و جگر کا کیا حال ہوا ہوگا۔ سید حسن امام کی وفات سے دس ہی دن بعد یعنی ۳۰۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو ان کی والدہ محترمہ فرطِ غم والم سے رہگرائے عالمِ بقا ہوگئیں اب رہے آپ کے والد ماجد شمس العلماء نواب امداد امام ان کا حال خود ان کے ایک شعر سے واضح ہے ؎

چھپاؤں میں لاکھ سوزِ غم کو فغاں کا شعلہ بھڑک اُٹھے گا
دل و جگر جب اثر جلیں گے تو آگ کیونکر نہاں رہے گی

خاندان | سید حسن امام ۳۱۔ اگست ۱۸۷۱ء کو بمقام پٹنہ پیدا ہوئے تھے، آپ کا خاندان ضلع پٹنہ میں تقریباً سات سو برس سے آباد ہے۔ سلسلۂ نسب حضرت زیدؓ سے ملتا ہے۔ اگرچہ شرافت و نجابت اور علم و فضل ورثہ آبائی تھا مگر چار پشتوں سے اس خاندان کو قانونی موشگافیوں سے خاص شغف و انہماک رہا چنانچہ آپ کے پردادا سید امداد علی صاحب انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں عہدۂ ججی پر ممتاز تھے اور ان کے جد امجد خان بہادر سید وحید الدین صاحب پہلے ہندوستانی تھے جو ڈسٹرکٹ جج کے ممتاز عہدہ پر فائز ہوئے۔ آپ کے والد شمس العلماء نواب امداد امام ایک بے عدیل حکیم، بے مثل شاعر، سحر طراز ادیب اور جادو نگار مصنف ہیں اثرؔ تخلص فرماتے ہیں آپ کی کئی کتابوں کا ترجمہ یورپین زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ابتدائی حالات سید حسن امام نے ابتدائی تعلیم پٹنہ میں پائی، بعدازاں ۱۸۸۹ء میں آپ انگلینڈ تشریف لے گئے جہاں ۱۸۹۲ء میں آپ نے بیرسٹری پاس کی، اور مڈل ٹمپل بار میں داخل ہو گئے۔
اس کے بعد آپ ہندوستان واپس آکر پٹنہ میں پریکٹس کرنے لگے۔ بعدہٗ ۱۹۱۱ء میں آپ کلکتہ چلے گئے جہاں ۱۹۱۲ء میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج مقرر ہو گئے۔ لیکن جب ۱۹۱۶ء میں پٹنہ میں ہائیکورٹ قائم ہو گئی تو آپ ججی سے مستعفی ہو کر پھر پٹنہ چلے آئے اور پریکٹس کرنے لگے۔ اور تادم مرگ یہیں رہے۔

خدمات سید حسن امام قوم پرست مسلمان تھے، فرقہ وارانہ تعصبات سے آپ ہمیشہ بالاتر رہے۔ قومی خدمت کے میدان میں آپ نے سب سے پہلا قدم ۱۹۰۸ء میں رکھا، اور کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں شریک ہوئے آپ نے ملک و قوم کی خدمات میں اس قدر پرخلوص انہماک دکھایا کہ آپ کو کانگریس کے اسپیشل اجلاس کا جو ستمبر ۱۹۱۸ء میں بمبئی میں منعقد ہوا تھا پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ آپ انڈیا ہوم رول لیگ کے بھی صدر تھے۔ ۱۹۲۱ء میں آپ لندن تشریف لے گئے جہاں آپ نے اس کانفرنس میں جو بمقام لندن بسلسلۂ صلحنامہ ترکی منعقد ہوئی تھی بحیثیت ڈیلیگیٹ شرکت فرمائی۔ اور معاہدہ سیورے میں ترمیم کے لئے مسٹر لائڈ جارج پر جو اس وقت وزیر اعظم تھے خاص زور دیا۔ آپ نے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے تحقیقاتی وفد کی صدارت فرمائی اور ایسے نازک وقت میں قوم کے اس مایۂ ناز ادارہ کو بچا لیا۔ ۱۹۳۰ء میں آپ نے مع اپنی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادیوں کے کانگریسی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجلس اقوام کے اجلاس میں ہندوستان کی طرف سے نمائندگی کے فرائض بھی انجام دیئے۔

سید حسن امام مرحوم جس کام کو کرتے تھے اُسے تکمیل کو پہونچا دیتے تھے۔ جب آپ انگلستان میں قانون پڑھتے تھے تو آپ نے مڈل ٹمپل کی تمام لائبریری چاٹ ڈالی تھی، اور جب مسٹر ولیم ڈگبی نے ملک ویلز کا دورہ کیا تو آپ اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ان کے معتمد خصوصی بن گئے۔ ۱۸۹۱ء میں جب مسٹر دادا بھائی نوروجی پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ نے بھی نہایت تندہی سے مسٹر دادا بھائی نوروجی کی طرف سے کام کیا۔ آپ نے اس اثنا میں فن خطابت کا پورا کورس بھی پڑھکر امتحان پاس کیا۔ بہرحال آپ کو ہمیشہ اپنی قابلیت میں اضافہ کرنے کا خیال دامنگیر رہا۔ ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر بسنٹ نے آپ کو کانگریس کا پریسیڈنٹ تجویز کرتے ہوئے صحیح فرمایا تھا کہ:-

"آپ نے جوڈیشل بنچ پر ہندوستان کی عظمت و شان کو قائم رکھا ہے آپ شاہی ہائیکورٹ کی کرسی سے اتر کر قوم کی ہائیکورٹ (کانگریس) میں اس لئے تشریف لائے ہیں کہ اپنی تمام تعلیم و تربیت اپنی ذہانت

اپنا علم و فضل، اپنی عقل و فہم، اپنی روشن دماغی، اپنی اصابتِ تخیل جن کے باعث وہ ہندوستان کے ججوں میں اعلیٰ اور ممتاز رہے ہیں، قوم کی خدمت کے لئے پیش کریں۔"

آپ کی قانونی قابلیت مشہور زمانہ تھی۔ آپ کی وفات پر پٹنہ ہائیکورٹ کے فل بنچ نے آپ کی قانونی قابلیت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا:۔

"سید حسن امام نے اپنے قانونی مشوروں سے ہمیشہ جہان ہائیکورٹ کی رہنمائی کی۔ سید مرحوم نہایت علم دوست، مخلص، دوراست گو اور حلیم الطبع شخص تھے، آپ کی ادبی معلومات نہایت وسیع تھی؛ اور آپ تاریخ و فلسفہ میں کامل عبور رکھتے تھے۔ آپ کے انتقال پر تمام ہندوستان کا ماتم گسار ہونا ضروری بلکہ لازمی ہے۔"

بقول مسٹر آرٹ جج ہائیکورٹ پٹنہ "فی زمانہ وکالت میں سید حسن امام مرحوم کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اور اُن کی قانونی قابلیت نے ججوں کا کام آسان کر دیا تھا۔"

حسنِ اخلاق کے آپ پتلے تھے، اور باوجودیکہ آپ کی آمدنی پچیس تیس ہزار روپیہ ماہوار تھی، باہمہ منکسر مزاجی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آدابِ صحبت اور خوش اخلاقی میں آپ اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آپ کا چہرہ ہمیشہ شگفتہ رہتا تھا اور جو شخص بھی آپ سے ملنے جاتا اس سے خندہ پیشانی اور خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس میں آپ کو ہردلعزیزی حاصل نہ ہو۔ ہر شخص آپکی عزت اور محبت کرتا تھا اور ہر شخص آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا، ایک طرف کانگریسی مرحوم کو اپنا لیڈر سمجھتے تھے تو دوسری طرف غیر کانگریسی ان کو اپنا مربی و سرپرست جانتے تھے۔

اس طرف کچھ عرصہ سے آپ نے سیاسیات میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا، باہمہ آپ تمام سیاسی واقعات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ آپ کے تدبر و سیاست دانی کا یہ حال تھا کہ جس روز صبح کو وہائٹ پیپر شائع ہوا تو آپ نے اس کو خوب غور سے پڑھا اور سمجھا، اور اسی روز شام کو جب مسٹر سچدانند سنہا کے دولتخانہ پر جمع ہوئے تو آپ وہائٹ پیپر پر بحث کرنے کے لئے اس طرح تیار تھے جیسے کوئی طالب علم امتحان کے لئے تیاری کرتا ہے۔ آپ نے تمام وہائٹ پیپر کا خلاصہ چند جملوں میں بیان کر دیا۔ ہندوستان کے ایسے نازک دور میں ایسے ہوشیار، ذہین اور تجربہ کار سیاست داں کا دنیا سے اُٹھ جانا واقعی مادرِ ہند کے لئے ناقابلِ برداشت صدمۂ عظیم ہے۔ آپ نے دو بیٹے اور تین بیٹیاں اور بیشمار دولت چھوڑی۔ خدا مرحوم کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

شری دیومت دھرمپال بُدھ بھکشو

۲۹-۱۰ اپریل ۱۹۳۳ء کو بدھ دھرم کے نامور علمبردار شری اناگارک بھکشو دیومت دھرمپال کا بمقام سارناتھ متصل بنارس انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی مذہبی دنیا کو صدمۂ عظیم پہونچا ہے۔ آپ کا وطن جزیرہ سیلون اور آپ کے والدین متوسط درجہ کے خوشحال لوگ تھے۔ وطن ہی میں اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کرکے آپ سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے تھے لیکن چونکہ اوائل عمر ہی سے طبیعت کا رجحان مذہب اور روحانیات کی طرف تھا اس لئے آپ چند ہی سال کے بعد ملازمت سے کنارہ کش ہوکر مذہب کی تبلیغ و اشاعت پر کمربستہ ہوگئے۔ ابتدائی کوششیں اپنے وطن تک ہی محدود رہیں۔ جہاں آپ جزیرہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرکے دیہات میں اپنا کام کرتے رہے۔ بدھ مت کی مقدس کتابوں کے مطالعہ کا آپ کی طبیعت پر اس قدر اثر ہوا کہ آپ نے "دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ" کا نعرہ بلند کیا اور سنیاس لیکر تارک الدنیا ہوگئے۔

بھکشو ہونے کے بعد اپنے آقا و رہنما بُدھ بھگوان کی جنم بھومی یعنی ہندوستان میں بدھ مت کو پھر زندہ کرنے کی دھن میں آپ ۱۸۹۱ء میں ہندوستان آئے اور جنوری ۱۸۹۱ء میں بودھوں کے مقدس مقام بُدھ گیا کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ کے آنے سے چند ماہ قبل گورنمنٹ نے عظیم الشان مہابودھی مندر ایک ہندو مہنت مسمی ہیم نراین گر کے حوالہ کر دیا تھا۔ آپ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو فوراً تہیہ کر لیا کہ جس طرح ممکن ہو اس مندر کو مہنت کے انتظام سے نکالکر ہندوستان میں بدھ مت کی اشاعت کی جائے اور جس طرح مہاراجہ اشوک نے جزیرہ لنکا کو بُدھ مت کی نعمت بخشی تھی اسی طرح آپ بھی مہاراجہ موصوف کے وطن ہندوستان میں اس قدیم دھرم کا پرچار کریں۔ اس طرح ۱۸۹۱ء سے تا دمِ مرگ دھرمپال بھکشو نے اپنی زندگی ایک عظیم الشان جد و جہد میں بسر کردی اور بالآخر ان کو اپنے عزم و استقلال کی بدولت اپنے مشن میں کامیابی نصیب ہوئی۔

ماہ مئی ۱۸۹۱ء میں آپ نے مہابودھی سوسائٹی کی بنا ڈالی اور اسی سال سوسائٹی مذکور کا آرگن "مہابودھی جرنل" جاری کیا جس کے ذریعہ سے ان کے خیالات کی رسائی مفکرین عصر تک ہونے لگی۔ اور جس نے ان کے لئے عالمگیر شہرت کی راہیں کھول دیں۔

۱۸۹۳ء میں بمقام شکاگو امریکہ مذاہب عالم کی جو عظیم الشان کانفرنس ہوئی تھی اسمیں بدھ مت کے علمبردار کی حیثیت سے بھکشو جی بھی شریک ہوئے تھے۔ یہاں سے واپسی پر آپ بحرالکاہل کے جزیرہ ہونولولو

تھا بھی چند روز مقیم رہے اور یہاں آپ کی ملاقات ایک متمول خاتون مسز میری اے ای۔ فوسٹر سے ہوئی اور وہ آپ کے خیالات اور تبلیغ سے متاثر ہوکر بدھ دھرم میں داخل ہوگئیں۔

یہ واقعہ بھکشوجی کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا کیونکہ اس کے بعد ان کے دل کی تمام مرادیں یکے بعد دیگرے پوری ہوتی چلی گئیں۔ مسز فوسٹر ایک امیر کبیر خاتون تھیں اُنھوں نے بدھ دھرم کی اشاعت کے لئے بھکشوجی کی زرِ کثیر سے مدد کی۔ اور وہ اُن کی "دھرم ماتا" بن گئیں۔ دولت ہاتھ میں آتے ہی بھکشوجی نے کالج اسکوائر کلکتہ میں مشہور "شری دھرم راجیک وہیارا" اور اسی کے ساتھ اقامت گاہ تعمیر کی، اور قدیم مولگند ھ کٹی وہیارے کی مرمت کرکے اس کے ساتھ بھکشوؤں اور برہمچاریوں کے لئے آشرم تعمیر کرائے۔ سارناتھ میں جو بنارس کے قریب بدھ مت کا ایک متبرک مقام ہے (یہاں بدھ بھگوان کا سب سے پہلا اپدیش ہوا تھا) ایک عظیم الشان وہیارا، ایک اسکول اور ایک کتب خانہ تعمیر کرایا۔ جس کی بدولت یہ مقام ہزاروں سال تک زمانہ کی دست برد کا شکار رہنے کے بعد اب آباد و بارونق بستی بن گیا ہے۔ اور یہاں قدیم زمانہ کی طرح چین وجاپان، سیلون و برہما کے لوگ تیرتھ یاترا کرنے آتے ہیں۔ اگر دیگر خدمات اور کارناموں کو نظر انداز کردیا جائے تو بھی "ایسی پاٹن سارناتھ" کی از سرِ نو تعمیر جہاں بدھ بھگوان نے اپنا مشہور و معروف وعظ کہا تھا، ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جو شری دھرمپال کے مقدس نام کو تا قیامِ قیامت زندہ رکھیگا۔ بھکشوجی نے بدھ بھگوان کا پیغام لیکر چار مرتبہ تمام دنیا کا چکر لگایا، انگلستان میں "برٹش مہابودھی سوسائٹی" قائم کی اور ممالکِ مغرب میں بدھ مت کی تبلیغ و اشاعت کے دو مرتبہ تاریخی وفود بھیجے۔

فی الحقیقت بھکشوجی کی ذات ایک عظیم الشان ذات تھی جس نے بدھ مت کی تمام دنیا میں بیداری پیدا کردی۔ افسوس ہے کہ ۱۹۳۲ء میں بھکشوجی کی "دھرم ماتا" مسز فوسٹر کا انتقال ہوگیا تھا اور اب ایک سال بعد وہ خود بھی اپنی ماتا کی گود میں پہونچ گئے۔

آپ کو بدھ مت کی تبلیغ و اشاعت کا اس قدر شوق تھا کہ اُنھوں نے مرنے سے پہلے جو الفاظ فرمائے وہ یہ تھے

"مجھے جلد مرنے دو اور جلد پیدا ہونے دو، میری تمنا ہے کہ میں پچیس مرتبہ مرکے پیدا ہوں اور بدھ بھگوان کا دھرم پھیلاؤں"

ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ بھکشوجی نے مرتے وقت یہ فرمایا کہ:۔

"میں مرکر بنارس کے کسی برہمن خاندان میں پیدا ہونگا اور اپنے مشن کو پورا کرونگا"

آپ تمام عمر برہمچاری رہے اور بمقام سارناتھ ۶۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اور یکم مئی کو سارناتھ ہی میں ایک مجمعِ کثیر کے سامنے آپکا کریا کرم ہوا پہلے ارادہ یہ تھا کہ آپکی لاش کولمبو لیجائی جائے لیکن بعد میں یہ تجویز فسخ کردی۔

عالمِ نسواں

۱۳ اپریل گذشتہ میں فتحپور کی ضلع کایستھ کانفرنس میں جو ایڈیٹر صاحب زمانہ کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی تین ریزولیوشن طبقۂ نسواں کی اصلاح و ترقی کے متعلق بھی پاس ہوئے۔ ایک کا تعلق موجودہ رسم پردہ کی منسوخی سے تھا۔ دوسرے ریزولیوشن میں بیواؤں کے پُنر بیاہ کی سفارش کی گئی۔ تیسرے میں شادیوں میں رسم جہیز کی ممانعت کی گئی۔ یہ تجاویز قریب بہ قریب اتفاق رائے سے پاس ہوئیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی پوزیشن کے متعلق عام خیالات میں ایک انقلاب عظیم ہو گیا ہے۔

ریاست کشمیر میں ہندو بیواؤں کے ازدواج ثانی کا قانون جاری ہو گیا ہے۔ ہر بیوہ جس کی عمر سولہ سال سے کم نہ ہو اپنی مرضی سے دوسرا بیاہ کر سکتی ہے۔ سولہ سال سے کم عمر ہونے کی حالت میں بیوہ کا دوسرا بیاہ اس کے مرد عزیزوں اور رشتہ داروں کی اجازت سے ہو سکے گا

---

۱۳ و ۱۴ مئی گذشتہ میں کانپور میں ایک اتحاد کانفرنس ہوئی تھی جس کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مردوں کے علاوہ اکثر معزز خواتین نے بھی حصہ لیا تھا چنانچہ بیگم ڈاکٹر حبیب خاں لودھی مجلس استقبالیہ کی صدر تھیں اور لیڈی وزیر حسن مسز سوشیلا سریواستو، مسز ہون۔ مسز چٹرجی، بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور مسز شملہ نے کانفرنس میں ممتاز حصہ لیا۔ لیڈی وزیر حسن صاحبہ (اہلیہ محترمہ سر وزیر حسن چیف جج چیفکورٹ اودھ) نے اپنی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد کی پر زور حمایت کی اور فرمایا کہ مدارس میں ایسی تاریخ پڑھائی جانا چاہیئے جس سے ملک میں صحیح اور خوشگوار فضا پیدا ہو۔ طلباء ہر قوم کی ملکی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور اس طرح ملک میں باہمی خوش اعتقادی اور ذریعۂ اِنہم آہنگی کا دور دورہ ہو جائے۔ آپ کے علاوہ مسز ہون مسز ایم۔ اے بستا مسز سوشیلا سریواستو اور مسز چٹرجی نے بھی تقریریں کیں۔ لیڈی وزیر حسن نے ایک لیڈی کلب قائم کرنیکی تحریک کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔

گورنمنٹ صوبجاتِ متحدہ امسال اس صوبے کی کسی گریجویٹ خاتون کو ٹیچری کی ڈگری حاصل
ے کیلئے ایک سرکاری وظیفہ دینے والی ہے جس کے لئے ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے ڈائرکٹر
ب سررشتہ تعلیم صوبہ اور مسٹر جسٹس نعمت اللہ ممبر نامزد ہوئے ہیں۔ کمیٹی مذکور کے سامنے نو امیدوار خواتین
ا ہوئی ہیں جن میں سے ایک کا انتخاب کیا جائیگا۔

خوشی کی بات ہے کہ امسال لکھنؤ یونیورسٹی کے امتحانات میں کئی خاتونیں کامیاب ہوئی ہیں،
بی۔اے کے نتائج کی فہرست میں چوٹی کے تین کامیاب امیدوار تینوں صنف نازک سے تعلق
ہیں، اور لطف یہ ہے کہ اول ایک مسلم خاتون، دوم ایک کرسچین لیڈی اور سوم ایک ہندو دیوی ہیں
ان تینوں خوش قسمت خاتونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فرسٹ
ان میں جو لڑکی فرسٹ آئی ہے وہ شیخ شاہد حسین صاحب مرحوم تعلقدار گدیہ کی لائق صاحبزادی مس
شاہد حسین ہے جو دو سال پیشتر انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بھی یونیورسٹی بھر میں سب سے اول
ہیں۔ حال ہی میں آپ کی شادی خان بہادر مسٹر حبیب اللہ صاحب ممبر کونسل صوبہ کے صاحبزادے
ہوئی ہے۔

امسال مس کاما نے ناگپور یونیورسٹی سے قانون کا امتحان پاس کیا ہے، اب آپ ناگپور بار
شامل ہو کر اپنے بزرگوار خان بہادر جے۔ کے۔ آر۔ کاما بیرسٹر کے ساتھ بحیثیت جونیر کام شروع
ں۔ مس موصوف بمبئی کے مشہور و معروف پارسی محب وطن سر فیروز شاہ مہتہ کی نواسی ہیں۔
متوسط کی آپ پہلی لیڈی گریجویٹ ہیں جنھوں نے وکالت کی ڈگری حاصل کی ہے۔

حال میں ہز ہائینس مہاراجہ سندھیا گوالیار کی ہمشیرہ راجکماری کملا راجہ نے کاروے نسواں یونیورسٹی
اسیکنڈری اسکول سرٹیفکٹ امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا، آپ کو فن موسیقی میں امتیاز خاص
ہے۔

مسز سروپ رانی کچلو صاحبہ آل انڈیا نسواں کانفرنس کی شاخ گوالیار کی سکریٹری منتخب ہوئی
آپ گوالیار میں عورتوں کی ایک مشہور لیڈر ہیں۔

مس جوتر موئی گنگولی ایم۔اے اور مسز کمودنی بوس بی۔اے کلکتہ کارپوریشن کی کونسلر منتخب
ہیں۔ یہ بنگال میں پہلی خاتونیں ہیں جنھوں نے کارپوریشن کے انتخابات عامہ میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔
مسز نیلی سین گپتا جو مسٹر جے۔ ایم۔ سین۔ گپتا کی اہلیہ محترمہ ہیں، کلکتہ کارپوریشن کی "ایلڈرمین"
ہوئی ہیں، آپ پہلی خاتون ہیں جنھیں یہ اعزاز نصیب ہوا ہے۔

ستاروں سے خطاب

(از جناب منوہر لال صاحب طالب جکرالی بی اے ایل ایل بی)

خواب سے نفرت ہے یا راحت سے تم کو عار ہے؟ نیند سے بیزار ہو یا تم سے وہ بیزار ہے؟
موہنی صورت نے کسکی کر دیا ششدر تمھیں دلربا کس مہ لقا کا پرتوِ رخسار ہے؟
صورتِ آئینہ کیوں حیراں ہے چشمِ انتظار اشتیاقِ دید ہے یا حسرتِ دیدار ہے؟
شوخیِ حسنِ ازل ہو؟ جلوۂ نورِ خدا؟ ہے چمک اپنی کہ عکسِ نورِ حسنِ یار ہے؟
حسن سے مخمور چشمِ اخترِ شب زندہ دار کس لئے بیدار مثلِ نرگسِ بیمار ہے؟
کاٹتے ہو رات کیوں آنکھوں میں تم میری طرح تم پہ بھی کیا چشمِ لطفِ آہِ آتشبار ہے؟
نور کا موجب تمہارا سوزِ دردِ دل نہو!
سوز کا موجب کہیں حسنِ مہِ کامل نہوا!

رُباعی

(از جناب ڈونی لال صاحب نگم ایم-اے)

اپنا دیکھا ہے اور پرایا ہم نے دنیا میں ہے سب کو آزمایا ہم نے
سب کو مطلب کا دوست دیکھا ہے نگم اپنے مطلب کا اک نہ پایا ہم نے

غزالِ رعنا

(از جناب سید شمس الدین حیدر شمیم)

نہاں تھا مہرِ افق کے سنہرے بادل میں — پیامِ صبح صبا دے رہی تھی جنگل میں
لہک رہے تھے کسانوں کے کھیت میں بجرے — دھنکی ہوئی تھی زمیں رنگ رنگ پھولوں سے
فضا میں گونج رہے تھے طیور کے نغمے — کہ قصرِ خلدِ بریں میں تھے حور کے قہقہے
ہوائے سرد کے جھونکوں سے جھرجھری سی تھی — کھڑا تھا میں مرے پہلو میں گدگدی سی تھی
کہ دفعتہً مجھے کچھ دور پر نظر آیا — وہی کلیم کو جو طور پر نظر آیا
تجلی نظر افروز و جلوۂ رنگیں — طلسم کاریِ صانع کی صنعتِ زریں
کھڑی تھی سبزے پہ اک رشکِ گلشنِ خوبی — گلِ ریاضِ حیا، سروِ باغِ محبوبی
وفورِ کیف میں سیلاب کی روانی تھی — شباب جوش پہ امنڈی ہوئی جوانی تھی
وہ مستیاں کہ برستی ہوئی گھٹائیں تھیں — وہ شوخیاں کہ سنکتی ہوئی ہوائیں تھیں
جو کوئی پتہ کھڑکتا تھا چونک پڑتی تھی — ہوا کی شوخیوں پر دمبدم بگڑتی تھی
چھپا ہوا تھا دھندلکے میں چہرۂ روشن — چراغ نور کا ہو جس طرح تہِ دامن
تڑپ اٹھا دلِ مضطر مثالِ پروانہ — وہ دشت نجد تھا اور میں تھا قیس دیوانہ
قریب جا کے ان آنکھوں سے ہائے کیا دیکھا — غموں میں حسن کی دیوی کو مبتلا دیکھا
سحر کے وقت جوانی اسے سلاتی تھی — قدم قدم پہ مگر مفلسی جگاتی تھی
وہ آہ کی کہ دھواں سا اٹھا مرے دل سے — کلیجہ تھام کے پوچھا یہ میں نے مشکل سے
پڑی ہے تجھ پہ مصیبت وہ کون سی ایسی — کہ چھپتی پھرتی ہے جنگل میں یا پکِ دشتی
کوئی شرر کی لپک تھی کہ برق کی رو تھی — یہ سن کے مثلِ غزالِ چمن سبک رو تھی
ہے دل کو آرزوئے گفت و شنید کی اب تک — ہوس نگاہوں کو ہے بازدید کی اب تک
شبِ فراق کی اپنی سحر نہیں آتی — تلاش کرتا ہوں لیکن نظر نہیں آتی
صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را — کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

گورستان

(از پنڈت اندجیت شرما صاحب)

ہنگامۂ ہستی کا سرانجام عیاں ہے   محرومی تقدیر کی حسرت کا نشاں ہے
نظارۂ غمناک ہو وحشت کا سماں ہے   یہ شہر خموشاں ہے یہ تاریک جہاں ہے

بربادی عالم کی ہے تصویر سراپا
ناکامی انساں کی ہے تفسیر سراپا

جس سمت نظر ڈالیے سنسان فضا ہے   پتہ کو بھی جنبش نہیں وہ بند ہوا ہے
تاروں کے تبسم میں نہاں آہ و بکا ہے   فق چہرۂ مہتاب ہے دھندلی سی ضیا ہے

ذرے وہ پریشاں ہیں زمیں پر جو پڑے ہیں
ہیں عالم سکتہ میں جو اشجار کھڑے ہیں

افسردہ ہیں اس خاک میں ہستی کے شرارے   یا ظلمت خاموش میں پنہاں ہیں ستارے
مدفون ہیں ان قبروں میں دکھیوں کے سہارے   سوتے ہیں تہ خاک پڑے راج دلارے

جو چاند کے ٹکڑے تھے وہ پیوند زمیں ہیں
افسوس کہ افلاک نشیں خاک نشیں ہیں

رہنے کے لئے جنکے فلک بوس تھے ایواں   چھائے ہوئے تھے دہر پہ جو صورت طوفاں
قبضہ میں سمجھتے تھے جو سب عیش کے ساماں   تھی جنکے گماں سے بھی بروں گردش دوراں

آتے ہی اجل ہو گیا برگشتہ زمانا
جز گور ملا اُن کو نہ پھر کوئی ٹھکانا

دنیا کے خرابے میں نرالا ہے یہ منظر   اک گھر کے مکیں آج ہیں کمزور و دلاور
اک نغمہ میں سرشار ہیں نادار و تونگر   سوتے ہیں یہاں شاہ و گدا دونوں برابر

مجبور کے نزدیک ہے مختار کا ڈیرا
اقبال کے پہلو میں ہے ادبار کا ڈیرا

دنیا کے تماشوں کا یہ انجام ہے افسوس | ہستی کے لئے موت کا پیغام ہے افسوس
ہر صبح تمنا کے لئے شام ہے افسوس | یہ ماحصل ہستی ناکام ہے افسوس

ہر وقت یہاں سامنے ہے موت کا ساماں
انساں نہ کرے بھول کے بھی زیست کا ارماں

روح جذبات

(از حضرت نہال عظیم آبادی)

خوشا وہ آنکھ جو فرقت میں تیری گریاں ہے | خوشا وہ دل جو ترے ہجر میں پریشاں ہے
تو ہی چھوڑائے تو دست جنوں کہیں چھوٹے | گلے میں یہ مرے پھانسی ہے یا گریباں ہے
لگا کے وار یہ کہتی ہے اُن کی تیغ نگاہ | تڑپ لے خوب تڑپنے کا تجھکو ارماں ہے
یہ شرم اُس پہ یہ نظریں تری خدا کی پناہ | اسی ادا پہ تو لاکھوں کی جان قرباں ہے
کیا جنوں نے تعلق سے پاک صاف مجھے | خدا کا شکر کہ اب جیب ہے نہ داماں ہے
بتا گئیں وہ نگاہیں مزا تڑپنے کا | سکھا دیا مجھے مرنا بتوں کا احساں ہے
وہی امنگ وہی دل وہی ہے جوشش اپنا | وہی ہوں میں وہی خانہ خراب ارماں ہے

بس اب تو خلق یہ کہنے لگی ہے. کون نہال
وہ بت پرست۔ فقط نام کا مسلماں ہے

قطعہ

(از جناب ڈپٹی لال نگم صاحب ایم۔ اے۔ دہلوی)

دوست جو ہیں وہ رکابی پہ نظر رکھتے ہیں | جو ہیں دشمن وہ خرابی پہ نظر رکھتے ہیں
ہیں جو ہمسایہ وہ ہیں بر سر پرخاش نگم | سب غرض تیری تباہی پہ نظر رکھتے ہیں

علمی خبریں اور نوٹ

آجکل افغانستان میں تصنیف و تالیف کی طرف بھی خاص توجہ دی جارہی ہے، چنانچہ سررشتۂ تعلیم کے ماتحت ایک دار المصنفین قائم ہوا ہے جس کی نگرانی کے لیئے افغانستان کے سررشتۂ تعلیم نے مشہور ترکی عالم آغائے رفیق علی بے کو مشیر کار سررشتۂ تعلیم بنایا ہے۔

ٹرکی میں غیر ملکی زبان کے الفاظ کا اخراج بڑی سرعت سے عمل میں آرہا ہے، اور اس تحریک میں خود مصطفےٰ کمال پاشا بڑی دلچسپی لے رہے ہیں، اسی وجہ سے یہ تحریک اب اس قدر ترقی کر گئی ہے کہ ترکی کے مسلمان اپنے عربی ناموں کو ترکی ناموں میں تبدیل کر رہے ہیں۔ ترکی شہروں اور قصبوں کے نام بھی تبدیل کئے جائیں گے مثلاً "دیار بکر" کا نام جو عربی ہے بدلکر اب اس کا ترکی نام "اوغوزایلی" رکھا گیا ہے۔ نوجوان طالبعلم اور پولیس کے سپاہی اس تحریک میں بہت نمایاں حصّہ لے رہے ہیں۔ غرض اس وقت ترکی میں عربی الفاظ کے خلاف سخت جدوجہد ہو رہی ہے۔

انگلستان میں علمی تحقیقات پر کس اولوالعزمی سے روپیہ صرف کیا جاتا ہے اس کا ثبوت حال کے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔ آجکل کیمبرج میں علم حیوانات کے متعلق ایک وسیع پیمانہ پر دارالتجربہ تعمیر ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس کی عمارت پر پچھتر ہزار پونڈ خرچ کیا جائیگا اور دس ہزار پونڈ سے اس کا اندرونی ساز و سامان مہیا ہوگا۔

حال میں افغانستان کے مشہور خطاط آقا سید داؤد خاں کے کمال فن کا ایک نیا ثبوت ملا ہے۔ آپ نے ایک انچ کے مختصر سے رقبہ میں گلستان سعدی کا دیباچہ لکھا ہے جس کے ۵۱۵ کلمات اور ۲۲۷۰ حروف ہیں۔ اس سے پہلے آپ ایک پوسٹ کارڈ پر ۹۴۳۵ کلمے یا ۹۰۲۰۵ حروف لکھ چکے ہیں